مضامینِ بحرالعلوم

حصہ اوّل

مصنّف

بحرالعلوم مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی



امام احمد رضا اکیڈمی

صالح نگر، رام پور روڈ، بریلی شریف (یوپی)

سید محمد منظور علی اشرفی قادری ۔ درگاہ محلہ

مضامین بحر العلوم

﴿حصہ اول﴾

مصنف

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی

علیہ الرحمۃ والرضوان

ناشر

امام احمد رضا اکیڈمی، صالح نگر

بریلی شریف

پن:243502

سلسلہ اشاعت.......................(۶۹)

نام کتاب.............................مضامین بحر العلوم

مؤلف.....................بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان اعظمی

کمپوزنگ وسیٹنگ.......................مولوی محمد زاہد علی شاہدی،
محمد منیف رضا برکاتی

اشاعت..............................باراول

سنہ..................................۱۴۳۴ھ/۲۰۱۳ء

☆☆☆☆☆

Web: www.imamahmadrazaacademy.com

E-mail:mohdhanif92@gmail.com

ملنے کے پتے

☆ کتب خانہ امجدیہ، مٹیامحل جامع مسجد دہلی ۶

☆ المجمع الاسلامی، ملت نگر مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

☆ حق اکیڈمی، مبارک پور ضلع اعظم گڑھ

تعارف مصنف

نام ونسب:

بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب اعظمی (مدظلہ العالی) بن شیخ حاجی عبدالغنی انصاری مرحوم بن شیخ عبدالرحیم انصاری علیہ الرحمہ بن شیخ دوست محمد انصاری بن شیخ دوسی انصاری بن شیخ غوثی مرحوم۔

خاندانی حالات:

شیخ دوست محمد انصاری مرحوم اپنے والد دوسی کی صلبی اولاد نہ تھے بلکہ ان کی والدہ انہیں اپنے ساتھ ولید پور ضلع اعظم گڈھ سے لائی تھیں، جہاں ان کا پہلا عقد ہوا تھا۔ دوسی کے اپنے سگے لڑکے شاہ شیخ امان اللہ انصاری علیہ الرحمہ ان کی پہلی بیوی سے موجود تھے مگر حالات نے شیخ دوست محمد کو "دوسی" کا حقیقی قائم مقام بنادیا۔

قصہ یہ ہوا کہ محلہ کے کسی آدمی سے معمولی جھگڑے میں شیخ امان اللہ کا مزاج اتنا گرم ہوا کہ اپنے مقابل پر تلوار لے کر چڑھ دوڑے بلکہ وار بھی کردیا اتفاق کہ وار خالی گیا۔ انہیں جب اس بات کا خیال آیا کہ حکومت کی طرف سے باز پرس اور پکڑ دھکڑ بھی ہوسکتی ہے تو گھر سے نکل گئے اور مدتوں لاپتہ رہے، سالہا سال کے بعد معلوم ہوا کہ محلہ سید پور قصبہ بڑھل گنج ضلع گورکھپور کی مسجد کے پاس تکیہ چمن شاہ میں موجود ہیں۔ وہاں گئے اور ہر چند کوشش کی کہ مبارک پور واپس ہو جائیں مگر اب ان کا رخ ہی دوسرا ہو گیا تھا، کسی طرح واپس نہ ہوئے کہ جس دنیا کو ایک دفعہ ترک کردیا پھر اس کی طرف کیا نظر اٹھائیں۔

اس ساری مدت میں شیخ دوست محمد انصاری نے شیخ دوسی کو شیخ امان اللہ کی گم شدگی کا

احساس بھی نہ ہونے دیا اور سعادت مند بیٹے کی طرح اپنے باپ کی پوری خبر گیری کرتے رہے۔

چناں چہ شیخ امان اللہ کی اطلاع ملنے اور ان کی واپسی کی کوشش کر لینے کے بعد ۳۱ دسمبر ۱۸۶۲ء میں انہوں نے اپنی املاک کا شیخ دوست محمد انصاری کو ایک وراثت نامہ کے ذریعہ وارث اور مختار بنایا۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہم مقر کے دو بیٹے امان اللہ اور دوست محمد۔ امان اللہ نے بتقاضائے تقدیر فقیری اختیار کیا۔ دوست محمد مذکور ہمراہ وہم مقر ہے۔ میں ''دوسی'' دوست محمد کو اپنا وارث اور مختار کرتا ہوں''۔

ادھر شیخ امان اللہ انصاری ''امن شاہ'' کے نام سے ''چمن شاہ'' کے وارث اور گدی نشیں ہو گئے۔ اب وقتاً فوقتاً مبارک پور بھی آجاتے اور اپنے بوڑھے والد ''دوسی'' اور بھائی ''دوست محمد'' کی کچھ امداد بھی کرتے رہتے۔ ادھر دوست محمد بھی بڑھل گنج آنے جانے لگے تھے۔

بابا چمن شاہ قادری علیہ الرحمہ: چمن شاہ قادری غالباً ۱۸ رویں صدی عیسوی میں قادری سلسلہ کے کوئی صاحب تصرف وکشف وکرامات بزرگ تھے جن سے متاثر ہو کر بڑھل گنج کے زمین داروں نے کچھ قطعہ آراضی دے دی تھی اور بازار کے دوکانداروں پر بھی محاصل کے طور پر کچھ مقرر کر دیا تھا جسے شاہ صاحب مسجد کی مرمت اور ایک باغ جس میں شاہ صاحب خود رہتے تھے موسوم بہ ''تکیہ'' کی حفاظت، ان کے پاس آنے جانے والوں کی ضیافت اور اپنے مریدوں اور شاگردوں پر خرچ کرتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اس علاقہ کی کوئی نئی نویلی دولہن پہلی بار رخصت ہو کر سسرال جا رہی تھی جو اسی طرف سے گزری۔ کہاروں نے باغ اور پختہ کنواں وغیرہ دیکھ کر پانی پینے کے لیے اور کچھ دیر دم لینے کے خیال سے ڈولہ رکھ دیا، دولہن نے ڈولہ کے اندر سے ہی کہیں حضرت شاہ صاحب کی ایک جھلک دیکھ لی۔ اتنی از خود رفتہ ہوئی کہ ڈولہ سے نکل کر ان کی کٹیا میں پہونچ گئی اور کسی طرح شاہ صاحب کی خدمت سے جدا ہونے کو تیار نہ ہوئی۔ ہر چند لوگوں نے اسے سسرال یا میکے واپس کرنا چاہا لیکن نہ گئی، لوگوں نے تھک ہار کر چھوڑ دیا اور شاہ صاحب نے اسے

اپنی خدمت میں رکھ بھی لیا اور اس کا نام "بیٹا آنندی" رکھا۔

اس واقعہ سے قصبہ کے لوگوں کو شاہ صاحب پر شبہ ہوا کہ ایک نامحرم کو گھر میں ڈال رکھا ہے جب کہ کہتے یہ ہیں کہ ہماری گدی پر ہماری جگہ وہی بیٹھے گا جو شادی شدہ بھی نہ ہو، ہماری گدی نہنگوں کی گدی ہے۔ان بدگمانیوں کو دیکھتے ہوئے آپ نے ایک روز قصبہ کے سربرآوردہ لوگوں کو بلایا اور اس عورت کو ایک باریک کپڑا پہن کر نہانے کا حکم دیا، اب جب لوگوں نے دیکھا تو خدا کی قدرت سے وہ مرد تھا، ایک دفعہ پھر شاہ صاحب کی عظمت کا لوگوں کے دلوں پر سکہ بیٹھ گیا اور حضرت شاہ صاحب کی توجہ سے "بیٹا آنندی" بھی ایک صاحب تصرف بزرگ ہو گیا۔

ایک دفعہ شاہ صاحب نے مذکورہ بالا آراضی میں سے کسی کھیت کو بونے کے لیے غلہ، ہل، بیل ساتھ کر دیا کہ جاؤ کھیت بو آؤ۔آنندی صاحب نے کھیت پر پہونچ کر سارا غلہ محتاجوں کو تقسیم کر دیا اور جانور بھی ذبح کرا کے بٹوا دیا اور خود خالی ہاتھ واپس ہوئے۔شاہ صاحب نے پوچھا بیٹا کھیت بو آئے، بولے جی حضور، دوسرے لوگوں نے شاہ صاحب سے طرح طرح کی باتیں کیں، تیسرے روز خود شاہ صاحب کھیت کے ملاحظہ کے لیے پہونچے دیکھا کہ پورا کھیت اگا ہوا ہے۔آپ نے واپس آ کر فرمایا: بیٹا ایک میان میں دو تلوار نہیں رہ سکتی۔[illegible] یہاں سے روانہ ہو جاؤ اور فلاں مقام پر (غالباً جونپور کی طرف) قیام کرو، اس طرح ان کو دوسری جگہ رشد وہدایت پر مامور فرمایا۔

شیخ عبد الرحیم انصاری علیہ الرحمہ: ایک دفعہ "امن شاہ" آئے تو اپنے بھتیجے یعنی حضرت بحر العلوم قبلہ کے جد مکرم شیخ عبد الرحیم انصاری کو بھی اپنے ساتھ لے گئے اور اپنی صحبت میں رکھ کر انہیں بھی ترک دنیا کی راہ پر لا ڈالا تا آں کہ یہ جوان ہو گئے۔شیخ عبد الرحیم فرماتے ہیں:

"میری کیفیت یہ ہو گئی تھی کہ میں یہ جانتا ہی نہ تھا کہ دنیا کیا ہے اور دنیا والے کیسے ہیں اسی تکیہ میں شب وروز یاد الٰہی اور ذکر وفکر میں مصروف رہتا"۔

"امن شاہ" کی تربیت کا کچھ ایسا ڈھنگ تھا کہ شیخ عبد الرحیم انصاری فرماتے ہیں: ایک دفعہ میں نے چچا سے کہا: "سائیں" بہت دنوں سے کھیر کھانے کو جی چاہتا ہے اگر

حکم ہو سب چیزیں مہیا ہیں پک جاتی ابو لے بیٹا چٹوری زبان دولت کا زیان، زبان کو تین بار راکھ لگا کر اینٹھ ڈالو کہ اب کبھی ایسی خواہش نہ کرے، فرماتے ہیں: میں ایسا سناٹے میں آیا کہ دل سے کھیر کا خیال ہی نکل گیا اور ایک سال کی مدت بیت گئی، پھر سال بھر کے بعد ایک روز خود ہی بڑے اہتمام سے کھیر بنائی اور کھلائی۔

اسی عالم میں دن گزر رہے تھے کہ ایک روز تکیہ میں ایک ضعیف العمر بزرگ آئے، شیخ عبدالرحیم انصاری نے تکیہ کے دستور کے مطابق انہیں کھانا کھلایا، خاطر تواضع کی۔ ان ضعیف العمر بزرگ کو دیکھ کر شیخ عبدالرحیم انصاری کو یک بیک خیال آیا کہ میرے بھی ایسے ہی معذور بے سہارا اور ضعیف العمر باپ ہیں یہاں میں مجبوروں کی خدمت کر کے اجر کما رہا ہوں اور خود قدرت نے مجھ پر کمزور باپ کی جو ذمہ داری ڈال رکھی ہے اس میں اتنی بڑی کوتاہی ہو رہی ہے۔ یہ خیال آنا تھا کہ دل وہاں سے اچاٹ ہو گیا اور مبارک پور واپس چلے آئے اور والدین کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے اور پھر حلیمہ خاتون ساکن ابراہیم پور سے شادی بھی کر لی، مگر بڑھل گنج تکیہ چمن شاہ میں جو تربیت ہو چکی تھی اس کا اثر زندگی بھر قائم رہا، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اس میں اس حد تک ترقی ہوئی کہ "چمن شاہ" نے اپنے بعد اپنی جانشینی کے لیے انہیں نامزد کیا۔ اور ۳۱ر جولائی ۱۸۹۴ء کو باقاعدہ ایک وصیت نامہ بھی تحریر کیا جس میں تکیہ سے متعلق جائداد کا نگراں اور متولی بھی انہیں کو مقرر کیا تھا، لیکن آپ نے صرف اس خیال سے کہ یہاں عیال داروں کے رہنے کی اجازت نہیں اس جائداد کو چھوڑنا گوارہ کر لیا جس پر اب دوسرے لوگ قابض ہیں۔

آپ نہایت صابر و قانع، نیک اور متواضع پابند صوم وصلوۃ، تنہائی پسند کم گو اور متصلب سنی تھے۔ اس وقت جب کہ ابھی مبارک پور میں دیوبندیت کی ابتدا تھی اور لوگ پوری طرح اس کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ بھی نہ تھے آپ نے محلہ کی مسجد کے پیش امام حاجی عباد اللہ کے پیچھے سارے محلہ کے علی الرغم نماز پڑھنی چھوڑ دی تھی، کیوں کہ ان میں کچھ دیوبندیت آگئی تھی۔

پاس پڑوس کے ایسے تمام نو عمر رات میں آپ کی خدمت میں جمع ہوتے جنہیں اعمال اور ذکر الٰہی سے شغف ہوتا اور آپ ان کی رہنمائی بھی فرماتے۔ پرانے کاغذات کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ آپ زبردست عامل بھی تھے، ایک خط آپ کے نام کسی فقیر محمد نامی عامل کا ملتا ہے جو عدن رہتے تھے وہ لکھتے ہیں:

میں نے خیال کیا کہ فقیرانہ دعا مجرب آپ کے پاس ہی ملنے کی امید ہے، اس لیے آپ کو لکھا، ۹ رجب ۱۳۳۹ھ میں مکان پر ہی انتقال ہوا۔ اور قبرستان موسومہ بہ بندریا باغ میں مدفون ہوئے۔

شیخ عبدالغنی انصاری: آپ کے والد ماجد حاجی عبدالغنی ولد شیخ عبدالرحیم انصاری معمولی اردو خواندہ تھے، لیکن اپنے بچے کو دینی تعلیم دلانے کا اتنا شوق تھا کہ معلوم نہیں کب سے بوستاں، پنج گنج وغیرہ خرید کر رکھا تھا کہ بچہ بڑا ہوگا تو پڑھے گا۔ آپ کی عمر کا بیشتر حصہ بسلسلہ حصول معاش سیاحی میں صرف ہوا۔ سورت، بمبئی، احمد آباد، کھمبات، بھیونڈی اور مالیگاؤں وغیرہ آتے جاتے رہتے۔ آخر عمر میں مستقل طور سے مبارک پور رہنے لگے تھے۔

۱۳۸۳ھ میں اپنی اہلیہ محترمہ مریم خاتون بنت شیخ عنایت اللہ انصاری ولید پوری کے ساتھ حج کی درخواست دی جو اتفاق سے اسی سال منظور ہوگئی۔ ۲ رشوال ۱۳۸۳ھ کو مبارک پور سے حج کے لیے روانہ ہوئے، بعد ادائیگی حج، زیارت روضۂ نبوی ﷺ کے لیے مدینہ شریف پہونچے اور وہیں سخت بیمار ہوئے، اسی حالت میں محرم ۸۴ھ کی آخری تاریخوں میں واپسی ہوئی، علاج ہوتا ہی رہا مگر مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔

۶ ربیع الاول ۱۳۸۴ھ کی صبح کو مرض زیادہ بڑھا، دن نکلنے سے قبل حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کو بلا کر ان کے ہاتھ پر توبہ و بیعت کی اور ۱۲ بجکر ۳۰ منٹ پر وصال ہوا۔ جمعہ کا دن تھا، فوراً ہی غسل و کفن ہوا اور جنازہ جامع مسجد لے جایا گیا۔ بعد نماز جمعہ ان کے مرشد نے نماز جنازہ پڑھائی بلکہ اپنے مرشد ہی کے ہاتھوں لحد میں اتارے گئے اور خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے، وفات کے بعد ان کے ہم عمر بچپن کے دوست اور محلّہ (بلکہ قصبہ) کے سیٹھ حاجی یاد علی مرحوم نے کہا:

"عبدالغنی واقعی بڑے خوش قسمت تھے"۔

اپنے والد شیخ عبدالرحیم انصاری کی طرح آپ بھی ہتک نفس کے عادی اور مسکین طبع تھے، رات میں نماز عشا پڑھنے کے بعد کچھ دیر وظیفہ تقریباً معمولات یومیہ سے تھا۔
حسب استطاعت غربا نوازی اور دوستوں کی مدد خاندانی ورثہ میں ملی تھی، مبارک پور کے کتنے ہی بے سہارا لوگ جب تلاش معاش کے سلسلہ میں ان شہروں میں پہونچتے جہاں آپ مقیم رہتے تو ان لوگوں کو اپنے یہاں ٹھہراتے، کھلاتے پلاتے، کام سکھاتے پھر ضامن بن کر کام دلاتے، اور کتنے لوگ وہاں قرض دام کر کے بھاگ آتے تو آپ ان کا قرض بھی ادا کرتے۔
فالحمد لله تعالیٰ علیه.

ولادت: ایسے مذہبی گھرانہ اور دنیا کی رنگینی سے دور خاندان میں آج سے تقریباً ۶۳ رسال قبل ۷ ربیع الآخر ۱۳۴۴ھ ضلع اعظم گڑھ کے صنعتی قصبہ مبارک پور میں پیدا ہوئے، چوں کہ چار پانچ بھائیوں میں آپ تنہا زندہ بچے تھے اس لیے بچپن بڑے لاڈ پیار اور ناز و نعم میں گزرا۔

بچپن: حضرت بحرالعلوم کا بچپن بالکل سیدھا سادا گزرا۔ ایک تو گھر کا ماحول دوسرے بچپن سے خلقی طور پر اتنے کمزور اور لاغر تھے کہ کسی بچکانہ کھیل میں کبھی دیکھنے سے آگے دل چسپی نہ لے سکے۔ اس وقت کے مروجہ کھلیوں (پتنگ اڑانا، گیند کھیلنا، گولی اور لٹو کھیلنا وغیرہ) قسم کے کھیلوں کا کبھی ڈھنگ ہی نہیں آیا، گو شوق بھی رہا ہو اور کرنا بھی چاہا ہو۔
تحصیل علم: ۱۳۴۹ھ تقریباً ۵ سال کی عمر میں دارالعلوم اشرفیہ جو اس وقت ایک مدرسہ کی شکل میں تھا اور ایک خام عمارت میں تعلیم ہوتی تھی قاعدہ بغدادی لے کر داخل ہوئے۔
قاعدہ بغدادی ناظرہ کلام پاک، پرائمری درجات اور فارسی سے لے کر دورۂ حدیث تک اساتذہ دارالعلوم اشرفیہ سے ہی تحصیل علم کیا اور تقریباً ۲۲ رسال کی عمر میں ۱۰ رشعبان المعظم ۱۳۶۶ھ میں درس نظامی سے فراغت حاصل کی اور دورۂ حدیث مکمل کیا، اس سال استاذ العلما حضرت مولانا سردار احمد صاحب گورداس پوری ثم لائل پوری علیہ الرحمہ نے امتحان لیا تھا اور جس جماعت میں حضرت بحرالعلوم قبلہ شریک تھے اس پر حسب ذیل تبصرہ فرماتے ہوئے لکھا:

حضرت فیض رحمت عمدۃ المتکلمین، فخر المحدثین محدث اعظم ہند حضرت سید شاہ محمد صاحب قبلہ کچھوچھوی کے ارشاد سے ان کی موجودگی میں دورۂ حدیث کے طلبہ کا امتحان لیا، طلبہ نے بہت اچھا امتحان دیا، دورۂ حدیث کے ایسے طلبہ جو امسال فارغ ہو رہے ہیں پنجاب و ہند کے دیگر مدرسوں میں کمیاب ہیں۔ (سردار احمد ۱۴ر جمادی الاخری ۱۳۶۶ھ)

نجی مدرسوں کا امتحان ہی کیا مگر کبھی امتحان میں فیل نہ ہوئے، ہمیشہ فرسٹ پوزیشن ہی حاصل رہی، تعلیم کے دوران غربت کی وجہ سے فاقوں کی بھی نوبت آئی مگر گھر والوں کو یا خود آپ کو کبھی تعلیم کے چھوڑنے یا چھوڑانے کا خیال نہ آیا۔

اساتذہ کرام:

حافظ ملت حضرت مولانا حافظ عبد العزیز صاحب علیہ الرحمہ، استاذ العلما حضرت مولانا عبد المصطفےٰ صاحب اعظمی علیہ الرحمہ، خطیب عصر حضرت مولانا محمد سلیمان صاحب بھاگلپوری علیہ الرحمہ، امام المفکرین حضرت مولانا عبد الرؤف علیہ الرحمہ، امام جامع مسجد حضرت مولانا نور محمد صاحب مبارک پوری علیہ الرحمہ، سعدی زماں حضرت مولانا سید شمس الحق صاحب اعظمی علیہ الرحمہ، فقیہ عصر حضرت مولانا عبد المصطفیٰ صاحب ازہری قبلہ مدظلہ العالی (علیہ الرحمہ) محدث شہیر حضرت مولانا ثناء اللہ صاحب، محدث مؤمدظلہ العالی علیہ الرحمہ وغیرہم۔

شادی:

آپ کا عقد ۹ر رجب ۱۳۶۵ھ محلہ پرانی بستی قصبہ مبارکپور کے ایک کھاتے پیتے اور دین دار گھرانے میں شیخ عبد الغفور انصاری مرحوم کی صاحبزادی "صابرہ خاتون" سے ہوا۔ گھر کے دینی ماحول کا ہی یہ اثر تھا کہ آپ کے برادر نسبتی جناب نور محمد صاحب انصاری نے الجامعۃ الاشرفیہ کے تعمیری چندہ کے سلسلہ میں اپنے سارے کاروبار کو چھوڑ کر حافظ ملت اور ان کے رفقائے کار کے ساتھ مہینوں مصروف رہے بلکہ جامع مسجد راجہ مبارک شاہ کی موجودہ تعمیر وزیبائش میں جناب نور محمد صاحب انصاری اور ان کے رفیق کار جناب الحاج محمد عثمان صاحب پورہ صوفی کو خاصا دخل ہے اور یہ انہیں حضرات کی جدوجہد اور فی سبیل اللہ دینی خدمات کا ثمرہ

ہے۔ فجزاھم اللہ خیراً۔

گورکھپور میں:

فراغت کے بعد حضرت بحر العلوم قبلہ ذوالقعدہ ۱۳۶۶ھ میں مدرسہ ضیاء الاسلام پرانا گورکھپور شہر گورکھپور میں صدر مدرس کے عہدہ پر فائز ہو کر تشریف لے گئے مگر وہاں کے ارکان ادارہ کی آپسی چپقلش نے ضیاء الاسلام کو موت وحیات کی کش مکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ بایں وجہ ایک سال بعد وہاں سے علیحدہ ہو گئے۔ یہ گورکھپور کی بدقسمتی ہی کہی جائے گی کہ بحر العلوم قبلہ گورکھپور سے علیحدہ ہو گئے۔ ورنہ آج وہاں کا دینی ماحول ہی کچھ اور ہوتا، اسی ایک سالہ قیام کے دوران زیر ادارت حافظ نیاز احمد اشرفی مرحوم ایک ماہنامہ "الضیاء" کا اجرا بھی کیا جسے پابندی کے ساتھ شائع فرماتے رہے۔ جب مدرسہ ضیاء الاسلام بند ہو گیا تو حافظ نیاز احمد اشرفی مرحوم نے آپ کی رہنمائی میں ایک مدرسہ بنام ضیاء العلوم قائم فرمایا جو آج بھی جاری ہے اور عوام الناس میں "نیاز والے" مدرسہ کے نام سے مشہور ہے۔

گورکھپور سے علیحدگی کے بعد چند دنوں دار العلوم اشرفیہ میں درس عالیہ کے مدرس رہے اور پھر یہاں سے بھی الگ ہو کر گھریلو کام میں معروف ہو گئے۔

تلشی پوری میں:

شوال ۱۳۶۸ھ مدرسہ انوار العلوم تلشی پور ضلع گونڈہ میں متوسطات کی تعلیم دینے کے لیے آپ تشریف لے گئے، مسلسل سات سال تک وہاں تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ آپ کے پہونچنے کے بعد انوار العلوم کی ضیا پاشیاں دوچند ہو گئیں تھیں۔ طالب علموں کی کثرت، اساتذہ کی تقرری، مالیات میں اضافہ، تعلیمی برتری، قرب وجوار کے لوگوں کا رجوع، دینی جوش اور مذہبی ماحول قابل دید تھا۔

حضرت بحر العلوم قبلہ تعلیمی امور کی انجام دہی کے ساتھ رات دن انوار العلوم کی ترقی میں کوشاں رہتے، گاؤں گاؤں، قصبہ قصبہ اور دیہات دیہات تبلیغی دورہ کرتے، تقریر فرماتے اور حتی المقدور مدرسہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لوگوں کو متوجہ فرماتے۔ آپ کی محنت

شاقہ اور انتھک جد و جہد کا ہی یہ ثمرہ تھا کہ پرانی عمارت سے چند گز کے فاصلہ پر ایک قطعہ آراضی پر نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا جو بہت قلیل مدت میں دو منزلہ عمارت کی شکل میں تیار ہوگئی۔

مبارک پور میں:

حضرت بحر العلوم قبلہ حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کے حکم، احباب کے اصرار اور دار العلوم اشرفیہ کی دینی ضرورت کی پیش نظر شوال ۱۳۷۵ھ میں دوبارہ اشرفیہ میں درجہ عالیہ کے ہیڈ کی حیثیت سے تشریف لائے، شوال ۱۳۷۸ھ میں افتا کی ذمہ داری بھی آپ کو ہی سونپ دی گئی۔ اور بعد میں شیخ الجامعہ کی حیثیت سے مسند صدارت پر متمکن ہوئے مگر یہ بھی ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ حضرت بحر العلوم نے ناگفتہ بہ حالات سے دل برداشتہ ہو کر ۱۴۰۴ھ میں ایک طویل استعفیٰ نامہ کے ذریعہ الجامعۃ الاشرفیہ کی تدریسی خدمات سے علیحدگی اختیار کر لی۔

گھوسی میں:

مدرسہ شمس العلوم گھوسی کے ذمہ داروں کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت بحر العلوم قبلہ مستعفی ہو چکے ہیں تو ایک وفد کی شکل میں حضرت مولانا قاری محمد عثمان صاحب، حضرت مولانا قمر الدین صاحب اور جناب ممتاز احمد صاحب ناظم اعلیٰ وغیرہم تشریف لائے اور عرض کیا: حضور والا شمس العلوم کو رونق بخشنے کا وعدہ فرمالیں، پیشگی عرض ہے کہ آپ کی جملہ شرائط ہمیں منظور ہیں، بہر کیف کچھ عرض و معروض کے بعد معاملات طے ہو گئے، اہل گھوسی حضرت بحر العلوم قبلہ کی آمد کی خبر سن کر حد درجہ مسرور ہوئے۔ اور بعض نے یہاں تک کہا کہ مبارک پور کا سب سے اہم اور قیمتی "ہیرا" الحمد للہ ہمارے یہاں آرہا ہے۔

حضرت بحر العلوم قبلہ شوال ۱۴۰۴ھ سے بحیثیت شیخ الحدیث تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ادھر کچھ دنوں سے افتا کی ذمہ داری بھی آپ نے قبول فرمائی ہے۔

تلامذہ:

اکتالیس سالہ تدریسی خدمات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے آپ کے تلامذہ کی تعداد ۶،۵ ہزار سے زائد ہی ہوگی۔ جس میں دانشور، محقق، مصنف، حدیث داں، مفتی، معقولی، منطقی،

فلسفی ہندوبیرون ہند دینی وملی خدمات میں مصروف ہیں۔

(۱) مولانا عبداللہ خاں صاحب عزیزی "شیخ الحدیث والقرآن"۔

(۲) مولانا سید محمد مدنی میاں صاحب "شیخ الاسلام"۔

(۳) مولانا تراب علی "فخر القراء"۔

(۴) مولانا مشاہد رضا صاحب "مناظر"۔

(۵) مولانا ممتاز احمد انگلینڈ "امام خطیب"۔

(۶) مولانا قمر الزماں لندن "مبلغ اسلام"۔

(۷) مولانا جلال الدین نوری مصر "دانشور"۔

(۸) مولانا مفتی عبید الرحمٰن "سجادہ نشیں"۔

(۹) مولانا محمد نظام الدین صاحب رضوی "مفتی" (۱۰) مولانا سید جیلانی مجاہد "صحافی"

(۱۱) مولانا یٰس اختر مصباحی "ادیب"۔

(۱۲) ڈاکٹر سید شمیم گوہر "محقق ادیب"۔

(۱۳) مولانا اسرار الحسن صاحب "سیاست داں"۔ مولانا کمال الدین "تاجر"

(۱۴) مولانا محمد حنیف صاحب "منتظم"۔

(۱۵) مولانا عبدالعزیز "طبیب حاذق"۔

(۱۶) مولانا امام الدین "تاجر" وغیرہم جن کے اسما قلم برداشتہ زبان پر آگئے اور تحریر ہوئے۔

زیارت حرمین شریفین: حضور جان نور ﷺ کا حضرت بحر العلوم پر بے پایاں کرم ہوا کہ اذن حاضری ملی، ۱۹۷۵ء میں درخوات حج وزیارت منظور ہوئی مع اہلیہ محترمہ تشریف لے گئے، زیارت حرمین شریفین سے مشرف ہونے کے ساتھ مختلف علمائے کرام سے اکتساب فیض فرمایا اور فیض رسانی فرمائی، دیار قدس میں بھی اجتماعات کو خطاب فرمایا اور حضور کی مدح سرائی فرمائی۔

دوران حج وزیارت ایک مبسوط کتاب "مختار الاحادیث" کا ترجمہ بھی فرمایا۔

درس وتدریس:

فراغت کے بعد سے اب تک درس وتدریس ہی آپ کا مشغلہ رہا ہے، تفسیر وحدیث، اصول حدیث، فقہ، اصول فقہ، عقائد وکلام، منطق وفلسفہ، صرف ونحو اور عربی ادب جملہ فنون پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ وقیع سے وقیع مسئلہ کو آسانی کے ساتھ سمجھا دینا، ہر طالب علم کے اعتراض کا اطمینان بخش جواب دینا، مضمون کے سیاق وسباق اور ماله وماعلیہ کو تفصیلی انداز میں متعلم کے ذہن میں اتار دینا آپ کی تدریسی خصوصیات ہیں۔

الجامعۃ الاشرفیہ کی ترقی میں حصہ: اللہ ورسول کے نام پر بڑی سے بڑی قربانی دینے والی مبارک پور کی جاں فروش سنی قوم اور اسلامی علوم وفنون کے محلات کی تعمیر کے قابل سرزمین مبارک پور کو نگاہ کرامت اثر شبیہ غوث اعظم شیخ المشائخ حضرت اشرفی میاں علیہ الرحمۃ والرضوان نے چن کر مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کی بنیاد رکھی۔ ایک طویل مدت تک خود وہ اور ان کے رفقا کار حضور محدث اعظم ہند علیہ الرحمہ، حضرت صدر الشریعہ علیہ الرحمہ، شیخ طریقت حضرت مولانا سید مختار اشرف قبلہ مدظلہ اور مبارک پور کے اعوان وانصار جناب شیخ علیم اللہ انصاری مرحوم، جناب الحاج قاضی محمد عمر صاحب مرحوم، جناب الحاج خیر اللہ دلال صاحب مرحوم اور معمار قوم جناب شیخ محمد امین صاحب مرحوم وغیرہم اس ادارہ کی تعمیر وترقی میں منہمک رہے تا آں کہ حالات متقاضی ہوئے اور مرد حق آگاہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اس ادارہ کو الجامعۃ الاشرفیہ (مجوزہ عربی یونیورسٹی) کی شکل دی، حضرت مولانا حافظ عبدالرؤف صاحب علیہ الرحمہ، حضرت بحرالعلوم قبلہ مدظلہ، حضرت مولانا شفیع صاحب قبلہ، حضرت مولانا قاری محمد یحییٰ صاحب قبلہ اور مبارکپور کے دیگر پرجوش حضرات عزیمت جناب محمد ابراہیم صاحب سابق چیرمین، الحاج عبدالستار صاحب نوادہ، الحاج عبدالاول صاحب ایڈوکیٹ وغیرہم نے حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کے رفقا کار اور دست وبازو بن کر الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر وترقی کے لیے ہر ممکن جدو جہد کی۔ رفقائے حافظ ملت میں بحرالعلوم حضرت علامہ مفتی عبدالمنان صاحب قبلہ مدظلہ العالی کو خصوصی

حیثیت واہمیت حاصل رہی ہے۔ مشہور ومعروف خطیب اور باثر عالم دین ہونے کی وجہ سے حافظ ملت کے اکثر سفر وحضر میں شریک وسہیم رہے ہے اور الجامعۃ الاشرفیہ کے مالیاتی فنڈ کے ایک معتد بہ حصہ کا حصول آپ کا مرہون منت ہے۔

چوں کہ الجامعۃ الاشرفیہ کے تاریخی نقوش ابھی بالکل واضح نیز یہ تعارفی خاکہ اختصار کا متقاضی بھی ہے اس لیے تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

انجمن اہل سنت اشرفی دار المطالعہ: یہ ادارہ طلبہ دار العلوم اشرفیہ نے ۱۳۵۵ھ میں قائم کیا تھا۔ فیس ممبری، ماہانہ چندہ، دار المطالعہ کی یومیہ فیس اور جلوس عید میلاد النبی کے موقع پر مبارک پور کے سنی مسلمانوں کی دریا دلی اس انجمن کے خاص ذرائع آمدنی تھے۔

حضرت بحر العلوم قبلہ جب اس کے سکریٹری منتخب ہوئے تو انہوں نے اپنی دوران نظامت اس کو خاص ترقی دی۔ لائبریری کی کتابوں میں اضافہ بھی فرمایا اور مالی اعتبار سے انجمن کو خودکفیل بھی بنایا۔ بجٹ کی کمی و جملہ ارکان انجمن بلکہ عوامی تاثر کے علی الرغم حافظ محمد لیس صاحب رنگریز مرحوم (جن کی قبر پر اللہ رحمت ونور کی بارش برسائے) کی ضد اور مشورہ پر لب سڑک ایک قطعہ آراضی متصل بہ ''بندر ھیاباغ'' انجمن کے نام رجسٹری کرایا، سرمایہ کی کمی کو اپنے جیب سے پورا کیا اور آمدنی ہونے کے بعد قرض وصول کیا جس کی وجہ سے انجمن کے پاس آج بیسوں دوکانیں اور لاکھوں کی ملکیت ہے۔

سنی دار الاشاعت:

یہ خود مختار قومی ادارہ مفتی اعظم ہند کی امید کی تکمیل کے لیے حافظ ملت علیہ الرحمہ کی دعاؤں کے طفیل علامہ حافظ عبد الرؤف صاحب علیہ الرحمہ کی جہد مسلسل اور رفقائے کار بحر العلوم حضرت علامہ مفتی عبد المنان صاحب اعظمی، شیخ الادب مولانا محمد شفیع صاحب اعظمی (قاضی شریعت) اور فخر القرا حضرت مولانا قاری محمد یحیٰ صاحب کے عمل پیہم سے عالم وجود میں آیا۔

۱۳ رشول ۹۱ھ کو علامہ حافظ عبد الرؤف علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد اس ادارہ کا سارا انتظام حضرت بحر العلوم قبلہ کے سپرد ہے اور اس کا خصوصی اشاعتی پروگرام ''فتاوی رضویہ'' مصنفہ

امام احمد رضا بریلوی علیہ الرحمہ تیزی سے منزل کی طرف گامزن ہے۔

تقریری خدمات:

حضرت بحر العلوم قبلہ کو دوران تعلیم سے ہی تقریر کا شوق رہا، مدرسہ میں پنجشنبہ کے مشقی جلسوں کو دوبارہ جاری کرنے والوں میں سر فہرست آپ کا بھی نام ہے۔ کتنی مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے طلبہ نے ان جلسوں سے کنارہ کشی کر لی لیکن صرف دو آدمی حضرت بحر العلوم اور سردار مطیع الرسول یہ کام کرتے رہے۔ شاید انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان کے طول وعرض میں اہل سنت وجماعت کے جلسہ ہائے عید میلاد النبی میں سرکار رسالت مآب ﷺ کے مدح خوانوں میں آپ کا شمار بھی نیک نامی کے ساتھ ہوتا ہے۔

عبرت وبصیرت کے لیے یہاں ابتدائی عہد کا ایک واقعہ بھی خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ایام محرم الحرام میں ذکر شہادت کی مجلسوں میں روایت خوانی ابتداء سے ہی آپ کا مشغلہ رہا ہے، تقریر کی مشق شروع کیے ہوئے ابھی چند ہی روز ہوئے تھے کہ مشقی جلسوں میں یاد کر کے جو تقریر سناتے خوب واہ واہ ہوتی۔ محلہ کے امام باڑہ پر مجلس ہو رہی تھی پاس پڑوس کے لوگوں نے زبردستی تقریر کے لیے کھڑا کر دیا، آپ نے سوچا مضامین پڑھتے پڑھتے یاد ہیں ہی دو چار منٹ کچھ کہہ دینا کیا مشکل ہے مگر خطبہ کے بعد ایک جملہ سے زیادہ نہ کہہ پائے۔ شرمندہ ہو کر بیٹھنا پڑا، شاید یہ غیر معمولی واقعہ بھی اس میدان میں آپ کے لیے مہمیز ثابت ہوا۔

تحریری خدمات:

تحریر کا ذوق ابتدا سے ہی رہا، فارسی کے زمانۂ تعلیم میں گلستاں دو باب تک نقل کر ڈالا اس خیال سے کہ اس کا ترجمہ اور حاشیہ لکھیں گے۔ نحو میر کی تعلیم کے وقت اس کا پورا ترجمہ بھی بطور خود نوٹ کر لیا تھا۔ جلالین شریف کی تعلیم کے وقت سب سے پہلا مضمون معراج کے عنوان پر ''دبدبۂ سکندری'' رامپور میں شائع ہوا۔ استاذ محترم حضرت حافظ ملت علیہ الرحمہ کو شائع ہونے کے بعد سنایا تو بہت خوش ہوئے اور ایک روپیہ انعام مقرر فرمایا۔ اس کے بعد ہی اپنے ذوق کی رہنمائی میں برابر مضامین لکھتے رہے جو ہندوستان کے تقریباً تمام سنی پرچوں میں شائع ہوتے

رہے۔

جب تک گورکھپور رہے ایک دو ورقی رسالہ الضیاء ماہ بہ ماہ نکالتے رہے، اسی زمانہ میں اردو شاعروں کا انتخاب کیا تھا جس کا مسودہ بھی اب ضائع ہوگیا۔ تلشی پور کے دوران قیام الشاہد بجواب تردید حاضر وناظر لکھا۔ دوران حج مختار الاحادیث کا ترجمہ فرمایا۔

فتاوی بحرالعلوم کی کئی جلدیں بھی ترتیب کے مراحل سے گزر رہی ہیں، اس وقت بھی کئی ایک رسالے اسلامی توحید، حنفی اولیا، محمد مثل الکامل کا ترجمہ، خطبات بحرالعلوم اور علمائے اہل سنت معلق پڑے ہوئے ہیں۔

مضامین بحرالعلوم سے متعلق:

زیر نظر کتاب "مضامین بحرالعلوم" ۸۶ء، ۸۷ء تک لکھے گئے بیشتر مضامین کا مجموعہ ہے جن میں سے اکثر ہند و بیرون ہند کے مختلف مذہبی پرچوں میں شائع ہو چکے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پہلی مرتبہ منظر عام پر آرہے ہیں، مضامین کی ترتیب کا میں نے خاص خیال رکھا ہے تا کہ طبقۂ عوام وخواص دونوں کو کچھ نہ کچھ حاصل ہو۔

کتاب کے مطالعہ سے قارئین کرام پر یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ہر مضمون دلائل وبراہین سے جکڑا ہوا، تحقیق وتلاش سے مزین، محاورات واشعار کا برجستہ وبرمحل استعمال، سلاست وروانی اور ادب وزبان کی چاشنی کا آئینہ دار ہے اور حضرت بحرالعلوم قبلہ مدظلہ العالی بلاشبہ قرآن کے مزاج شناس مفسر، فہم حدیث کے ماہر، قانون اسلامی کے حاوی فقیہ، نکتہ رس معقولی، علم کلام کے مدبر، معتبر سیرت نگار اور دیانتدار مصنف ہیں۔

مولیٰ عزوجل سے دعا ہے کہ حضرت بحرالعلوم قبلہ کی عمر کو دراز تر فرمائے تا کہ علم وعرفان کے خزانے کو زیادہ سے زیادہ صفحۂ قرطاس پر بکھیر سکیں اور اسلامیان عالم کو بیش از بیش فائدہ پہونچے۔ آمین بجاہ حبیبہ سید المرسلین۔

محمد احمد مصباحی۔ رفیق مفتی پبلی کیشنز مبارکپور

وہ خدا

(۱)

خدا۔
وہ خدا۔
جس نے دانے کا سینہ چیرا۔
جس نے گٹھلی کا جگر چاک کیا۔
جس نے قطرے سے انسان بنایا۔
جس نے انسان سے قطرے کو وجود دیا۔
جو مردے کو زندگی کی رعنائی دیتا ہے۔
جو زندوں سے لباس ہستی چھین لیتا ہے۔
کیا یہ تمہارا معبود نہیں۔
تب تم۔
کہاں اوندھ رہے ہو؟
کس وادی میں بھٹک رہے ہو؟
وہم وگمان کے کن پتھروں سے سر پھوڑ رہے ہو۔

(۲)

سپیدۂ سحر کی مسکراہٹ میں۔
جو ہر دن جد و جہد کا پیغام لائی ہے۔
رات کی برہم زلفوں میں۔
جو قرار و سکون کی نقیب ہیں۔

چاند اور سورج کی منظم اور مربوط ضیا میں۔
جس کے دم سے گرمیٔ حیات اور عیش کی تازگی ہے۔
ستاروں کے نورانی قافلے میں۔
جو اندھیرے سے اجالے خشکی اور تری میں لوگوں کا راہنما ہے۔
علم والوں کے لیے اس قسیم وجبیر قادر وحکیم رب العالمین کی معرفت کی راہیں ہیں۔
پر وہ لوگ۔
جو دعویٔ علم کے باوجود۔
ظن وتخمین کی وادی میں بھٹکتے ہیں، ادعائے ہمہ دانی کے باوصف قیاس آرائی ہی ان کا مبلغ علم ہے۔
اور جو نت نئے فارمولے اور نظریے۔
تراشتے رہتے ان کے لیے ان میں۔
کوئی ہدایت نہیں۔
وہ دن دوپہر بھی خود ساختہ اندھیرے میں۔
بھٹکتے رہیں گے۔

(۳)

موت وحیات کی منزلیں آواز دے رہی ہیں۔
تخلیق انسانی کے سربستہ راز بول رہے ہیں۔
اپنے خالق کے بارے میں۔
اپنے پالن ہار سے متعلق۔
پر اسے وہی سمجھتے ہیں جن پر فکر ودانش کی راہیں واضح ہیں۔
اور وہ لوگ۔
جو دانش وری کے باوجود ضمیر کی روشنی سے عاری ہیں۔

جن کے پاس روح کی کوئی تابانی نہیں۔
جن کے قلب کی قوتیں مر چکی ہیں۔
اور جو ہر چیز کو مادے کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں۔
وہ لوگ۔
اسے کیا سمجھ پائیں گے۔
وہ ان آوازوں کو کیا سن سکیں گے۔
ان کے لیے تو کوئی بصیرت ہی نہیں۔

(۴)

سعید روحوں نے دیکھا۔
فضا سے ایک ہی پانی برستا ہے اور ساری۔
دھرتی لہلہا اٹھتی ہے ہرے بھرے سنہرے۔
تناور درخت حسین شگوفے دل آویز غنچے۔
کھجور کے گابھ گیہوں کی بالیاں انگور۔
کی لڑیاں تازہ بہ تازہ نو بہ نو رنگا رنگ۔
اور مختلف الاقسام ایک پانی سے۔
اتنے عالم کی تخلیق اور وہ خالق کائنات پر ایمان لے آئیں۔
پر وہ لوگ۔
جو مادہ پر ایمان لا چکے ہیں۔
جو ایٹمی توانائی کے پجاری ہیں۔
یا جو عوام کی طاقت ہی کی پرستش کرتے ہیں۔
وہ تو۔
خود ساختہ خداؤں کے دلدل میں پہلے ہی گرفتار ہیں وہ کیسے ایمان لاتے۔

وہ تو انکار کرتے ہی رہیں گے۔
اور شرک میں گرفتار ہی رہیں گے۔
بت کا شرک نہ سہی۔
مادہ کا۔
ستاروں کا شرک نہ سہی۔
ایٹمی توانائی کا۔
جنوں کا شرک نہ سہی۔
عوامی طاقت کا۔

(سورہ انعام ۹۴ تا ۹۹)

خدا کی قسم

(۱)

قسم۔
قسم۔
قسم۔
ہمیں قسم ہے۔
آپ کے زمانے کی قسم۔
جو آپ کا زمانہ ہے۔
جسے آپ نے پر بہار بنا دیا۔
جسے آپ نے تازگی بخشی۔
اور جو آپ کے دم سے رشک آفریں ہو گیا۔
خیر و برکت والا زمانہ۔
عزت و شرف والا زمانہ۔

(۲)

اور ہمیں قسم ہے۔
آپ کے شہر کی قسم ہے۔
اس لیے نہیں کہ وہاں !
ہماری تجلیوں کا نشیمن کعبہ ہے۔
میری رحمتوں کا لازوال سرچشمہ آب زمزم ہے۔
گناہوں سے پاک کرنے والا پاک حجر اسود ہے۔

میزاب رحمت ہے اور محترم عرفات ہے۔
مقدس منٰی ہے اور طاہر وادیٔ مزدلفہ ہے۔
مقام ابراہیم ہے اور رہ گزار اسماعیل۔
بلکہ اس لیے کہ وہاں!
تم ہو!
تم نے اسے تجلی فروزاں بخشی۔
لطافت شبنم دی۔
پھول کی نکہت عطا کی۔
تم نے کعبہ کو آراستہ کیا
اور اسے عبادت کا شباب بخشا۔
اس لیے مجھے مکہ کی قسم!

(۳)

میں قسم یاد فرماتا ہوں!
آپ کے قد موزوں کی!
کائنات نے جس سے راست قدمی سیکھی۔
آپ کے سن وصال کی!
دھرتی کو جس نے زندگی کا شعور بخشا۔
میں قسم یاد فرماتا ہوں!
آپ کے تابناک روئے روشن کی!
دھوپ جس کے سائے میں پروان چڑھی۔
آپ کے زلف معنبر کی!
رات کی سیاہ چادر جس کے گھنیرے سائے میں ڈیرے ڈالتی ہے۔

تبسم پنہاں کی!

پھول جس کا اشارہ پاکر ہنستے ہیں۔

دشمنوں نے کیا کہا؟

آپ کے رب نے آپ کو چھوڑ دیا۔

پروردگار ناراض ہو گیا۔

ہادی مطلق نے بھٹکا دیا۔

اور آپ محتاج ہو گئے۔

حالاں کہ!

اس نے ساری کائنات میں آپ کو مصطفٰے بنایا۔

تو کیا چھوڑنے ہی کے لیے؟

محفل حیات میں بار بار آپ کو راضی کیا۔

تو کیا ناراض ہونے ہی کے لیے؟

اس نے ہدایت کی راہ خود آپ پر روشن کی کیا بھٹکانے ہی کے لیے؟

اور سارے عالم سے آپ کو بے نیاز کیا۔

پس آپ محتاج کیسے ہو گئے؟

ہم تو آپ سے راضی تھے۔

راضی ہیں

اور آپ کو اتنا دیں گے کہ آپ بھی راضی ہو جائیں گے اور اتنا بلند کریں گے کہ ہر پچھلی گھڑی پہلے سے برتر ہو گی۔

(۴)

پس تم اپنے رب کی رحمتوں کا خوب چرچا کرو اے محبوب! (اقسام قرآن اور والضحٰی کی روشنی میں)

اشترا کی خوش حالی!

لوگو! تمہیں وہ قصہ معلوم نہیں بڑا ہی اہم قصہ ہے۔

انتہائی عبرت ناک مثال۔

بہت ہی سبق آموز داستان۔

(۱)

وہ دو گردہوں کا ذکر ہے۔

جن میں۔

ایک آسودہ حال تھا۔

دوسرا مفلس۔

ایک عظیم محلوں والا تھا۔

دوسرا بوریہ نشیں، ایک شان وشوکت والا تھا۔

دوسرا بے وقار۔

کیوں کہ ہم نے اول الذکر کو بہت کچھ دے رکھا تھا۔

لہلہاتے کھیت، سونا اگلتی زمین، بار آور فارم، اور بہت سارے باغ بھی رسیلے انگوروں کے، میٹھے پھلوں کے، سنگترے اور سیبوں کے، اناس اور مالٹا کے بے شمار باغ، لاتعداد باغ جن میں چھوہاروں تناور درختوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا جن کے بیچ بیچ میں میٹھے پانی کی پر بہار نہریں تھیں۔

اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ تھا۔

تجوریوں میں بے شمار ڈالر آس پاس لاتعداد عیش وعشرت کے سامان۔

جب کہ دوسرا گروہ۔
بے گھر تھا۔
بے در تھا۔
بے آسرا تھا۔

(۲)

تو اس سال اس آسودہ حال خطے میں بہار خوب آئی۔
کھیت لہلہا اٹھے۔
درخت ٹوٹ کر پھلے۔
کلیاں مسکرانے لگیں۔
پھول قہقہہ بھرنے لگے۔
اور اس خطے کے تمام عشرت کدے ارم زار بن گئے۔

(۳)

تو ایک دن وہ اپنے غریب ساتھیوں کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔
تمہیں ہماری اجتماعی کھیتوں کی شادابی نظر نہیں آتی؟ تم ہماری فلک شگاف عمارتوں کو نہیں دیکھتے۔
دیکھو۔
اس دفتر سے بلند ساری کائنات میں کوئی عمارت نہیں، یہ بندہ دنیا کا مثالی بندہ ہے اور یکتا بھی، اس سے بے شمار کیلوواٹ بجلی پیدا ہوگی اور یہ ہماری فوج کا ہزار ڈویژن ہے جسے دنیا جانتی ہے اور اس سے خائف بھی ہے۔
لیکن ہماری اصل طاقت کسی کو معلوم نہیں۔
اور سنو۔
ہم اتنے خاشحال ہیں کہ دس بارہ سال کی مدت میں ہم نے پانچ بار اپنے وہاں کا نرخ

کم کیا ہے، ہمارے خزانے اتھاہ ہیں، فیکٹریاں رات دن پیداوار میں اضافہ کرتی ہیں۔

اوراب ہم قدرت کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

اوراب ہم اسے بری طرح شکست دے سکتے ہیں ہم لافانی ہیں۔

ہماری جمہوریتیں لافانی ہیں۔

کیا دولت کا یہ اتھاہ ساگر سوکھ سکتا ہے؟

کیا ہمارے انگنت فارم تباہ ہو سکتے ہیں؟ کیا ہمارے کارخانے برباد ہو سکتے ہیں؟

کیا قیامت قائم ہو سکتی ہے؟

اجی۔ قیامت کچھ نہیں، خدا کوئی چیز نہیں، مرنے کے بعد جینا کیا؟

اوراگر۔

قیامت کچھ ہے، آخرت کی کوئی حقیقت ہے اور خدا کسی ہستی کا نام ہے۔

توہم اس جنم میں بھی یہاں سے اچھے رہیں گے۔

کہ ہر عمل کے بعد اس کا ردعمل بہتر ہی ہوتا ہے۔

(۴)

آخر مفلسوں سے نہ رہا گیا۔ اور بول اٹھے۔

اپنے پالن ہار کے خلاف اتنی دونہ کی نہ لو، اپنے خالق کے ساتھ کفر نہ کرو۔

رب کائنات کا مذاق نہ اڑاؤ۔

کیا اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہو، جس نے تمہیں مٹی سے بنایا، ایک قطرہ منی سے پیدا کیا، خون کے لوتھڑے سے یہ بلند و بالا انسان کھڑا کر دیا۔

(۵)

بے شک۔

یہ کارخانے برباد ہو سکتے ہیں، ان فوجوں کا شیرازہ بکھر سکتا ہے، یہ کھیت سبزے اگانا چھوڑ سکتے ہیں، اور آسمان کی ایک ہی تابناک بجلی تمہاری ساری عمارتوں کو خاکستر کر سکتی ہے۔

پھر تمہاری مملکت ملبہ پر زمین ہوگی، اور پانی اتنی دور تہ میں چلا جائے گا کہ تم تلاش کے بعد بھی نہ پا سکو گے۔

اس لیے۔

ہم تو اپنے رب کا کفران کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، اور تمہیں اپنے معبود کا شکریہ ہی ادا کرنا چاہیے، تم ہمیں طعنہ نہ دو۔

ہمیں اپنے خدا سے بڑی امیدواری ہے۔

وہ ہمیں تمہارے قابل رشک اسباب سے بہتر دے سکتا ہے۔

(۶)

اور خدا کا کرنا ایسا ہی ہوا۔

بجلی کڑکنے لگی۔

بادل گھر آئے۔

اور ایک مہیب طوفان نے انہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیا، پھل جھڑ پڑے کھیتی جل گئی۔

مکانات بیٹھ گئے۔

اور ساری جماعت تتر بتر ہوگئی۔

اور ان کا سردار دونوں ہاتھ افسوس سے ملتا تھا اور کہتا تھا۔

اے کاش میں نے کفر نہ کیا ہوتا۔ اے کاش میں نافرمانی کے دلدل میں نہ پھنسا ہوتا۔

اے کاش میں انجام سے پہلے ہی باخبر ہوتا۔

اس حال میں کہ نہ کوئی جماعت تھی جو خدا کے مقابلے میں اس کی مدد کرتی نہ وہ خود بدلہ لینے کے قابل تھا۔

(۷)

یہیں سے کھلتا ہے کہ اختیار سچے اللہ کا ہے اور اس کے ماننے کا انجام بھلا ہے۔

(سورہ کہف آیت ۳۲ تا ۴۴ کی روشنی میں)

حدیث پاک

مذہب اسلام کے دو بنیادی سرچشمے ہیں "قرآن" و "حدیث" انہیں سے ملت اسلامیہ کو ہر دم تازہ حیات ملتی ہے اور یہی سارے احکام وقوانین کا مدار ہیں۔

"قرآن" خدائے قادر وقیوم کا وہ آخری پیغام ہے جس کو پیغمبر اسلام محمد عربی ﷺ نے یہ کہہ کر پیش فرمایا کہ یہ "خدا کا کلام ہے" جس سے زیادہ تلاوت کیے جانے والا دنیا کا کوئی صحیفہ نہیں اور جس سے زیادہ مشہور دنیا کی کوئی کتاب نہیں، وہ دنیا کی منفرد کتاب ہے جس کے بارے میں دوست ودشمن سبھی پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یوم ظہور سے آج تک اس کے ایک شوشہ میں بھی کسی قسم کا کوئی تغیر نہ ہوا اور صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی روز اول کی طرح وہ اچھوتی اور بے داغ کتاب ہے۔

"حدیث" یہ رسول اللہ ﷺ کے اقول، افعال، اور ان کے سامنے کیے ہوئے کام جن پر آپ نے سکوت فرمایا (تقریر) کا نام ہے، کہنے کو تو یہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہے لیکن در حقیقت وہ خدا ہی کی بات ہے۔

﴿وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ . إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ﴾[النجم: ۲]

محمد ﷺ اپنی خواہش سے نہیں بولتے جز ایں نیست کہ وہ وحی ہوتی ہے جو ان پر القا ہوتی ہے۔

آپ کے ایک ایک فعل کا قرآن اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح اپنی آیتوں کا۔

﴿وَمَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانتَهُوا﴾[الحشر: ۷]

رسول اللہ ﷺ تم کو جو دیں وہ لو اور جس سے روکیں رک جاؤ۔

قرآن عظیم کی متعدد آیتیں اس امر پر صاف اور صریح روشنی ڈال رہی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ (معاذ اللہ) صرف ایلچی اور قاصد نہ تھے، آپ کی رسالت کا صرف یہی مقصد نہیں کہ آپ

نے بندوں کے ہاتھ میں خدا کی کتاب دے دی، بلکہ آپ حکم دینے والے اور منع کرنے والے حاکم ہیں۔آپ حلال وحرام کرنے والے شارع ہیں،آپ بانی اسلام ہیں۔اور آپ نائب رب العالمین ہیں:

﴿يَأْمُرُهُم بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبَآئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالأَغْلاَلَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِينَ آمَنُواْ بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُواْ النُّورَ الَّذِيَ أُنزِلَ مَعَهُ أُوْلَـئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ﴾

[الاعراف:۱۵۶]

انہیں نیکیوں کا حکم دیتے ہیں برائیوں سے روکتے ہیں اوران کے لیے طیبات حلال کرتے ہیں اور خبائث حرام فرماتے ہیں اوران کے بوجھ اور بیڑیاں جوان پر تھیں دور فرماتے ہیں۔

﴿إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ اللّهُ.﴾[النساء:۴]

﴿فَلاَ وَرَبِّكَ لاَ يُؤْمِنُونَ حَتَّىَ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لاَ يَجِدُواْ فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُواْ تَسْلِيماً﴾ [النساء:۶۴]

ہم نے آپ کی طرف کتاب حق اتار دی تا کہ آپ لوگوں کے درمیان اپنی خدا داد بصیرت سے فیصلہ فرمائیں۔آپ کے رب کی قسم وہ اس وقت تک مسلمان ہو ہی نہیں سکتے جب تک کہ اپنے اختلافات میں آپ کو فیصل نہ تسلیم کریں۔پھر آپ کے فیصلہ کے خلاف دل میں تنگی محسوس نہ کریں اور آپ کے مطیع ومنقاد ہوں۔

آپ کی اطاعت وفرماں برداری اسی طرح فرض ہے جس طرح قرآن عظیم کے احکام کی بجا آوری بلکہ آپ کی اطاعت ہی احکام قرآنی کی بجا آوری کا دوسرا نام ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾[الاحزاب: ۲۰]

تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں اچھی پیروی ہے۔

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ﴾[آل عمران: ۳۰]
اگر تم لوگ خدا سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو خدا تم کو محبوب بنالے گا۔
﴿مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ﴾[النساء: ۷۹]
جس نے رسول اللہ ﷺ کی پیروی کی اس نے خدا کی فرماں برداری کی۔
اس لیے جو شخص قرآن کو سند مانتا ہے اسے حدیث رسول کو سند مانے بغیر چارہ نہیں۔

ہاں قرآن کا انکار کردے۔ مذکورہ بالا آیتوں کو جھٹلادے تو اور بات ہے۔
بلکہ قرآن مجید کی سندی حیثیت جو آج متفق علیہ اور مسلم الثبوت ہے خود اس کی تفصیل میں جائیے تو صورت حال یہ ہے کہ حضور ﷺ نے ایک بات کہی اور فرمایا کہ یہ خدا کا کلام ہے۔ دوسری بات فرمائی اور یہ ارشاد ہوا یہ میری بات ہے۔ سننے والوں نے سر تسلیم خم کیا۔ جس کو خدا کا کلام کہا وحی الٰہی مان لیا، جو سرکار کی بات تھی اسے حدیث قرار دیا، پس یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ حضور کے فرمانے سے تو ہم نے قرآن کو قرآن مانا اس کی سندی حیثیت تسلیم کی اور خود یہ فرمان رسول بے سند رہا تو یہیں سے یہ بات روشن ہوگئی کہ ہم قرآن کو خدا کا کلام اسی وقت مان سکیں گے جب حدیث رسول کو بنیادی حیثیت دیں۔ پھر یہ کتنی عجیب لیکن صادق ترین حقیقت ہے کہ آج سے چودہ سو سال قبل جب کہ نہ تو کسی نے حدیث کی اس حیثیت کو چیلنج کیا تھا نہ کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات آسکتی تھی کہ حلال وحرام تو بس وہی ہے جو کتاب اللہ میں ہے رسول کو اس کا کیا اختیار؟ وہ بس ایلچی اور قاصد ہیں (معاذ اللہ) بلکہ اس وقت جتنے لوگ تھے سب آپ کی ایک ایک بات، ایک ایک اشارہ ابرو کا اپنا دین وایمان سمجھتے تھے، اس وقت آپ فرماتے ہیں:

لاألفين أحدكم على اريكته ياتيه الأمر من أمري مما أمرت به أو نهيت عنه، فيقول: لاأدري، ماوجدنا في كتاب الله اتبعناه.

[مشکوۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ص۲۹]
نہ ٹیک لگائے تم میں اپنی کرسی پر اس کے پاس میرا کوئی حکم آئے جس سے میں نے کسی چیز کا حکم دیا یا کسی چیز سے روکا تو کہے میں نہیں جانتا، جو کتاب اللہ میں ہے ہم اسی کا اتباع کریں

گے۔

الا انی أوتیت القرآن ومثله معه، ألا یوشک رجل شبعان علی أریکته یقول: علیکم بهذا القرآن، فما وجدتم فیه من حلال فأحلوه وما وجدتم فیه من حرام فحرموه، وان ما حرم رسول الله کما حرم الله، الا لایحل لکم الحمار الاهلی. [مشکوۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ: ص۲۹]

خبردار! مجھے قرآن اور اسی کے مثل (حدیث) دی گئی ہے، خبردار کوئی آسودہ حال اپنی کرسی پر یہ نہ کہے کہ اس قرآن کو لازم پکڑو جو اس میں حلال ہے اسے حلال جانو اور جو اس میں حرام ہے اس کو حرام۔ بے شک جس کو رسول نے حرام کیا وہ بھی اسی کی طرح ہے جس کو خدا نے حرام کیا، خبردار گھریلو گدھا حرام ہے۔

کیا یہ حدیث اس امر کی واضح دلیل نہیں کہ "غیب داں" نبی نے آنے والی صدیوں میں "منکرین حدیث" کے خدوخال دیکھ لیے تھے اور چودہ سو سال قبل ہی سدباب کے لیے واضح پیشین گوئی فرمادی تھی؟ تاکہ آئندہ نسلیں اس واضح ہدایت کی روشنی میں حق و باطل کا امتیاز کرسکیں، گویا فتنۂ انکار حدیث بھی فتنۂ دجال کی طرح ایک نامزد فتنہ ہے۔

"احادیث نبویہ" کی اہمیت اور اس کی بنیادی حیثیت کا اندازہ اسی سے لگایا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں نے اس کے بھی حفظ و بقا کا تقریباً وہی انتظام کیا جو کم و بیش یہ قوم قرآن کے ساتھ کرچکی تھی۔

(ا) کتابت: خود حضور اقدس ﷺ کی حیات طیبہ میں ان کے ارشادات آپ کی مرضی بلکہ آپ کے حکم سے قلم بند کیے گئے۔

عن ابن عمرو قال کنت اکتب کل شئ اسمعه من رسول الله ﷺ ارید حفظه، فنهتنی قریش وقالوا: أتکتب کل شئ تسمعه ورسول الله ﷺ بشر یتکلم فی الغضب والرضا، فامسکت عن الکتابة فذکرت ذلک لرسول الله ﷺ فاوما باصبعه الی فیه فقال: أکتب فوالذی نفسی بیده! مایخرج منه

الا الحق. [ابوداؤد:۲/۱۶۵][سنن الواری:۱/۸۵]

حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ میں حضور سے جو بھی سنتا یاد کرنے کی غرض سے لکھ لیتا۔ قریش نے مجھ کو منع کیا اور کہا کہ حضور بشر ہیں غصہ اور رضامندی دونوں حالتوں میں بات کرتے ہیں تو میں تحریر سے رک گیا۔ پھر حضور سے میں نے اس کا ذکر کیا: آپ نے دہن اقدس کی طرف اشارہ کر کے فرمایا لکھ لیا کرو اس ذات کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے اس منہ سے صرف حق ہی نکلتا ہے۔

حضرت عبداللہ نے اپنی اس کتاب کا نام "صادقہ" رکھا تھا یہ کتاب کتنی ضخیم ہوگی اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ حضرت ابوہریرہ جن کی تعداد مرویات پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے وہ فرماتے ہیں کہ

ما من اصحاب النبی ﷺ احد اکثر حدیثا منی الا ما کان من عبداللہ بن عمرو. [بخاری شریف:۱/۲۲]

حضور کے صحابہ میں مجھ سے زیادہ کسی کے پاس "حدیث" نہیں سوائے عبداللہ بن عمرو کے۔ اس کی وجہ وہی تحریر حدیث ہے۔

(۲) "عرب کا خداداد حافظہ" جو ان کی تاریخ کا محافظ ان کے نسب ناموں کا امین رہا بلکہ جس کی جولانیاں اونٹوں اور گھوڑوں کے نسب ناموں کے میدان میں اپنی روانی دکھاتی رہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے عرب کے خمیر میں یہ مخفی خزانہ اسی لیے رکھا اور برابر مختلف سمتوں میں اس کی ممارست سے اس پر جلا اسی لیے ہوتی رہی کہ نبی عربی ﷺ کی ایک ایک چیز کی تفصیل کو اسی عربی حافظہ کی مدد سے پوری دنیا تک پہونچانا تھا، چناں چہ آپ کی بارگاہ کے حاضر باش صحابہ نے پوری جاں کاہی اور دل سوزی کے ساتھ آپ کی حیات طیبہ کی ایک ایک تفصیل یاد کی، اس کو باہم ایک دوسرے سے دہراتے رہے اور کل کا کل دیانت داری کے ساتھ پچھلی نسل کو سپرد کر دیا۔ یہی حضور کی تاکید تھی اور اسی پر آپ کے ماننے والوں کا عمل رہا۔

احفظوہ واخبروہ من ورائکم. [بخاری شریف:۱/۱۹]

میری حدیثیں یاد کرو اور اپنے بعد والوں کو بتاؤ۔

نضر الله عبداً سمع مقالتی فحفظها ووعیها واداها کماسمعها.

[مشکوۃ شریف ص ۲۸ ملخصاً]

اللہ تعالیٰ اس بندے کو آسودہ کرے جس نے میری بات سنی تو اس کو یاد کیا محفوظ رکھا پھر جیسا سنا تھا دوسروں تک پہونچا دیا۔

قال علی تذاکروا الحدیث تذا وروا فانکم ان لم تفعلوا یدرس العلم.

[دارمی ص ۷۶]

حضرت علی نے فرمایا حدیث شریف کا دورہ کیا کرو اور اس سلسلہ میں باہم ملا کرو اگر ایسا نہیں کروگے تو علم مٹ جائے گا۔

(۳) ''سند'' حضور ﷺ کے عہد گرامی سے عہد شہرت تک ہر ہر حدیث کی روایت میں جتنے آدمیوں نے حصہ لیا ہر ایک کا نام سلسلہ وار بلکہ ایک ہی حدیث کے کئی کئی سلسلے جس کی بنیاد پر آج بھی پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضور کی یہ بات ہم تک کن کن ذریعوں سے پہنچی ہے۔

(۴) ''اسماء الرجال'' نقل حدیث میں حصہ لینے والے پانچ لاکھ آدمیوں کی ہسٹری ان کا نام، والد کا نام، کس سے پڑھا، ان سے کس کس نے علم حاصل کیا۔ ان کا کیرکٹر کیسا تھا؟ حافظہ کمزور تو نہ تھا؟ جھوٹ تو نہ بولتے تھے؟ امانت و دیانت میں تو کوئی کمی نہ تھی؟ غرض یہ کہ وہ ساری تفصیل جس سے یہ بھروسہ حاصل ہو سکے کہ اس شخص نے پوری دیانت داری کے ساتھ حدیث سنی اور جیسی سنی تھی ویسی ہی دوسروں تک پہنچا دی پھر ان پر مستزاد ''علما جرح و تعدیل'' جو کسی بڑے سے بڑے انسان کی بھی کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری یا بھول چوک بھی معاف نہیں کرتے بلا رورعایت کذاب، مفتری، متروک الحدیث، یوھم، قد تغیر فی آخر عمرہ وغیرہ کہہ کر روایات حدیث کے اس چشمۂ صافی کو کھنگالتے اور صاف کرتے رہے۔ جس کی وجہ سے آج بھی کسی وسیلہ کار کو حدیث میں آمیزش کرنی تقریباً ناممکن ہے۔

(۵) ''اصول حدیث'' جس میں حدیث کی سند کے لحاظ سے درجہ بندی، حدیث نبوی سے متعلق ساری تفصیلات اور ان سے مفصل بحث کی جاتی ہے تاکہ حدیث سے ثابت ہونے والے احکام اور ان کی سندی حیثیت پوری طرح اجاگر ہو سکے۔

الغرض عہد رسالت سے آج تک اگر قرآن عظیم کی حفاظت کے یہی دو طریقے مسلمان قوم میں رائج ہیں کہ اسے صحیفوں میں لکھا گیا ہے تو احادیث کریمہ کی حفظ و بقا سے بھی اہل اسلام اس عہد سے آج تک اسی طرح عہدہ برآ ہوتے رہے کہ سینوں کے ساتھ ساتھ سفینوں میں بھی وہ منقوش اور محفوظ ہوتا رہا۔ اور اس وقت سے آج تک بھی مسلمان اس کو مثبت احکام سمجھتے رہے وحی غیر متلو مانتے رہے۔

ہاں یہ فرق ضرور ہے کہ قرآن حکیم کو ایک مدون کتاب کی شکل لکھ کر نہ بھی یاد کرا کے جناب رسالت مآب ﷺ دنیا سے تشریف لے گئے جب کہ احادیث نبویہ کو کسی مرتب کتاب کی شکل حضور ﷺ نے نہ دی۔ اس کی تدوین حضور کے دور میں بھی صحابہ نے اپنے طور پر کی اور بعد کی صدیوں میں بھی لوگوں نے اپنے اپنے طور پر ان کو کتابی شکل میں مدون کیا، لیکن اس سے اگر اثر پڑ سکتا ہے تو احادیث کی مدونہ صورت اور مرتبہ شکل پر یعنی یہ کہا جا سکتا ہے کہ حضور نے احادیث کو کتاب کی شکل میں مرتب نہیں فرمایا اسلیے متداول صحیفوں میں ''بخار شریف'' ہی کیوں نہ ہو ہم کسی پوری کتاب کو اصل اسلام اور سر چشمۂ دین نہیں کہہ سکتے، یہاں کتابوں سے نہیں ہر ہر حدیث سے الگ الگ بحث ہوگی، کسی بھی مجموعے کی کوئی بھی حدیث اگر اتنے راویوں سے مروی ہو کہ ان کا جھوٹ بولنا عادۃً ممکن، ہو اور ہم کو اس کا یقین ہو رہا ہے کہ وہ قول رسول ہے تو وہ حدیث ''متواتر'' اور اس سے جو حکم ثابت ہو قطعی جس طرح قرآن سے ثابت شدہ امر، اور جو اس سے جس قدر بھی ثبوت میں کم درجہ ہو اس سے ثابت شدہ حکم کی نوعیت بھی اسی حیثیت سے ہلکی ہوتی جائے گی۔ لیکن یہ ہلکا پن حدیث رسول ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ اس کے قول رسول ہونے میں شبہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح قرآن کی شاذ قرائتیں نہ قرآن قرار دی جاتی ہیں نہ ان سے حکم ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ثبوت حد تواتر کو نہیں پہنچتا ہے۔ یعنی یہ قطعیت

کے ساتھ نہیں معلوم کہ رسول اللہ ﷺ نے اسے بھی قرآن قرار دیا ہے۔

پس ایک نا قابل انکار اور غیر متزلزل حقیقت ہے کہ حدیث رسول ﷺ بھی اصل اسلام اور سرچشمۂ دین ہے، اور میں کہتا ہوں کہ ان سب سے قطع نظر خود احادیث کریمہ کی معجزانہ تاثیر اس کی لازوال دل آویزی اور بے پناہ تسخیری قوت ہی اس کی بنیادی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس پاک وصاف چشمۂ حیوان کی انسانوں کو اس وقت تک ضرورت رہے گی جب تک محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو سمجھنا چاہیں گے بلکہ قرآن فہمی کے لیے بھی اولین بنیاد واحادیث رسول ہی ہیں۔ اس لیے فتنۂ انکار حدیث ہو (اہل قرآن) یا فتنۂ اقرار حدیث وغیر مقلدین اور مودودی صاحبان کے فتنوں کا طوفان اس شمع حقیقت کی روشنی کو فنا نہیں کرسکتا حقیقت پھر بھی حقیقت ہے۔ فتنے اپنی موت آپ مرا کرتے ہیں ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ احادیث نبویہ کی کثرت اور وسعت کے ساتھ اشاعت ہوتی رہے۔

حدیث غار

ان عبدالله بن عمر قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول: انطلق ثلثة رهط ممن كان قبلكم حتى اوَوا المبيت الى غارٍ، فدخلوه فانحدرت صخرة من الجبل فسدت عليهم الغار فقالوا: إنه لاينجيكم من هذه الصخرة الا ان تدعوا الله بصالح أعمالكم .فقال رجل منهم اللهم كان لى أبوان شيخان كبيران وكنت لا اغبق قبلهما أهلا ولامالا فنأى بى طلب شئ يوما فلم أرح عليهما حتى ناما . فحملت لهما غبوقهما فوجدتهما نائمين فكرهت أن أغبق قبلهما أهلا ومالا فلبثت والقدح على يدى أنتظر استيقاظهما حتى برق الفجر، فاستيقظا فشربا غبوقهما، اللهم إن كنت فعلت ذلك ابتغاء وجهك ففرج عنا مانحن فيه من هذه الصخرة فانفرجت شيئا لايستطيعون الخروج، قال النبى ﷺ، وقال الاخر: اللهم كانت لى بنت عم كانت أحب الناس إلي فاردتها على نفسها فامتنعت منى حتى المت بها سنة من السنين فجاء تنى

فاعطيتها. عشرين ومائة دينار على أن تخلي بيني وبين نفسها، ففعلت حتى واذا قدرت عليها قالت لا احل لک أن تفض الخاتم الا بحقه، فتحرجت من الوقوع عليها فانصرفت عنها وهي أحب الناس اليّ وتركت الذهب الذي اعطيتها. اللهم إن كنت فعلت ذلک ابتغاء وجهک فافرج عنامانحن فيه، فانفرجت الصخرة غير أنهم لايستطيعون الخروج منهاقال النبى ﷺ: وقال الثالث: اللهم استاجرت اجرآء فاعطيتهم أجرهم غير رجل واحدٍ ترک الذى له وذهب فثمرت أجره حتى كثرت منه الاموال فجاء نى بعد حين فقال ياعبدالله أدّ إلى أجرى، فقلت له كل ماترىٰ من أجرک من الابل والبقر والغنم والرقيق فقال ياعبدالله لاتستهزى بى، فقلت إنى لااستهزى بک فاخذ كله فاستاقه فلم يترک منه شيئا، اللهم فان كنت فعلت ذلک ابتغاء وجهک فافرج عناما نحن فيه فانفرجت الصخرة فمزجوا يمشون.

[بخاری شریف:۱/۳۰۳]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول خدا ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا: تم سے پہلی امت میں تین آدمی کہیں کے لیے چلے۔ رات ایک غار میں گزارنے کا اتفاق ہوا۔ ابھی وہ داخل ہی ہوئے تھے کہ پہاڑ کے بالائی حصہ سے ایک بھاری چٹان لڑھکتی ہوئی آئی جس نے غار کا منہ اس طرح بند کرلیا کہ وہ اس میں دفن ہوکر رہ گئے۔

پھر ان تینوں نے باہم مشورہ کیا کہ یہ عذاب الٰہی ہے حیلہ وتدبیر سے دفع نہیں ہوگا۔ ہم لوگ اپنی زندگی میں کیے ہوئے کسی نہایت ہی عظیم کار ثواب کے وسیلہ سے دعا مانگیں۔ تو اللہ اس کو رفع فرمائے گا۔ تو ایک آدمی نے کہنا شروع کیا:

یا اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میری یہ عادت تھی کہ میں انہیں شام کا کھانا کھلائے بغیر نہ خود کھاتا نہ اہل وعیال کو کھلاتا نہ مویشی ومال کو کچھ دیتا۔ اتفاقاً میں کسی کام سے باہر گیا اور شام کو دیر سے لوٹا اور حسب عادت ان کے لیے شام کا دودھ لے کر حاضر ہوا

تو وہ سو گئے تھے۔ مجھے افسوس ہوا اور میں نے اپنے مویشی اور عیال کو بھی کچھ کھلانا پسند نہیں کیا تا آں کہ وہ کھانہ لیں۔ ان کی بیداری کے انتظار میں پیالہ ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ جب صبح چمکی تو وہ جاگے اور میں نے ان کو دودھ پلایا۔

یا اللہ اگر میرا یہ فعل تیری خوشنودی کے لیے تھا تو اس کی برکت سے ہمارے سر سے اس چٹان کی بلا دور فرما دے۔ دعا کے بعد چٹان سرکی تو مگر اتنی نہیں کہ سب باہر نکل سکیں۔

تب دوسرے نے یوں فریاد شروع کی یا اللہ تو دانا ہے بینا ہے کہ میری ایک چچازاد بہن تھی جس پر میں جی جان سے عاشق تھا۔ میں نے اس سے خواہش نفس پوری کرنی چاہی تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ شدید قحط سالی میں مبتلا رہی اور میرے پاس آئی میں نے اس شرط پر اس کو ۱۲۰ اشرفیاں دیں کہ وہ مزاحمت ترک کرے اور اپنے اوپر مجھے قابو دے۔ مجبوراً وہ آمادہ ہوگئی، لیکن جب میں اپنے مقصد کے بالکل قریب پہونچ چکا تھا کہ اس کی سعید روح چیخ اٹھی، للہ تو اس مہر کو ناحق مت توڑ، اس آواز پر میرا دل بھی ہل گیا، قابو پاکر بھی اپنی محبوب ترین خواہش کو میں نے ٹھکرا دیا۔ جماع سے باز آیا اور اشرفیاں بھی اس کو دے دیں۔

یا اللہ! تو دانا و بینا ہے یہ کام میں نے تیری رضا کے لیے کیا تھا۔ تو اس کار خیر کی برکت سے ہماری اس مصیبت کو ٹال دے، اس فریاد کے بعد بھی پتھر کچھ سرکا۔ پر اتنا نہیں کہ وہ سب اس سے باہر آسکیں۔

تب تیسرے نے آہ وزاری شروع کی۔ بارالہا تو خوب جانتا ہے کہ میں نے کچھ مزدور رکھے۔ کام کے بعد سب نے اپنی مزدوری لے لی، مگر ایک آدمی اسے میرے پاس ہی رکھ کر کہیں چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کو کاروبار میں لگا دیا، خدا کی شان اس میں غیر معمولی برکت ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ شخص اپنے سفر سے واپس ہوا اور اس نے مجھ سے اپنی اجرت مانگی، میں اضافہ سمیت پورے مال کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ سارے اونٹ بھی تیرے، یہ کل گائیں بھی تیری، اور یہ سب بکریاں اور غلام بھی تیرے۔ اس نے حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہا: آپ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں نے صورت حال سے آگاہ کیا کہ مذاق نہیں یہ حقیقت ہے۔ تب وہ

سب کا سب لے گیا۔

اے علیم وخبیر تو خوب جانتا ہے کہ یہ فعل میں نے تیری خوشنودی کے لیے کیا تھا تو اس کار خیر کے وسیلہ سے یہ آفت ہم سے ٹال دے، اب وہ پتھر سرکا اور اتنا راستہ ہوگیا کہ سب اس سے باہر نکل گئے۔

(۱)

پیغمبر اسلام روحی فداہ ﷺ نے اپنے اس ارشاد مبارک میں انسانی زندگی کے معاملات اور معاشرتی امور سے متعلق بیش بہا نمونے اور مکارم اخلاق کے اعلیٰ پیانے پیش فرمائے ہیں۔

انسانی تعلقات میں ماں باپ اور بیٹے کا رشتہ نہایت احترام کا بھی ہے اور محبت وشفقت کا بھی۔ دنیا کی ہر قوم نے ماں باپ کو اونچا مقام دیا۔ اسلام نے کچھ اور بلندیاں عطا کی ہیں ارشاد نبوی ہے:

الجنة تحت اقدام الامهات. کنز العمال ۱۶/ ۴۶۱ حدیث: ۴۵۴۳۹

ماں کے قدم کے نیچے جنت ہے۔

اور غور سے دیکھا جائے تو بات فطرت کے عین مطابق بھی ہے اور اسی میں معاشرہ انسانی کی صلاح بھی۔

چناں چہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ آدمی ہر اس شخص کا احسان مانتا ہے اور اس کا اعزاز واکرام کرتا ہے جس کے ذریعہ اس کو کچھ بھی فائدہ پہونچا ہو۔ جیسے ڈاکٹر کے ذریعہ صحت ملی۔ استاد کے ذریعہ علم وعقل میں اضافہ ہوا۔ رہنماؤں کے ذریعہ زندگی کی دوسری برکتیں حاصل ہوئیں۔ حالاں کہ یہ سارے فوائد ذات سے زائد اور شخصیت سے حاصل ہیں۔ بس زائد اوصاف کے حصول کا جو ذریعہ بنے اس کی تعظیم وتکریم جب انسانی فطرت کا تقاضا ہے تو جو لوگ ہماری ذات اور شخصیت، ہمارے وجود اور زندگی کا ذریعہ بنے اور جنہوں نے اپنے غیر معمولی تیاگ سے، ہماری ذات کے تحفظ وبقا اور اس کی تعمیر اور تکمیل کے لیے سامان فراہم کیے۔ ان کی تعظیم وتکریم کیوں ضروری نہ ہوگی۔ ان کی احسان فراموشی کہاں کی دانشمندی ہوگی۔

اسی لیے پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک ایسے صحابی کے جواب میں جس نے ماں کے احسانات کا بدلہ چکانا چاہا تھا ارشاد فرمایا:

''تیرے پیدا ہونے میں تیری ماں کو درد کے جو بے شمار جھٹکے لگے ہیں ان میں سے ایک کا بھی بدلہ نہ دے سکے گا''۔

والدین کے احترام واطاعت میں معاشرتی اصلاح کا ایک شمہ بیان اس طرح ہے کہ بچہ جب تک چھوٹا ہے آخر والدین سے شدید ربط اور احترام کے نتیجہ ہیں۔(الف) تعلیم وتربیت سے کما حقہ بہرہ ور ہوگا۔(ب) عدم تحفظ اور کمزوری کے خوف سے نجات ملے گی۔ حفظ واعتماد اور امداد اعانت کی دولت حاصل ہوگی۔(ج) مجموعی طور پر شخصیت کی تکمیل کا عمل مکمل ہوگا۔ اور بڑے ہو کر والدین سے یہ رشتہ استوار رکھنے پر والدین کی حفاظت، ان کی خدمت، ان کے مستقبل کا تحفظ، اور خاندانی زندگی کا وہ حقیقی فائدہ حاصل ہوگا جس سے آج کی نئی تہذیب بالکل تہی دامن ہوتی جارہی ہے۔

اور یہی حقیقت ہے جس کی طرف حضور نبی کرم ﷺ نے رہنمائی فرمائی:

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا.

[مشکاۃ شریف ۴۲۳]

جو بڑا چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور جو چھوٹا بڑوں کی تعظیم واکرام نہ کرے وہ اسلامی معاشرہ کے تصور سے نابلد ہے اور جس تہذیب اور جس قوم کو اسلام برپا کرنا چاہتا ہے اس سے اس کو کوئی حصہ نہیں ملا۔

حدیث مذکور کے ابتدائی حصہ میں والدین کے اکرام اور ان کی خدمت کا ایک انتہا پسندانہ نمونہ حضور نبی اکرم ﷺ نے گزشتہ امتوں کی تاریخ سے پیش فرما کر اپنی امت کو بھی والدین کی تعظیم اور خدمت کی تعلیم دی ہے۔

یہ ایک ایسے آدمی کی کہانی ہے جو والدین کی اطاعت اور خدمت میں اس درجہ آگے تھا کہ شام کا دودھ جب تک اپنے والدین کو پلا نہ لیتا نہ خود پیتا نہ اپنے بال بچوں کو پینے دیتا۔ حدیہ

کہ جانوروں کو ان سے پہلے چارہ بھی نہ دیتا۔ اتفاقاً ایک روز اتنی دیر سے گھر واپس ہوا کہ والدین سو گئے۔ پھر اس نے ساری رات ہاتھوں میں پیالہ لے کر کھڑے ہو کر اس انتظار میں گزار دی کہ کب یہ نیند سے بیدار ہوں اور کب میں ان کی خدمت میں دودھ پیش کروں جب کہ اس کے سارے اہل وعیال مویشی ومال تڑپتے رہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ ارشاد فرماتے ہیں: رب العزت جل وعلا کو اس کا یہ عمل اور والدین کی یہ غایت درجہ کی تعظیم اس درجہ پسند ہوئی کہ اس نے اس شخص کی اسی عمل کے برکت سے اس کی زندگی کی ایک بھیانک مصیبت ٹال دی جس میں وہ جیتے جی ایک غار میں دفن ہو کر رہ گیا تھا۔ اس حدیث مبارک سے مندرجہ ذیل امور پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) حقوق والدین کو بقیہ تمام رشتہ داروں کے حقوق پر تقدم حاصل ہے۔ اگر چہ یہ تقدم درجہ استحباب میں ہی کیوں نہ ہو۔

(۲) اس سلسلہ میں اولاد اگر خدمت کا انتہا پسندانہ رویہ بھی اختیار کرے تو خدا کے نزدیک محمود اور مقبول ہے اور اطاعت والدین کی یہی وہ منزل ہے جو بعض حالات میں اسلام کا طرۂ امتیاز بن گئی ہے۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسمٰعیل کو آداب فرزندی

اور یہی وہ نکتہ ہے جس کی تشریح استاذ گرامی حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے فرمائی:

میاں جائز تو سب کی ماننا ہے۔ اگر والدین کی بھی صرف جائز بات ہی تم نے مانی تو والدین کو کیا مانا۔ ان کی تو زیادتی بھی اگر تمہاری نظر میں ہو تو ماننا چاہیے اور سر تسلیم خم کرنا چاہیے۔ تب والدین کا ماننا ہوگا۔

اور یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حدیث گرامی میں رہنمائی فرمائی گئی ہے:

اطع والدیک وان امراک أن تطع عن أھلک ومالک.

تو اپنے والدین کی اطاعت کر اگر چہ تجھ کو یہ حکم دیں کہ اپنی اہل اور مال سے دست بر

وار ہوجا۔

(۳) یہ بھی معلوم ہوا کہ والدین کمزور اور ضرورت مند ہوں تو اس کا نفقہ بیٹے کے ذمہ ہے۔ کہ حدیث مذکورہ بالا میں خدمت والدین کی اسی قسم پر انعام مرتب ہوا ہے جو خورد ونوش سے متعلق ہے۔

(۴) اس حدیث مبارک نے یہ امر بھی واضح کیا کہ کوئی قابل احترام شخصیت اگر محو خواب ہو تو کسی ضرورت ملجیہ کے بغیر ان کا جگانا خلاف ادب ہے۔ ادب محمود یہی ہے کہ ان کے خود جگ جانے کا انتظار کیا جائے۔

(۵) اس حدیث مبارک سے یہ اشارہ بھی ملا کہ وہ فرائض اور ذمہ داریاں جو شرعاً واخلاقاً آدمی پر عائد ہوتی ہیں ان کی ادائے گی بھی اجر وثواب کا باعث ہے اور ایسے افعال بھی عبادت الٰہی میں داخل ہیں۔

(۲)

انسان کو پیدا کرنے والے قادر وقیوم پروردگار نے بنی آدم کے اردگرد فطری خواہشات اور طبعی تقاضوں کا ایک حسین ودل ربا چمن کھلا دیا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی ہیں ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

اور غالباً اس میں قدرت کی یہ مصلحت پوشیدہ ہے کہ ان تقاضوں کی تحصیل وتکمیل کی جد وجہد کے نتیجہ میں انسان کی مخفی قوتوں کے جوہر نمایاں ہوتے ہیں۔ اور کائنات کی آبادکاری اور تکمیل وتعمیر کا عمل انجام پاتا ہے۔

جنسی خواہشات، اور صنف مخالف کی قربت کا احساس بھی انہیں فطری جذبات میں سے ہے جس کی تکمیل کے نتیجہ میں آدمی کی اعلیٰ زندگی وجود میں آتی ہے۔ اور تہذیب وتمدن کے چراغ جلتے ہیں۔

دنیا کے قدیم وجدید دانشوروں میں، طبیبوں، فلسفیوں، معلمین اخلاق۔ اور روحانیت

کے علم برداروں کی ایک بہت بڑی فوج اس فطری جذبہ کی مخالف اور اس کا گلا گھونٹ دینے کی حامی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عورت آدمی کی ذات کے لیے زہر ہلاہل، اور اس کا قرب مرد کی ذات کے لیے "سم قاتل" ہے۔ ایک آدمی انسانیت کی معراج کو اسی وقت پا سکتا ہے کہ وہ عورت سے یکسر قطع تعلق کرے۔

ان النساء شياطين خلقن لنا نعوذ بالله من شر الشياطين۔

عورتیں شیطان بنا کر ہمارے لیے پیدا کی گئی ہیں ہم شیطانوں کے شر سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔

جب کہ اسلام عورت کو قدرت الٰہی کی نشانی، اور میاں بیوی میں ہر ایک کو دوسرے کے لیے خدا کا احسان قرار دیتا ہے چناں چہ ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُم مِّنْ أَنفُسِكُمْ أَزْوَاجاً لِّتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾. (الروم: ۲۱)

اور یہ پروردگار کی بہت بڑی نشانی اور اس کا احسان عظیم ہے کہ اس نے تمہیں میں سے تمہارے جوڑے بنائے۔ تاکہ تم ان سے سکون پا سکو۔ اور تم میں سے ہر ایک کے لیے دوسرے کے دل میں محبت کے بیج بوئے، پیار کی جوت جگائی۔ اور لطف و مہربانی کے دیپ جلائے۔ (مفہوم)

اور یہ قرآن ہی ہے جس نے زوجین میں ایک کو دوسرے کی تکمیل کے لیے ضروری قرار دیا۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ.﴾ (البقرہ: ۱۸۷)

عورتیں تمہارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو۔

انسان کو لباس سے تین فائدے حاصل ہوتے ہیں (۱) پردہ پوشی (۲) زینت و آرائش (۳) حفاظت و آرام، تو ارشاد ہوتا ہے کہ مرد کی زینت عورت سے ہے۔ اور عورت کی آسائش مرد سے ہے، اور عورت کی نسائیت کے گرد مرد حفاظت کی آہنی دیوار ہے۔ اور عورت مرد کے تقدس

اور شرافت کی نگہبان، اسی طرح یہ شوہر کی ہمدم اور دمساز اور وہ اس کا محرم و راز داں اور یہ پیغمبر اسلام ہی ہیں (ﷺ) جنہوں نے عورت کا قرب مرد کے نصف ایمان کی تکمیل قرار دیا۔

ارشاد نبوی ہے:

من تزوج فقد استكمل نصف الايمان، فليتق الله في النصف الباقي .

[کنزالعمال ۱۶/۲۷۵ حدیث: ۴۴۴۳۳/مجمع الزوائد ۴/۲۵۲]

جس نے شادی کی اس نے اپنا آدھا ایمان مکمل کرلیا تو باقی آدھے میں خدائے پاک سے ڈرتا رہے۔

اور یہ ان کی مبارک تعلیم ہے جو عورت سے بھاگنے والوں کو للکار رہی ہے۔

النكاح من سنتي فمن لم يعمل بسنتي فليس مني. [سنن ابن ماجہ/۱۳۳]

نکاح کرنا میرا طریقہ ہے، تو جو اس سے اعراض کرے وہ میرے طریقہ پر نہیں ہے۔

لیکن اس تعلق کے قائم کرنے میں قدرت نے انسان کو شتر بے مہار نہیں بنایا بلکہ بے شمار شرائط اور حدود وضابطے میں اسلام نے میاں بیوی کے ملاپ کو عبادت قرار دیا ہے۔

تزوجوا فان يوما مع التزويج خير من عبادت الف سنة . [مسند الفردوس]

شادی کرو کہ شادی کا ایک دن عبادت کے ہزار دن سے بہتر ہے۔

اور جنسی بے اعتدالیوں کے انسداد کے لیے اسلام نے ایک ایسے معاشرے کی ترتیب وتکمیل کا انتظام کیا جس میں عورتوں اور مردوں کے مشترکہ اجتماعی اور بے محابا اختلاط کا امکان بالکل ختم ہو جائے۔

اسی لیے اس نے عورتوں اور مردوں کے دائرہ کار کا الگ الگ تعین کیا۔ اور عورت کو رب العائلہ اور گھر کی ملکہ بنایا جب کہ مردوں کے لیے باہر کی ذمہ داریوں کا بوجھ رکھا۔

ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [الاحزاب: ۳۳]

مسلمان عورتو! اپنے گھر میں وقار کے ساتھ رہو، اور ایام جاہلیت کی طرح اپنے کھلے نہ

پھرو۔

اس تقسیم کار کے بعد بھی یہ امکان تھا کہ غیر مرد گھروں میں گھس کر تقدس کی فضا کو پارہ پارہ کریں تو اس کے انسداد کے لیے مردوں کو حکم ہوا۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتاً غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا﴾. [نور:۲۷]

اے ایمان والو! دوسروں کے گھر میں بے اجازت لیے اور سلام کیے بغیر ہرگز مت داخل ہو۔ (تا کہ فتنہ کا امکان کم سے کم ہو)

نابالغ بچوں کے لیے روک ٹوک نہیں کہ ان سے بذات خود فتنہ پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں۔ لیکن پاس پڑوس کے یہ بچے بڑے ہو کر بھی اپنی سابقہ عادت کے موافق آتے جاتے رہتے ہیں۔ لہذا اس خطرہ کا بھی سد باب کیا گیا۔

﴿وَإِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَأْذِنُوا كَمَا اسْتَأْذَنَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ [النور:۵۹]

اور جب بچے بالغ ہو جائیں تو انہیں بھی اسی طرح اجازت حاصل کر کے گھر میں داخل ہونے کا حکم ہے جس طرح دوسرے بڑوں کو۔

گھر کے اندر کے اس انتظام کے بعد اندر اور باہر دونوں ہی جگہ اجنبی مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے پرہیز کا یکساں حکم دیا گیا ہے۔

﴿قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ﴾

[النور: ۳۰]

یارسول اللہ ﷺ آپ مسلمانوں کو حکم دیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

اسی طرح عورتوں کو حکم ہوا۔

﴿وَقُل لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ وَلَا

يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ ﴾ (نور:۳۱)

اے پیغمبر ﷺ آپ مومن عورتوں کو بھی حکم فرمادیں کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اور شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ اور اپنی آرائش کی جگہوں کو ظاہر نہ کریں۔ ہاں شوہروں اور دیگر محارم کے لیے یہ پابندی نہیں۔

مشترکہ خاندانوں میں دیور اور بھاوج کا رشتہ بے حد بے تکلفانہ ہوتا ہے کسی نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ شوہر کے چھوٹے بھائی کے لیے تو وہ پابندی نہ ہوگی جو غیر محرموں کے لیے ہے۔ فرمایا: الحموٴ الموت. ارے دیور تو موت ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی تو اور سخت نگرانی کی ضرورت ہے۔ کہ وہ ہر دم ساتھ ہی رہتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں بالکل مقید کر دیا گیا ہے اور انہیں باہر نکلنے اور بضرورت آنے جانے سے روک دیا گیا ہے۔ بلکہ آداب وشرائط کے ساتھ عورت کو باہر نکل کر بھی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی اجازت ہے۔

(۱) اگر عورت مدت سفر (۵۷۔۲/۱ میل) یا اس سے زائد دوری پر جائے تو محرم ساتھ ہونا ضروری ہے۔

”لاتسافر المرأة مسيرة يومين ليس معها زوجها او ذو محرم.“ (بخاری ۱/۱، ۲۵۱)

عورت مدت سفر تک شوہر یا محرم کے بغیر سفر نہ کرے۔

(۲) روزانہ کی ضرورت کے لیے باہر جانا ہو تو پردہ اور حجاب کا پورا پورا انتظام ہو۔

﴿يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَاءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَنْ يُعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْراً رَّحِيْماً ﴾ [الاحزاب:۵۹]

اے نبی! اپنی بیبیوں۔ صاحبزادیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے فرمادو کہ اپنی

چادروں کا ایک حصہ اپنے منہ پر ڈالے رہیں۔ تاکہ پہچانی جائیں کہ یہ پردہ دار عورتیں آزاد بیویاں ہیں باندی نہیں ہیں (تو بد قماش) انہیں چھیڑ نہ سکیں۔

(۳) باہر نکلنا ہو تو پردہ بھی کریں اور خوشبو بھی استعمال نہ کریں۔

عن ابی موسیٰ الاشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ان المرأة اذا استعطرت فمرت بالمجلس فهي كذا و كذا يعني زانية.[مشکوۃ ص۹۶]

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: حضور ﷺ نے فرمایا: عورت خوشبو لگا کر کسی بھیڑ سے گزری تو زانیہ ہے۔

حدیہ ہے کہ مسجد میں جانے والی عورتوں کو بھی خوشبو کے استعمال سے روکا گیا۔

عن زينب امرأة عبدالله بن مسعود قالت: قال لنا رسول الله ﷺ: اذا شهدت احدیٰ کن المسجد فلاتمس طيباً.[مشکوۃ ص۹۶]

زینب امرأۃ عبداللہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا جس عورت کو مسجد میں حاضر ہونا ہو وہ خوشبو استعمال نہ کرے۔

(۴) سب سے مقدم امر تو یہ ہے کہ عورت گھر میں نماز پڑھے۔

عن ابن مسعود: صلوة المرأة في بيتها افضل من صلوتها في حجرتها، وصلوتها في مخدعها افضل من صلوتها في بيتها.[مشکوۃ ص۹۶]

عورت گھر کی چہار دیواری میں نماز پڑھے اس سے افضل یہ ہے کہ اپنے کمرے میں پڑھے اور اس سے بھی افضل یہ ہے کہ اندرونی کوٹھری میں پڑھے۔

لیکن مخصوص اوقات اور مخصوص حالتوں میں مسجد جائے تو عورتوں کی صف مردوں سے علیحدہ رہے۔

يصف الرجال ثم الصبيان ثم النساء.[الهداية الأولين، ۱۰۳]

پہلے مردوں کی صف لگے اس کے بعد بچوں کی پھر عورتوں کی۔

ان دفعات پر غائر نگاہ ڈالنے کے بعد انسان اس فیصلہ پر پہونچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ

ایسے مقدس معاشرے میں زنا اور پرائی عورت سے تعلقات کا امکان کم سے کم ہے۔

لیکن چوں کہ جذبہ بارود صفت ہوتا ہے اس لیے پیغمبر اسلام نے اس کو درجہ اعتدال میں رکھتے اور زنا جیسی برائی کے روکنے بلکہ قلع قمع کرنے کے سارے ہی جتن فرمائے۔

(۱) اجنبی عورت کو دیکھنا حرام قرار دیا۔

"یاعلی: لا تتبع النظرة النظرة فان لک الاولیٰ ولیست لک الأخریٰ."

اے علی پہلی نگاہ جو پڑ گئی جرم نہیں بالقصد اجنبی عورت کو دیکھا تو وبال تم پر ہے۔

اسلام کی یہ غایت احتیاط ہے کہ اس نے عورتوں کو بھی پرائے مرد کا دیکھنا حرام قرار دیا ہے۔

عن ام سلمة وميمونة اذ اقبل ابن ام مكتوم فدخل على النبي ﷺ فقال: احتجبا منه فقلت: يارسول الله! أليس هو اعمىٰ لايبصرنا قال: افعميا وان انتما. [مشكاة ۲۶۹]

ام سلمہ اور میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما روایت کرتی ہیں کہ ایک دفعہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کے پاس آئے اور ہم دونوں آپ کے حضور میں تھیں آپ نے ہمیں حکم دیا کہ ابن ام مکتوم سے پردہ کرو۔ ہم نے عرض کیا: حضور وہ اندھے ہیں ہمیں دیکھ نہیں رہے ہیں۔ ارشاد ہوا تم دونوں تو اندھی نہیں ہو۔

(۲) اجنبی مرد اور عورت کی یکجائی کی شدید مذمت کی۔

عن عمر عن النبي ﷺ قال: لايخلون رجل بامرأة الا كان ثالثهما الشيطان. [مشکوۃ ۲۶۹]

تنہائی میں پرائی عورت کے ساتھ یکجا مت ہو وہاں تیسرا شیطان ہوتا ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں ارشاد ہوا۔

لاتلجوا على المغيبات فان الشيطان يجري من احدكم مجرى الدم.

[مشکوۃ ص۲۶۹]

ایسی عورتیں جن کے شوہر غائب ہوں۔ان کے پاس نہ جاؤ کہ شیطان تمہارے خون کے ساتھ گردش کرتا ہے یعنی اس کے وسوسہ سے کوئی مامون نہیں۔

(۳) پرائی عورت کا قرب تو قرب ہے دیکھنا بھی اسلام نے ممنوع قرار دیا، اس کی آواز کو بھی عورت قرار دیا۔جس کو بلاضرورت سننا حرام ہے۔

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا کین دولت از گفتار خیزد

(۴) خاص زنا کی شناعت و برائی کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر فرمایا: چناں چہ کبھی ارشاد ہوا۔

عن عبدالله بن مسعود قال: أي: الذنب أكبر عندالله؟يا رسول الله قال: ان تدعوا الله نداً، قال: ثم أي: قال: ان تقتل ولدک خشية ان يطعم، قال: ثم أي؟ قال: ان تزني حليلة جارک. [مشکوۃ ص۱۷]

حضور جان نور ﷺ سے پوچھا گیا یارسول اللہ ﷺ سب سے بڑا گناہ کون ہے فرمایا: اشراک باللہ، سوال ہوا اس کے بعد؟ ارشاد ہوا اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کرو کہ تمہارا رزق بانٹ لے گی، عرض کیا گیا: اس کے بعد؟ ارشاد ہوا اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرو۔ یہاں زنا کو عظیم ترین گناہوں میں تیسرا نمبر دیا گیا ہے۔

دوسری جگہ فرمایا جاتا ہے:

لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن . [مشکوۃ ص۱۷]

زانی زنا کرتے وقت مومن نہیں رہتا۔

اس کی تشریح یوں کی گئی ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: اذا زنی العبد خرج منه الایمان فکان فوق راسه کالظلة، فاذا خرج من ذلک العمل رجع الیه الایمان. [مشکوۃ ص۱۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو ایمان اس کے اندر سے نکل کر سایہ کی طرح اس کے سر پر رہتا ہے اور جب وہ اس برائی سے باز آتا ہے تو ایمان لوٹ آتا ہے۔

ایک اور حدیث شریف میں زنا کے برے عواقب سے خبردار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

مامن قوم يظهر فيهم الزنا إلاأخذوا بالسنة. [مشکوۃ ص ۳۱۳]

جس قوم میں زنا کی وبا پھیلتی ہے وہ قحط سالی کے عذاب میں مبتلا کی جاتی ہے۔

(۵) جو شخص زنا کی لعنت میں گرفتار ہو جائے۔ اس کی ایسی کڑی سزا مقرر فرمائی کہ جہاں ایک بار اس کا نفاذ ہو گیا اس مادہ فاسدہ کی جڑ بنیاد ختم ہو گئی۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِئَةَ جَلْدَةٍ﴾[النور: ۲]

زانی مرد اور عورت دونوں کو سو سو کوڑے مارے جائیں۔

یہ تعذیب عظیم اس صورت میں ہے کہ مرد اور عورت غیر شادی شدہ ہوں۔ اور اگر شادی شدہ ہوں تو ان کے لیے یہ دردناک اور عبرت انگیز حد ہے۔

الشيخ والشيخة اذازنيا فارجمو هما نكالا من الله.

شادی شدہ مرد اور عورت زنا کریں تو انہیں سنگسار کرو۔

(۶) ہم نے نکاح کے فضائل میں اوپر جو حدیث درج کی، ہم اس کو بھی زنا کے ختم کرنے کا ایک بڑا سبب سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ کسی پیاسے کو گندے پانی سے روکنا ہی کمال نہیں۔ اس کے سامنے صاف ستھرے پانی کا گلاس پیش کرنا بھی ضروری ہے، جذبات پر قطعی بندش لگانا اور اس کی تسکین کے جائز راستے نہ بتانا نہایت مہلک اور مضر رساں ہے اسی لیے پیغمبر اسلام نے جائز جنسی تعلقات کی راہیں استوار کیں کہ لوگ زنا سے باز آئیں۔ ارشاد نبوی ہے:

يامعشر الشباب من استطاع منكم الباءة فليزوج، فانه أغض للبصر واحصن للفرج ومن لم يستطع فعليه بالصوم فانه له وجاء. [مشکوۃ ص ۲۶۷]

اے جوانو! شادی کرو اگر شادی کی استطاعت ہو کہ یہ نگاہ کو آوارگی سے بچانے والی اور شرم گاہ کی حفاظت کرنے والی ہے۔ اور جو شادی کی استطاعت نہ رکھے تو روزہ رکھے کہ یہ قوت شہوانی کا توڑ ہے۔

اس حدیث مبارک سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ زنا سے بچنے کا ایک طریقہ شادی ہے وہیں یہ بھی پتہ چلا کہ قوت شہوانی پر کنٹرول کے لیے روزہ بھی ایک مفید علاج ہے اور گویا زنا کے خلاف ایک ہتھیار بھی ہے۔

(۷) جس نے اپنی طبیعت پر قابو پا کر زنا سے نجات حاصل کر لی اس کی طرح طرح سے مدح وستائش فرمائی۔ دونوں جہاں میں اس کے رتبہ عالی کا بیان کیا اور اس کو صفحہ گیتی کے سعید ترین انسانوں میں شمار کیا۔ ارشاد ہوتا ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: سبعۃ یظلھم اللہ تحت ظلہ یوم لاظل الا ظلہ: رجل دعتہ امرأۃ ذات منصب وجمال فقال: انی اخاف اللہ رب العالمین .(ملخصا) [کنز العمال ۱۵/۹۰۴،۹۰۵/حدیث:۴۳۵۶۷_۴۳۵۶۸]

حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور سید عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے دن جب خدا کے یہاں رحمت کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا اللہ عزوجل سات آدمیوں کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے گا، ان میں ایک وہ مرد ہوگا جسے صاحب حسن وجمال خاندانی عورت نے برائی کی ترغیب دی اور وہ خدا کے خوف سے ڈر کے باز آیا۔

اللہ اللہ قیامت کی ہول ناک فضا میں جب کہ سارا میدان حشر نفسی نفسی پکار رہا ہوگا۔ اس بطل جلیل کے مراتب علیا کا کون اندازہ لگا سکتا ہے جس نے دنیا میں قد رعنا اور قامت دل ربا کی پر جوش دعوت نشاط کو ٹھکرا کر سایہ عرش اور آغوش رحمت کی بہاروں کو اپنے لیے مخصوص کر لیا۔ اور کیوں نہ ہو کہ آج اس نے محض خدا سے خوف کھا کر گھنی زلفوں کی چھاؤں سے منہ موڑا تو کل اسے سایہ رحمت اور دامن عرش میں پناہ ملی۔

حدیث زیر عنوان کا وہ حصہ جس کی تشریح پیش کی جا رہی ہے اس میں بھی ایک ایسے ہی

پاک باز انسان کی داستان حیات بیان ہوئی ہے جو معصیت کی غلاظتوں میں آلودہ ہوتے ہوتے بچا۔ اور یک بیک تقدس اور طہارت کی بلندیوں تک پہونچ گیا، وہ ایک ایسا انسان تھا جسے اپنی پری جمال چچازاد بہن سے عشق تھا۔ مدتوں عشق کی آگ میں پھنکتا اور جدائی کے عذاب میں گھٹتا رہا۔ ہجر کی طویل راتیں اور جدائی کے المناک ایام سالہا سال اس پر قہر کے پہاڑ توڑتے رہے۔ لاکھ عرض والتجا کی اور ہزار نیازمندی کے گوہر لٹائے مگر بے سود، اس مجسمہ حسن وشباب نے ایک نہ سنا، تمکنت حسن اور غرور رعنائی میں نہیں۔ بلکہ خوف الٰہی اور خشیت ربانی کی وجہ سے۔

مایوسیاں اپنی انتہا کو پہونچ چکی تھیں کہ ایک مہیب قحط نے سارے قبیلے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اور فاقوں سے مجبور حسن اس کے قدموں میں اپنی زندگی کی بھیک مانگنے آیا۔ روٹی کے چند ٹکڑے یا سونے اور چاندی کے چند سکے۔ اس نے مجبوری سے فائدہ اٹھایا۔ اور جس کو ہزار التجا سے اپنا نہ سکا تھا۔ سکوں کے بدلے خریدنے کی پیش کش کی۔ بھوک کی آگ نے اسے اس درجہ مجبور کر دیا تھا کہ چار و ناچار تیار ہو گئی۔

اس نے ایک سو بیس اشرفیاں نذر کیں۔ اور ساغر وصال ہونٹ سے لگانا چاہا۔ جذبات کی آگ پورے شباب پر تھی اور جام لبوں تک آچکا تھا کہ عورت کی پاک روح کہہ اٹھی اور بے اختیار یہ جملے اس کی زبان پر آئے۔

لا احل لک ان تفض الخاتم الا بحقه.

تجھے خدا کا واسطہ قدرت کی لگائی ہوئی مہر کو ناحق مت توڑ۔

عالم اضطراب میں روح کی گہرائیوں سے نکلا ہوا یہ جملہ تازیانہ عبرت بن کر چمکا۔ اور نشہ شباب اور طوفان جذبات میں بے ہوش ایک انسان کو خواب غفلت سے بیدار کر گیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ خدا کا قہر وغضب مجسم ہو کر سامنے موجود ہے اور اس کی خوابیدہ سعادتوں کو جھنجھوڑ رہا ہے۔ اس نے اپنی مطلوبہ عورت پر ہر طرح قابو پا کر بھی اس کو چھوڑ دیا۔ بلکہ وہ اشرفیاں بھی اسی کو دے دیں۔

اخلاص و نیازمندی سے کیا ہوا اس کا یہ عمل (جسے وہ خود بھی اپنی زندگی کا شاہکار، عمل خیر

تصور کرتا تھا) بارگاہ الٰہی میں اس درجہ مقبول ہوا کہ ایک دفعہ سیلاب حوادث میں پھنس کر جب وہ موت وحیات کی کشمکش میں پڑا ہوا تڑپ رہا تھا۔ اور جیتے جی ایک غار میں دفن ہو گیا تھا۔ اس عمل خیر کو وسیلہ بنا کر اپنے رؤف ورحیم پروردگار کے دروازہ پر دستک دی۔ خدا نے اس کی فریادسنی اور اس گرداب وبلا سے اس کو نجات دی۔ اور تھوڑا پتھر اور کھسک گیا جس سے زندگی کی آس بندھی۔

حدیث مقدس کے اس حصہ سے بھی مندرجہ ذیل مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

(۱) موجودہ معاشرہ میں پردہ دار گھرانوں میں بھی نامحرم قریبی رشتہ داروں سے نامناسب خلاملا جاری رہتا ہے اس قسم کے غلط روابط سے ہمیشہ خراب نتائج ہی برآمد ہوتے ہیں۔

(۲) مرد وعورت کے غلط تعلقات میں بیشتر مرد ہی ورغلا کر عورت کو غلط راہ پر ڈالتا ہے

(۳) عفت وپاکدامنی جو عورت کا زیور ہے۔ حدیث شریف میں ذکر کی ہوئی عورت کا کردار اس کی اعلیٰ مثال ہے۔

(۴) نفس پرست اور غلط کار انسان کو درحقیقت اپنی ذات اور اپنی اغراض سے محبت ہوتی ہے۔ اپنے مفاد کے مقابلہ میں اسے اپنے محبوب کے نفع ونقصان کا بھی خیال نہیں رہتا۔

(۵) نفس پرست انسان ہمیشہ دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

(۶) نامساعد حالات میں بھی تلقین وہدایت خیر سے باز نہ آنا چاہیے، عین مایوسیوں میں اس کی غیر معمولی تاثیر کا ظہور ہوتا ہے۔

(۷) بقصد وارادہ گناہ کا ترک بھی عبادت، کار ثواب، اور توشۂ آخرت ہے۔

(۳)

اسلام میں سب سے پہلے جو حقوق ایک انسان پر عائد ہوتے ہیں، وہ اس قسم کے حقوق ہیں جو آدمی پر خدا کا بندہ اور اس کی مخلوق ہونے کے ناطے عائد ہوتے ہیں۔ اور جن کو اصطلاح شرع میں ''حقوق اللہ'' یا ''عبادات'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الجِنَّ وَالاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾ .[الذٰریٰت: ۵۶]

ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے ہی پیدا کیا ہے۔

ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کے مشاغل صرف عبادت ہی تو نہیں، لیکن اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ انسان پہلے خدا پرست ہے اس کے بعد کچھ اور۔

عبادت کے بعد دوسرے نمبر پر جو فرائض اور ذمہ داریاں انسان پر عائد ہوتی ہیں، وہ ایسے حقوق ہیں جو اسی کے جیسے دوسرے انسانوں سے خلقی یا کسبی روابط کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتے ہیں، اور جن کے لیے ایک عام اصطلاح معاملات کی ہے۔

معاملات اس درجہ کثیر اور تنوع کے ہیں کہ انسانوں کی پوری زندگی اس کی عملی تفسیر ہے، اور کون ہے جو اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے بالکل دامن بچا سکتا ہے، اور معاملات سے قطعاً پاک رہ سکتا ہے، لیکن اسلام اور دوسرے مذاہب میں یہ فرق ہے کہ اور مذاہب میں سارا زور انسان کی عبادتی زندگی پر دیا جاتا ہے، معاملات اور دیگر شعبہائے زندگی کا یا تو کوئی نظام ہی نہیں، یا نہایت نامکمل اور ناکافی ہے، اس کے برخلاف مذہب اسلام نے اپنے متبعین کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے، اس میں زندگی کے معاملات بعض بعض حیثیت سے عبادت سے بھی اہم ہیں (بلکہ معاملات خود عبادت کے زمرہ میں داخل ہیں۔)

مثلاً اللہ جل جلالہ اپنے حقوق کو چاہے تو اپنے کرم سے معاف کردے اور اس کا وعدہ بھی ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَن يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ [النساء:۴۸]

اللہ پاک اپنے ساتھ کیے گئے شرک کو ہرگز معاف نہیں کرے گا اور اس کے علاوہ ساری کوتاہیوں میں جس کو چاہے معاف کرے گا۔

لیکن حقوق العباد وہ ہرگز معاف نہیں کرے گا۔ تا آں کہ صاحب حق اس کو معاف نہ کرے، یا ظالم سے اس کی زیادتی کا قصاص لے لیا جائے۔

بخاری کی ایک حدیث ہے:

عن ابی ہریرة قال: قال رسول اللہ ﷺ: من کانت لہ مظلمة لاخیہ

من عرضه أو شي فليتحلله منه اليوم قبل أن لا يكون دينار و لا درهم إن كان له عمل صالح اخذ منه بقدر مظلمته، و إن لم يكن له حسنات أخذ من سيئات صاحبه فحمل عليه. [مشکوٰۃ شریف باب الظلم ۴۳۵]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی آپ نے فرمایا: آج جس آدمی کی اس کے بھائی پر کوئی زیادتی ہو، چاہے اس کی عزت آبرو سے متعلق ہو یا کسی اور چیز سے تو اس کو قیامت کے دن سے قبل ہی معاف کرا لے کہ وہاں دینار و درہم سے کام نہ چلے گا اس دن ظالم کا عمل صالح لے کر مظلوم کو دے دیا جائے گا، یا پھر مظلوم کی گناہیں ظالم پر لادی جائیں گی۔

اس طرح اسلام نے حقوق العباد پر نہایت اہم اور بنیادی زور دیا ہے۔ پھر حقوق العباد میں بھی کسب کے معاملے کو نہایت اہمیت دی ہے، چناں چہ قرآن عظیم نے کسب کی فضیلت اور دوسروں پر بوجھ بننے کی مذمت فرمائی:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً عَبْداً مَّمْلُوكاً لَّا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقاً حَسَناً فَهُوَ يُنفِقُ مِنْهُ سِرّاً وَجَهْراً هَلْ يَسْتَوُونَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ. وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَى مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَهُوَ عَلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ﴾. [سورۃ النحل: ۷۵، ۷۶]

اللہ نے ایک کہاوت بیان کی ایک بندہ ہے دوسرے کی ملک پر آپ کچھ مقدور نہیں رکھتا اور ایک وہ جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھی روزی عطا کی اور وہ اس میں سے خرچ کرتا ہے۔ چھپے اور ظاہر، کیا دونوں برابر ہو جائیں گے، خوبیاں اللہ کو ہیں بلکہ ان میں اکثر کو خبر نہیں، اللہ نے کہاوت بیان فرمائی، دو مرد ایک گونگا ہے جو کچھ کام نہیں کر سکتا اور وہ اپنے آقا پر بوجھ ہے، جدھر بھیجے کچھ بھلائی نہ لائے، کیا برابر ہو جائے گا یہ اور وہ جو انصاف کا حکم کرتا ہے اور وہ سیدھی راہ پر ہے۔

آیت کا سوق دوسرے مقصد کے لیے ہے۔ لیکن ضمناً یہ بات بالکل واضح کہ بوجھ بنانا غیر محمود اور دوسروں کا کفیل ہونا محمود اور پسندیدہ ہے جس سے کسب کی فضیلت کا ثبوت ظاہر ہے۔

مندرجہ ذیل آیت میں براہ راست کسب کا حکم اور اس کی طرف رغبت دلائی گئی ہے۔

﴿فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِن فَضْلِ اللَّهِ﴾

[الجمعۃ: ۱۰]

جب نماز پوری کر لی جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو۔

اس آیت مبارکہ سے اس امر کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ حقوق اللہ کے بعد کسب کا حکم ہے جو "حق العباد" ہے۔

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ﴾[الاعراف: ۱۰]

اور ہم نے تم پر کسب کی راہیں ہموار کیں تم میں بہت تھوڑے ہی شکر گزار ہیں۔

اور دوسری آیت میں کام اور آرام کی تقسیم کار اس طرح فرمائی گئی ہے:

﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً . وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشاً﴾[النبا: ۱۰، ۱۱]

ہم نے رات آرام کے لیے اور دن طلب معاش و کسب کے لیے بنایا۔

حضور پیغمبر اعظم ﷺ نے نہایت وضاحت سے کسب معاش کی فضیلت دوسروں پر بوجھ، دست سوال دراز کرنے کی قباحت بیان فرمائی:

"من طلب الدنيا حلالا استعفافا عن المسألة وسعياً على أهله وتعطفا على جاره بعثه الله يوم القيامة ووجهه كالقمر ليلة البدر."

[کنز العمال ۴/۱۲، حدیث: ۹۲۴۷]

جس نے دنیا جائز طریقہ سے کمائی تاکہ سوال کی ذلت سے بچے، اپنی اولاد کے لیے رزق حاصل کرے اور پڑوسیوں پر مہربانی کرے تو قیامت کے دن اس کا چہرہ چاند کی طرح روشن ہوگا۔

ایک دوسری حدیث مبارک میں ارشاد ہوا:

''إن الله يحب العبد المومن المتحرف.''

[کنز العمال ۴/۲، حدیث: ۹۱۹۹]

اللہ تعالیٰ محنت کش مومن کو پسند کرتا ہے۔

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا:

''أحل ما أكل الرجل من كسبه ''[مشکاۃ ۲۴۲، باب الکسب وطلب الحلال]

سب سے حلال روزی جو آدمی نے کھائی، وہ ہے جسے اپنے ہاتھ سے کمایا۔

ایک صوفی نے ایک دوسرے مرد کامل سے کہا: الحمد للہ کہ میں نے سارے ہی اعمال خیر کی توفیق پائی، حد یہ ہے کہ حج اور جہاد کا بھی موقع ملا تو انہوں نے فرمایا:

''اين انت من عمل الابدال؟ قال: وماهو؟ قال: كسب الحلال والنفقة على العيال.''[احیاء العلوم ج ۲/۳۳]

تم نے ابدال کا عمل تو کیا ہی نہیں، انہوں نے پوچھا وہ کیا ہے، تو فرمایا حلال کمائی جس کو اہل وعیال پر خرچ کیا جائے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو، جس طرح جسم کی صحت وتوانائی، نکھار اور خوبصورتی کے لیے صالح غذا اور لطیف آزوقے کی ضرورت ہے، ٹھیک اسی طرح اخلاق کی نظامت، روح کی بالیدگی اور باطنی توانائی کے لیے، ماحول کی طہارت، علائق کی ستھرائی، کے ساتھ ساتھ جزو بدن بننے والی غذا کا ظاہری سقم کے ساتھ باطنی خباثت سے بھی پاک ہونا ضروری ہے، کہ آدمی کے ظاہر اور ماحول کا اثر، اس کے خمیر، عقیدہ اور باطن پر پڑتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

''كل مولود يولد على الفطرة فأبواه يهودانه وينصرانه ويشركانه.''[کنز العمال ۱/۲۶۱، حدیث: ۱۳۰۷]

بچہ فطری سلامت روی اور فطرۃ اسلام پر پیدا ہوتا ہے لیکن اس کے ماں باپ (ماحول) اسکو یہودی نصرانی، مشرک بناتے ہیں۔

الغرض اسلام نے روح کی پاکیزگی اور طہارت کے لیے آدمی کے خود اپنے کسب اور اس کے حلال ہونے پر نہایت درجہ زور دیا ہے۔

ارشاد نبوی ہے:

"لایدخل الجنۃ لحم نبت من السحت، و کل لحم نبت من السحت کانت النار اولی بہ." [مشکاۃ/ ۲۴۲]

جو گوشت کا لوتھڑا حرام سے اگا وہ جنت میں نہیں جا سکتا۔ اور گوشت کا ہر وہ حصہ جو حرام سے بنا جہنم اس کے لیے زیادہ اچھی جگہ ہے۔

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہے پرواز میں کوتاہی

کسب اور آمدنی کے یوں تو متعدد ذرائع ہیں، مثلاً تحف، ہدایا، ترکہ و میراث، مال غنیمت اور رکاز و معدن، لیکن بنیادی ذرائع صرف تین ہیں، زراعت، تجارت، اجارہ۔

زراعت: اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا تعلق زمین سے ہے، اور جس کو نہایت عموم کے ساتھ اس حدیث مبارک میں بیان کیا گیا ہے۔

"ماأخرجت الارض ففیہ العشر"

[ھدایہ اولین/ ۱۸۱، باب زکاۃ الزروع والثمار]

زمین سے جو پیدا ہوا ہے اس میں دسواں حصہ زکوۃ کا ہے۔

چناں چہ ائمہ احناف رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شہد کی پیداوار کو بھی اسی عموم میں داخل فرما کر، اس میں عشر ثابت کیا ہے، زراعت وہ مبارک کسب اور پاک پیشہ ہے، جس کی ایک خوبی دیگر تمام ذرائع آمدنی پر میرے نزدیک فوقیت رکھتی ہے۔

اس اجمال کی تفصیل اس طرح ہے کہ، ایک شخص نے کسی دوسرے شخص سے کوئی چیز جائز ذریعہ سے حاصل کی، اور اس خاص چیز کے بارے میں یہ معلوم نہیں کہ وہ حرام ہے، اور دینے والے کی غالب آمدنی حلال ہے، تو اس سے لے لینے میں از روئے فتویٰ کوئی ممانعت نہیں

،اور اس تحقیق کی قطعاً ضرورت نہیں کہ خاص یہ مال حلال ہے یا نہیں، لیکن اصحاب تقویٰ واحتیاط اس سے بھی دو قدم آگے ہیں، اور وہ تحقیق کیے بغیر کہ یہ مال حلال ہے نہ خریدیں گے نہ استعمال کریں گے، بلکہ بعض اصفیا کے بارے میں امام شعرانی نے فرمایا کہ اگر دس واسطوں سے ہوتا ہوا بھی وہ مال ان کے پاس آتا تو وہ ہر ایک کے بارے میں تحقیق فرماتے کہ وہ پاک ذرائع سے حاصل ہے، اور جب سب کے بارے میں اطمینان ہو جاتا کہ حلال ہی ہے تو خریدتے اور استعمال میں لاتے۔

اب اس نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو تجارت یا اجارہ میں یہ تحقیق کتنی دقت طلب اور زہرہ گداز ہے، لیکن زراعت میں یہ خوبی ہے اگر کسی کے پاس حلال وطیب دو گز زمین ہے اور اس نے اس میں حلال بیج ہی ڈال دیا ہے تو اب پیداوار کے بارے میں کسی تحقیق وتفتیش کی ضرورت نہیں، وہ بے خرخشہ ہے اور ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے، کیوں کہ اس میں چند ہاتھوں کے واسطے کا سوال ہی نہیں ہے۔

تجارت اور اجارہ میں یہ فرق ہے کہ تجارت کے مال کے بدلہ میں مال کے لین دین کا نام ہے۔ مثلاً، گیہوں دے کر کپڑا لیا۔ یا گیہوں دے کر روپیہ اور پیسہ لیا۔ جب کہ اجارہ منافع کے بدلہ میں مال کے لین دین کا نام ہے، جیسے مزدور اپنے مالک کو کچھ مال تو نہیں دیتا ہے، بلکہ اپنی محنت جو اس کے جسم کا منافع ہے، اس کے بدلہ میں مزدوری لیتا ہے۔

تجارت نہایت وسیع الذیل اور کثیر الوقوع معاملہ ہے، بلکہ پوری نوع انسانی کے لیے ایک ناگزیر ضرورت ہے، شاید ہی دنیا میں کوئی آدمی ہو جسے زندگی میں کبھی خرید وفروخت کی حاجت پیش نہ آئی ہو، اور اسی وجہ سے اس میں بے شمار کوتاہیوں اور خرابیوں کا دغدغہ ہر دم رہتا ہے جس کے پیش نظر حدیث نبوی میں بازار کو بدترین خطہ ارض قرار دیا گیا ہے۔

عن ابی هریرة قال: قال رسول الله ﷺ: أحب البلاد إلى الله مساجدها، وأبغض البلاد إلى الله أسواقها. [مشکوۃ شریف ص ۶۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ

زمین کے سارے خطوں میں مسجد خدا کا پسندیدہ خطہ ہے، اور ناپسندترین علاقہ بازار ہے۔
لیکن اس آلودگی کے ماحول میں بھی رہ کر جو شخص صداقت وایمان کا دامن نہ چھوڑے، اور اسلام کے قوانین کے دائرے میں رہ کر تجارت کرے اس کے لیے ارشاد ہے۔

التاجر الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین والشھداء.

[مشکوۃ شریف ص ۲۴۳]

جو تاجر سچا اور امانت دار ہو وہ نبیوں، صدیقوں، اور شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔

یہاں ایک عام غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے، جو تجارت کا اصل مقصد منافع خوری اور حصول زر نہیں ہے، اسلام میں تجارت کا مقصد نہایت اعلیٰ وارفع ہے، منافع تو ضمنی چیز ہے، اصل مقصد تو خدمت اور بنی نوع انسان کی معاشی آسانی پیدا کرنا ہے، اس لیے منافع ضمنی فائدہ کے طور پر تو حاصل کیا جاسکتا ہے، مقصد اور مدعا بنا کر نہیں۔

ہمارے اس دعویٰ کی تفصیل یہ ہے کہ یوں تو ہر وہ چیز جو آدمی کی ثروت اور تمول کا ذریعہ بنے مال ہے، لیکن مال کی یہ بنیادی تقسیم شاید نہایت عالمگیر ہے کہ سونا اور چاندی اصلاً قیمت اور دیگر تمام اشیا کی قیمت کا معیار قرار دی گئی ہیں اور بقیہ تمام اشیا سودا اور مبیع مانی گئی ہیں، مال کی اس تقسیم کے پیش نظر لین دین کی مندرجہ ذیل صورتیں متحقق ہوتی ہیں:

(۱) اشیائے صرف (سودے) کو قیمت (سونا چاندی) کے بدلہ میں بیچا جائے۔

(۲) اشیائے صرف کو دوسری اشیائے صرف کے بدلہ میں ہی بیچا جائے مگر جنس بدل کر، مثلاً گیہوں کے بدلہ میں کپڑا۔

(۳) اشیائے صرف کو اسی کی ہم جنس اشیائے صرف کے بدلے میں بیچا جائے جیسے گیہوں کے بدلہ میں گیہوں یا کپڑے کے بدلہ میں کپڑا۔

(۴) قیمت کو قیمت کے بدلہ میں جو ہم جنس ہوں، جیسے سونے کو سونے کو بدلہ میں یا چاندی کو چاندی کے بدلے میں۔

ان چاروں صورتوں میں اصل بیع جو انسان کے فطری تقاضے اور طبعی ضرورت کے نتیجے

میں وجود پذیر ہوئی ہے، دوسری مشکل ہے، اور پہلی صورت اسی کی مزید تکمیل اور تتمیم ہے،
صدرالشریعہ حضرت مولانا امجد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "بہار شریعت"
میں ارشاد فرماتے ہیں:

(اللہ تعالیٰ) نے انسان کو مدنی الطبع بنایا، کہ زندگی بسر کرنے میں یہ اپنے بنی نوع کا محتاج ہے، کیوں کہ انسانی ضروریات اتنی زائد اوران کی تحصیل میں اتنی دشواریاں ہیں کہ ہر شخص اگر اپنی تمام ضروریات کا تنہا متکفل ہونا چاہے، تو غالباً عاجز ہو کر بیٹھ رہے، اس حکیم مطلق نے انسانی جماعت کو مختلف شعبوں اور متعدد قسموں پر منقسم فرمایا، کہ ہر ایک ایک ایک کام انجام دے۔ مجموعہ سے ضروریات پوری ہوں، مثلاً کوئی کھیتی کرتا ہے، کوئی کپڑا بنتا ہے، کوئی دوسری دست کاری کرتا ہے جس طرح کھیتی کرنے والوں کو کپڑے کی ضرورت ہے، کپڑا بننے والوں کو غلہ کی حاجت ہے، لہذا یہ ضرورت پیدا ہوئی کہ اس کی چیز اس کے پاس جائے اور اس کی اس کے پاس تاکہ سب کی حاجتیں پوری ہوں، اور کاموں میں دشواریاں پیدا نہ ہوں، یہاں سے تبادلے کا سلسلہ شروع ہوا، اور بیع وغیرہ ہر قسم کے معاملات وجود میں آئے۔ [بہار شریعت حصہ ۱۱ر صفحہ۲]

اس بیان سے معلوم ہوا کہ تجارت اور بیع وغیرہ معاملات اس ضرورت کے ماتحت وجود میں آئے کہ انسانوں کو باہم تبادلے کی ضرورت تھی، اور ہماری ذکر کی ہوئی اقسام بیع میں صرف پہلی اور دوسری صورت ہی اس ضرورت کی کفیل ہے، بقیہ دو صورتیں یعنی گیہوں والے کو گیہوں سے بدلنے اور کپڑے والے کو کپڑے سے تبادلہ کی کیا ضرورت، اسی طرح سونے والے کو سونے اور چاندی والے کو چاندی کی کیا حاجت ہے؟۔

مطلب یہ ہے کہ ضرورت انسانی کے تقاضے میں تبادلہ (بیع) کی جو صورت وجود میں آئی، وہ مختلف اجناس کا تبادلہ ہے، ہم جنس ان کے ہم جنس چاہے قیمتیں ہوں چاہے اشیاے صرف، ہم جنس چیزوں کا تبادلہ تو وہی کرے گا، جسے ضرورت پوری کرنی نہ ہو کسی قسم کا منافع ہو، مثلاً خراب گیہوں دے کہ اچھا لیا، یا کم دے کر زیادہ لیا، وغیرہ وغیرہ۔

پس ہماری ذکر کردہ اقسام چہارگانہ میں پہلی دو تو ضرورت کے ماتحت ہوئیں اور بعد

والی دو منافع کی خاطر۔

اس پوری تفصیل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اسلام کے مزاج اور تجارت سے اس کی کون سی غرض مطلوب ہے، اس کا اندازہ کرنے کے لیے ایک حدیث ملاحظہ کیجیے:

عن ابی سعید الخدری قال: قال رسول الله ﷺ: الذهب بالذهب، والفضة بالفضة، والبر بالبر، والشعیر بالشعیر، والتمر بالتمر، والملح بالملح، مثلاً بمثل یداً بیدٍ فمن زاد أوا ستزاد فقد اربیٰ، الآخذو المعطی فیه سواء. [مشکوۃ شریف ص ۲۴۴]

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کی آپ نے فرمایا: کہ سونا سونے کے بدلہ میں، چاندی چاندی کے بدلہ میں، گیہوں گیہوں کے بدلہ میں، جو جو کے بدلہ میں، اور چھوہارے چھوہارے کے بدلہ میں، نمک نمک کے بدلہ میں برابر برابر ہونا چاہیے، اور ایک ہاتھ لینا تو دوسرے ہاتھ دینا چاہیے، جو کمی بیشی کرے یا کرائے، سب سودی کاروبار کرنے والے ہیں لینے دینے والے دونوں برابر مجرم ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ہم جنس اشیا کی بیع چوں کہ تبادلہ کے طبعی تقاضے کے خلاف اور تکمیل ضرورت سے ہٹ کر خالص منافع کی غرض پوری کرنی ہے جسے پیغمبر اسلام نے اس کی قطعاً اجازت نہیں دی، اور خالص حرام قرار دیا۔

اللہ اکبر یہ کتنی عبرت ناک حقیقت ہے کہ آج کل کے لیڈر حضرات جن کا سارا زور بیان منافع خوری کے خلاف صرف ہوتا ہے۔ جب ان کی باری آتی ہے تو سود خوری کا کاروبار سرکاری سطح پر کرتے ہیں، حکومت کی پشت پناہی میں کرتے ہیں، اور پیغمبر اسلام ﷺ نے ضمناً منافع کی اجازت دی، ان بنیادوں کو ہی جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں، جہاں سے غلط منافع خوری کے جراثیم پیدا ہوں۔

اجارہ: جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں، منافع اور مال کے تبادلہ کا نام اجارہ ہے، خود اپنی ذات کے منافع کو بھی آدمی اجارہ کہہ سکتا ہے اور دیگر تمام اشیا مملوکہ کے منافع کو بھی، آج کل

مزدوری، ٹھیکہ، کرایہ اور نوکری کے نام سے جو معاملات ہوتے ہیں سب "اجارہ" میں داخل ہیں۔

ایک آدمی کی محنت کا معاوضہ سونے اور چاندی کی صورت میں مقرر کرنا ایک غیر منطقی بات ہے۔

- والقیاس یابیٰ جوازہ لان المعقود علیه المنفعة وهی معدومة، واضافة التملیک الیٰ ما سیوجد لایصح الا اناجوزناه لحاجة الناس الیه.

[ہدایہ اخیرین:۲۹۳]

عقل انسانی کی رو سے اجارہ کو جائز نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ جس پر معاملہ طے ہو رہا ہے، وہ محنت ہے یا منافع کہ بعد میں پایا جائے گا، پس ایک معدوم شئ کا بھی کسی کو معاملہ کر کے مالک کیسے بنایا جاسکتا ہے لیکن آدمی کی ضرورت کی وجہ سے اس کو جائز قرار دیا گیا۔

لیکن انسانوں کے تعامل، اور بنی نوع انسان کی ناگزیر ضرورتوں نے اس کو ایک معقول اور بالکل روزمرہ کی چیز بنا دیا، کیوں کہ تجارت مال و زراعت کے لیے زمین تو معدود اور محدود آدمیوں کے پاس ہی ہوسکتی ہے، اور ضروریات تو ہر انسان کی زندگی کا جز ہیں، اس لیے ایسے مجبور انسان جو نہ زمین رکھتے ہوں، نہ مال، انہیں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے اس کے علاوہ اور کیا سبیل ہے کہ وہ اپنی محنت یا ذات واملاک کا منافع ہی داؤں پر لگادیں اور اسی کے بدلہ میں اپنی ضروریات پوری کریں۔

"بے سرمایہ کاروبار" اجارہ کی ایک ایسی خوبی ہے، جس نے اس کو تجارت اور زراعت پر بھی جزوی فوقیت دی ہے۔

قرآن عظیم کی آیات مبارکہ مذکورہ سورۃ القصص سے "اجارہ" کی مشروعیت اس کی خصوصیات، اور متعلقات پر مفید روشنی پڑتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے ایک مصری انسان کی موت واقع ہوگئی، ہر چند کہ آپ کا یہ فعل غیر اختیاری تھا، لیکن فرعون کے جبر واستبداد کے نتیجہ میں حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے مصر سے ہجرت فرمائی، اور بالکل بے سروسامانی کے عالم میں ایک انجان آبادی
وشہر میں پہونچ گئے، آپ پر مسافرت، تنہائی اور بے زادو راحلہ ہونے کی کیفیت طاری تھی، یکہ
وتنہا پانی کے ایک چشمہ پر بیٹھے ہوئے تھے، گھاٹ پر لوگوں کا ازدحام تھا، انہیں کی طرح بھیڑ سے
الگ تھلگ دو اور لڑکیاں بھی اپنی بکریاں لیے ہوئے کسی انتظار میں کھڑی تھیں، آپ نے ان سے
دریافت فرمایا: کس بات کا انتظار ہے، کہنے لگیں ہمارا باپ بوڑھا اور ہم کمزور ہیں۔ جب تک
سارے گاؤں کے جانور آسودہ نہ ہو جائیں ہم اپنے جانوروں کو پانی نہیں پلا سکتے، آپ نے ایک
دوسرے چشمہ سے جس کے دہانہ پر بھاری پتھر ڈھکا ہوا تھا، ہٹا کر لڑکیوں کے جانوروں کو پانی
پلادیا۔ لڑکیاں جلد ہی گھر لوٹ گئیں، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک ببول کے سائے میں جا
بیٹھے، ان کی حالت تھی قرآن کے الفاظ سنیے:

﴿فَقَالَ رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ﴾. [القصص: ۲۴]

اے میرے رب میں اس کھانے کا جو تو میری طرف اتارے محتاج ہوں۔

نہ رہنے کا ٹھکانہ، ن رشتہ داروں یا ملاقاتیوں کا دور دور پتہ، حد یہ کہ ایک وقت کے
کھانے کا بھی کوئی انتظام نہیں۔

لیکن قدرت جو سب کی نگہبان ہے، اپنے مقدس پیغمبر کو اس عالم میں بے سہارا کس
طرح چھوڑتی، اس نے پہلے سے ہی اس کا انتظام کر رکھا تھا، لوٹنے والی لڑکیوں سے باپ نے
جلد واپس آنے کا سبب پوچھا، انہوں نے اس اجنبی جوان کا حال بتایا، بوڑھے باپ نے ایک
لڑکی کو بھیج کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بلا بھیجا، آپ تشریف لائے اپنی سرگزشت سنائی، تو انہوں
نے تعارف کرایا میں بھی اللہ کا نبی شعیب ہوں، اب آپ خوف وہراس اور ظلم کی حکومت سے
امن میں آگئے، اس بیچ میں ایک لڑکی نے صورت حال سے آگاہ ہو کر مشورہ دیا۔

﴿قَالَتْ إِحْدَاهُمَا يَا أَبَتِ اسْتَأْجِرْهُ إِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ
الْأَمِينُ﴾. [قصص: ۲۶]

اے باپ آپ ان کو نوکر رکھ لیں بہتر نوکر وہ ہے جو طاقت ور اور امانت دار ہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام کو یہ رائے پسند آئی اور آپ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے معاملہ طے کر لیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرانی تھیں، جس کے معاوضہ (اجرت) میں ان کو قیام وطعام اور نکاح کی سہولت دی گئی تھی۔

حدیث مبارک میں ہے:

ان موسیٰ علیہ السلام آجر نفسه ثماني سنين او عشراً على عفة فرجه، و طعام بطنه. [کنز العمال ۴/۵، حدیث: ۹۲۰۱]

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کو نوکری پر رکھا ۱۰ یا ۸ سال کے لیے شرم گاہ کی پاکی اور کھانے کے معاوضہ میں۔

اس تفصیل سے سب سے پہلے تو اجارہ کی مشروعیت پر روشنی پڑی کہ یہ اتنا مبارک کسب ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام نے اسے شرف بخشا، دوسرے یہ کہ اجارہ انسان کی ناگزیر فطری حاجت ہے، تیسرے یہ کہ اجارہ میں کام کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے مزدور کی ضروریات کا پورا کرنا اجارہ کا اہم ترین مقصد ہے۔

اور یہ امر بھی واضح ہو گیا کہ اسلام نے بھی اجارہ کی ضرورت کے پیش نظر اس کو باقی رکھا، بلکہ اس کا حکم دیا، ہاں اس میں کچھ مفید اصلاحیں ضرور کر دیں، جن میں بعض بنیادی اور بعض اخلاقی ہیں، اور ایک مسلمان کی شان یہ قرار دی کہ دونوں ہی قسم کی ہدایتوں پر مکمل عمل کرے۔

ذیل میں ہم ان کا ایک نامکمل خاکہ پیش کرتے ہیں:

(۱) اجارہ میں کام اور معاوضہ اس طرح صاف صاف بیان ہونا چاہیے کہ منازعت کا امکان نہ رہے۔

حدیث شریف میں ہے:

من استاجر اجيراً فليعلمه اجره. [ہدایہ آخرین ص ۲۹۳]

جو کسی کو مزدوری پر رکھے تو اس کی اجرت صاف صاف بیان کر دے۔

اجرت کی تفصیل کی مثال: اجرت نقد ہو تو روپیہ، پیسہ یا اشرفی وغیرہ کی تفصیل۔ ناپ

اور تول کی ہو تو مقدار اور اس کے اوصاف، مثلاً ۴ من گیہوں۔ کپڑا سامان وغیرہ ہو تو ادائیگی کی مدت مقدار اور کیفیت، جانور ہو تو اس کی تعیین ضروری ہے۔ (شامی)

منافع کی مثال: گھر اور کھیتی ہو تو مدت اور وقت کا بیان ضروری ہے، اسی طرح عمل کا بیان کرنا ضروری، مثلاً کپڑا سینا ہے وغیرہ، الغرض ایسا صاف بیان ہو کہ بعد میں کوئی جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو، مثلاً سواری کرایہ پر لی تو وقت اجارہ یا کہاں تک جانا ہے۔ دونوں میں سے ایک کا بتانا ضروری ہے۔ (شامی)

(۲) جس چیز (منافع) پر اجارہ ہو وہ اس قسم معصیت یا عبادت (فرض واجب) نہ ہو، جیسے شراب کشید کرنے، بیچنے وغیرہ کی مزدوری۔ آج کل سینما دکھانے کا معاوضہ۔ اور عبادت جیسے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا اجارہ۔ یا آج کل پیسہ دے کر قرآن خوانی کرا کے اپنے مردہ کو ایصال ثواب کرواتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ حدیث شریف میں ہے:

اقروأ القرآن ولاتاكلوا به. [ہدایہ آخرین باب الاجارۃ الفاسدۃ ۳/۳۰۳]

قرآن پڑھو اور پڑھنے کا معاوضہ نہ وصول کرو۔

عهد رسول الله ﷺ الى عثمان بن ابي العاص ان اتخذت مؤذنا فلاتاخذ على الاذان اجراً أيضاً.

حضور ﷺ نے عثمان بن ابی العاص سے عہد لیا کہ اذان دینے کی اجرت نہ لینا۔

(۳) جس منافع پر اجارہ ہو اسی کے کسی جز کو اجرت نہ مقرر کیا جائے، جیسے سوت دیا کہ کپڑا بن دو اسی میں سے تمہاری مزدوری دینی ہوگی۔ آٹا پیسنے کو دیا کہ پیس دو اور اسی میں سے تمہاری مزدوری ہوگی۔

حدیث شریف میں ہے:

نهى النبى ﷺ عن عسب الفحل وعن قفيز الطحان.

[السنن الکبریٰ ۵/۳۳۹]

رسول اللہ ﷺ نے نر کے جوڑا کھانے کی اجرت اور پیسنے والی کی اس میں سے اجرت

لینے سے منع فرمایا۔

(۴) اجارہ منافع پر جو عین کا استہلاک نہ ہو، جیسے بکری کرایہ پر لی کہ اس کا دودھ حاصل کریں گے، درخت اجارہ پر لیا کہ اس کا پھل کھائیں گے وغیرہ وغیرہ۔

یہ چار دفعات ہم نے مثال کے طور پر ذکر کی ہیں، سب کا احصا مقصود نہیں ہے، اب ہر ایک کی ہم کچھ تفصیل کرتے ہیں۔

اجرت کی تعیین: اسلام میں اس شخص کو جو بیک وقت بہت سے لوگوں کا کام کرتا ہے، اجیر مشترک کہتے، جیسے درزی وغیرہ۔ جو شخص اوقات اجرت میں کسی ایک شخص کا پابند ہو۔ اور اس دوران کسی دوسرے کا کام نہ کرے اس کو ''اجیر خاص'' کہتے ہیں۔ جس کی تشبیہ ملازمت اور نوکری سے دی جاسکتی ہے۔

آج کل ''اجیر خاص'' کے سلسلہ میں یہ مسئلہ بڑی شدت سے اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ اجرت اور مزدوری کا معیار کیا ہو جانا چاہیے، کیوں کہ مالکوں کے استحصال اور مزدوروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کی عادت نے دنیا کے تمام محنت کشوں میں ایک عام بے چینی پیدا کر دی ہے، لیکن اسلام نے جس معاشرے کے لیے یہ دفعہ وضع کی ہے، وہاں اس قسم کے استحصال کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اصل مقصد تو یہ ہے کہ ''معاشرے کی اصلاح جو اصل علاج ہے'' اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دیتا، اور سرمایہ داروں کو فنا کرنے کے لیے فلسفہ گڑھتے ہیں، حالاں کہ سرمایہ دار ختم بھی ہو جائیں، تو جب تک معاشرہ صالح نہ ہوگا، استحصال جاری رہے گا۔ بقول اقبال:

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا طریق کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی
حلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

پیغمبر اسلام ﷺ نے مزدوروں کو اپنی بارگاہ سے یہ حق بخشا۔

''قال الله تعالیٰ: ثلثة انا خصمهم يوم القيمة، رجل اعطیٰ بی ثم غدر ورجل باع حراً فاكل ثمنه، ورجل استاجر اجيرا فاستوفى منه ولم يعطيه اجره.

[مشکوۃ شریف ص ۲۵۸]

اللہ تعالیٰ نے فرمایا قیامت کے دین تین آدمیوں کی طرف سے میں خود مدعی ہوں گا۔ جس نے میرے نام سے کسی سے وعدہ کیا پھر پلٹ گیا، اور جس نے کسی آزاد کو بیچ کر اس کا دام لیا، اور جس نے مزدور کا کام پورا لیا اور اس کی مزدوری نہ دی۔

ایک دوسری جگہ آپ نے محنت کشوں کے بارے میں یہ تاکید فرمائی۔

اعطوا الأجير اجره قبل ان يجف عرقه . [مشکوۃ شریف ص ۲۵۸]

مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو۔

آپ کے ماننے والے فیض صحبت سے اس درجہ نکھر گئے تھے کہ دنیا کے معاملات میں ہر قسم کے استحصال کو حرام سمجھتے تھے۔

ایک صحابی رسول اللہ ﷺ کے غلام نے آکر کہا: یہ گھوڑا ۳۰۰ درم میں طے ہو گیا ہے۔ آپ قیمت ادا کر دیں تو اس پر قبضہ کر لیا جائے، آپ نے گھوڑے کو دیکھ کر مالک سے کہا یہ تو ۴۰۰ کا بھی سستا ہے، اس نے کہا پھر ۴۰۰ سو ہی دے دیں، آپ نے فرمایا: یہ تو ۵۰۰ کا بھی سستا ہے، اسی طرح اضافہ کرتے کرتے ۹۰۰ تک کیا، پھر ۹۰۰ درم دے کر گھوڑا لے لیا۔

بائع کے چلے جانے کے بعد لوگوں نے ملامت کیا تو آپ رونے لگے، اور فرمایا: مجھ سے پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: کہ من غشنا فليس منا، ہم سے کسی کو جو شخص دھوکہ دے وہ مسلمان، میں سے نہیں، ۹۰۰ کا مال تین سو میں خریدنا مجھے دھوکہ ہی نظر آیا، اس لیے میں نے اس کو واجبی قیمت ادا کی۔ (نووی شرح مسلم)

سوال یہ ہے کہ کیا ایسے معاشرے میں کسی قسم کے استحصال یا مجبوری اور لاعلمی سے فائدہ اٹھانے کا امکان ہے؟ ہرگز نہیں، ہاں آج کے بگڑے ہوئے معاشرے کے پاس نظر اسلامی مقننہ کو بلاشبہ ایسے حدود متعین کرنے کا حق حاصل ہوگا، جس میں کام کی نوعیت اور مزدور کی ضرورت اس کی قرار واقعی رعایت کی گئی ہو۔

منافع اور کام کی تعین: اجرت کی طرح سے اس کے حدود بھی متعین ہونے ضروری ہیں، کیوں کہ اگر ایک طرف مالکوں کی طرف سے استحصال کی شکایت ہے تو دوسری طرف سے

مزدوروں کا بھی حال یہ ہے کہ، بھتہ اتنا چاہیے، فیسلٹی یہ دینی ہوگی، تنخواہ میں اضافہ ہو، بند گھراؤ اور گھڑی گھڑی ہڑتال، لیکن محنت کتنی کرنی چاہیے، پروڈکشن کیسی ہونی چاہیے، آفس ورک کی نوعیت کیا ہو، اس پر پردہ ڈال دیں تو اچھا، حالاں کہ حقوق کی مکمل ادائیگی کو اسلام میں عبادت قرار دیا گیا ہے۔

حدیث شریف میں ہے۔

(ثلث لهم اجر ان رجل يتأدى حق الله وحق مو لاه.)

تین آدمیوں کو ہر عبادت کا دوہرا ثواب ملے گا، ان تینوں میں سے ایک وہ شخص جس نے اپنے خدا کا بھی حق ادا کیا اور مالک کا بھی۔

معصیت کا اجارہ: ہم پہلے وضاحت کرآئے ہیں کہ اسلام نے کسب طیب اور رزق حلال کو بنیادی اہمیت دی ہے، روح کی طہارت جسم کی تقویت کے لیے معاصی سے پرہیزاو رخدا کی نافرمانی سے اجتناب ضروری قرار دیا ہے، حد یہ ہے کہ جو حرام کی پرواہ نہ کرے اس کی دعا مقبول نہیں۔

ارشاد نبوی ہے:(الرجل يطيل السفر اشعث أغبر يمديديه الىٰ السماء يارب يارب ومطعمه حرام ومشربه حرام وملبسه حرام وغذى بالحرام فأنىٰ يستجاب .) [مشکوۃ شریف ص ۲۴۱]

ایک آدمی لمبے سفر پر ہو پراگندہ سر غبار آلود آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا پھیلا کر یارب یارب پکارتا ہو، لیکن اس کا کھانا پینا حرام، لباس حرام، اسے حرام کی غذا دی گئی، تو ایسے کی دعا کہاں قبول ہوگی۔

اسلام میں آدمی کا خود گناہ کرنا ایک طرف رہا، کسی گناہ گار کی اعانت بھی ممنوع ہے۔

ارشاد الٰہی ہے:﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ [المائدة: ۲]

نیکی اور پرہیز گاری پر ایک دوسرے کی مدد کرو گناہ اور نافرمانی پر مدد نہ کرو۔

پس جو کام اسلام میں بے معاوضہ حرام ہو، معاوضہ لے کر کرنے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے، ہم نے شراب اور سینما کی مثالیں دی ہیں ورنہ آج کل ہمارے ارد گرد اس قسم کے بے شمار گناہوں کا جال پھیلا ہوا ہے، جس میں عام مسلمان سر سے پیر تک غرق ہیں، بھلا جو کام اپنے لیے کرنا حرام ہو دوسرے کے لیے کرنا کس طرح جائز ہوگا۔

اجارۂ عبادت: عبادت خدا اور بندے کے درمیان کا معاملہ ہے، اس کے بارے میں یہی گارنٹی نہیں کہ اس کا ثواب اسے ضرور ملے تو کسی دوسرے کے ہاتھ اس کا بیچنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے، اسی لیے علما نے ایصال ثواب کے لیے نوکر رکھ کر قرآن پڑھوانے کو منع کیا ہے۔

قفیز طحان: جس امر کے لیے اجارہ کیا، حاصل ہونے والے منافع میں سے ہی مزدوری ادا کرنے کی ممانعت ایک منطقی نتیجہ ہے۔ جو کی اسلامی نوعیت کا، کیوں کہ اجارہ نام تبادلہ کا ہے، اور جب اجیر کی محنت کے حاصل شدہ منافع کے کسی جز کو ہی اس کے محنت کا معاوضہ مقرر کیا، تو تبادلہ کیا ہوا، تو اسی استحصال کی ایک معمولی صورت ہوئی جس کا دروازہ اسلام نے یکسر بند کر دیا ہے۔

ہدایہ اخیرین ۲۸۹ میں ہے: والمعنی فیه ان المستاجر عاجز من تسلیم الاجر وهو بعض المتسوج او المحمول وحصوله بفعل الاجیر فلایعد قادراً بقدرة غیره .

اس صورت کے حرام ہونے کا سبب یہ ہے کہ مالک نے جس چیز کو مزدوری مقرر کیا ہے وہ تو خود مزدور کی محنت سے حاصل ہوگا۔ تو یہ اس کی ادائیگی پر قادر کیسے ہوگا۔

اس قسم کی علت چوتھی دفعہ کی بھی ہے، نیز اکثر ان صورتوں میں دھوکہ دہی اور اختلاف ولڑائی کی نوبت بھی آجاتی ہے، اس لیے شریعت نے ہر ایسے طریقہ پر روک لگا دی جس میں کسی قسم کی خرابی تھی۔

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ ظاہر ہو گیا ہوگا کہ اسلام نے معاملات بالخصوص اجارہ میں کس طرح باریک بینی سے کام لیا ہے۔ اور اسے روح کی طہارت نیز معاملات کی اصلاح اور انسان کی فطری ضرورتوں کے انصرام کا کتنا اعلیٰ اور مکمل انتظام کیا ہے۔

مگر کون ہے جو آج ان اسلامی ہدایات پر کان دھرے، عام مسلمانوں کا حال تو یہ ہے کہ کچھ معاشرتی مسائل اور کچھ مسائل دینیہ میں اسلام سے لگاؤ ہے بقیہ معاملات تو الا ماشاءاللہ یکسر غیر اسلامی ہو رہے ہیں، حالاں کہ حکم ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾[البقرة:۲۰۸]

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

حدیث مبارکہ زیب عنوان (حدیث غار) کے آخری ٹکڑے میں ایک نہایت ہی پاک وصاف اجارے کا ذکر ہے، جس میں اسلام کے اعلیٰ اصولوں کا نور فروزاں ہے۔ اور اسلامی رواداری، اخلاص وایمان کی بھر پور چاشنی پائی جاتی ہے۔

ہوا یہ کہ کسی اگلی امت میں ایک شخص نے بہت سے لوگوں کو اجارے پر رکھا، سارے مزدور اپنی اپنی مزدوری لے گئے، لیکن ایک مزدور نے اپنی اجرت اسی کے پاس چھوڑ دی، اس بندۂ خدا نے اس کی مزدوری کو تجارت میں لگا دیا، اور نیت خیر کی برکت سے اس میں اضافہ شروع ہوا تو عالم یہ ہوا کہ مویشیوں سے وادیاں بھر گئیں، اور مال سے خزانے، بہت دنوں کے بعد وہ مزدور لوٹ کر آیا اور اپنی اجرت کا طلب گار ہوا اس نے کہا یہ ساری بہاریں تمہاری ہی ہیں، یہ سارے اونٹ بھی لے لو، اور تمام گائیں بھی اور یہ سب کی سب بکریاں بھی تمہاری اور یہ تمام غلام بھی۔ مزدور حیرت زدہ ہو کر دیکھنے لگا کہ شاید یہ مجھ سے مذاق کر رہا ہے اور اس کا اظہار بھی کیا، تو مالک نے پوری نوعیت سمجھائی کہ یہ تمہاری مزدوری اور میری دیانت واخلاص کا ثمرہ ہے، اور بخوشی وہ سارا سرمایہ مزدور کے حوالہ کر دیا۔

مقام غور یہ ہے کہ مذکورہ بالا واقعہ میں مالک نے مزدور کو اجرت دے کر قبضہ دلایا تھا، اور اس نے اپنی طرف سے اس کو مالک کے پاس امانت رکھا تھا، یا مزدور نے مزدوری لی ہی نہیں یوں ہی چھوڑ کر چلا گیا؟۔

پہلی صورت میں تو وہ پیسہ ضرور مزدور کا تھا اور مالک اس کا امین تھا، دوسری صورت میں اتنا پیسہ مالک کے ذمہ قرض تھا، مالک کہیں سے بھی ادا کرتا لیکن مالک کے پاس جو مال تھا اس

میں کوئی متعین حصہ مزدور کا نہ تھا، پہلی صورت میں اس مال میں تصرف کرنا اس کا ہلاک کرنا تھا، جس کا شرعی حکم یہ ہے کہ مالک اس روپیہ کا تاوان ادا کرے، لیکن اس سے جو منافع ہوا اصولاً مالک ہی کی ملک ہوا اور دوسری صورت میں بھی چوں کہ وہ پیسہ مالک کا ہی تھا، مزدور کا نہیں تھا ، ہاں مالک کی نیت البتہ تھی کہ یہ مزدور کی اجرت ہے جو بڑھوتری ہوئی وہ مالک کی ہی تھی، لیکن اس کو مالک کا انتہائی تقویٰ کہیے، یا احسان اور تبرع کہ اس نے وہ سارا سرمایہ جس کا مزدور کو قانوناً مطالبہ کا کوئی حق نہ تھا نہ واقعۃً ہی وہ اس کا طالب تھا، مزدور کو زبردستی دے دیا کہ یہ چوں کہ تمہاری طرف منسوب کی ہوئی رقم کی بڑھوتری ہے، اس لیے تم کو ہی لینا پڑے گا، اور یہ چیز تقویٰ اور اخلاق حسنہ کی معراج ہے، حدیث مبارک سے مندرجہ ذیل امور کا اشارہ ملا۔

(۱) اجارہ کی شریعت اسلامیہ میں بھی اجازت ہے، کیوں کہ گزشتہ شریعت کی کوئی بات قرآن وحدیث میں مذکور ہو اور اس کی ممانعت محمدی شریعت میں نہ کی گئی ہو تو وہ ہمارے لیے بھی حکم شرعی ہے اور یہاں تو یہ معاملہ بطور تعریف مذکور ہوا ہے۔

(۲) حسب فرمان نبوت الدین ھو النصح لکل مسلم. اسلام اپنے پورے دینی بھائی کی خیر خواہی کا نام ہے، اور یہاں تو یہ مزید خوبی ہے کہ اقتصادی خیر خواہی پس پشت کی گئی ہے۔

(۳) تقویٰ اور احسان اعلیٰ ترین خصائل انسانی میں سے ہیں۔

(۴) نیکیاں بقائے ذکر جمیل کا سبب ہوتی ہیں۔

(۵) اصلاح کی نیت سے کسی کے مال میں تصرف کرنا امانت داری کے خلاف نہیں۔

(۶) فضولی کے تصرفات نافذ ہیں اگر اصیل بعد میں راضی ہو جائے۔

آوازۂ رسالت

کوکبۂ رسالت کے طلوع کرنے سے قبل عرب کاہنوں اور رمالوں کی زمین تھی جہاں ہردم نجوم کا طلسمی سایہ لرزتا رہتا تھا اور فضا میں خبیث روحوں کی سائیں سائیں ہوتی رہتی تھی ویسے اس وقت بھی سب کو یقین تھا کہ ان توہم پرستیوں میں کوئی دم نہیں اور یہ ایک ایسا علم ہے جس میں دجل وفریب ہی زیادہ ہے۔ لیکن اس وقت عظمت رسالت اور شکوہ نبوت کے علاوہ کس چیز سے تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ ذات نبوی کے بارے میں نجوم کا جھوٹا دیو بھی سچ بولنے پر مجبور ہوا سیرۃ ابن ہشام میں ابن اسحاق کے واسطے سے اس قسم کی دو روایتوں کا سراغ ملتا ہے۔

(۱) مالک ابن نظر لخمی نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر کے لیے اطراف و جوانب کے تمام کاہنوں رمالوں اور نجومیوں کو جمع کیا گیا اور مالک نے سب کے سامنے اپنا مقصد رکھا، عادۃً نجومیوں نے خواب پوچھا تو مالک نے کہا اس طرح مجھ کو تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں آئے گا، ہاں اگر تم لوگ میرا خواب اور اس کی تعبیر خود بخود دونوں ہی بتادو تو البتہ میں تمہارے جواب پر بھروسہ کروں گا، سب نے لاجواب ہوکر کہا: صاحب یہ کام تو صرف دو آدمی کرسکتے ہیں، سطیح اور شق۔ وہ دونوں بھی بلائے گئے اور پہلے سطیح سے پوچھا گیا تو اس نے کہا: تم نے یہ خواب دیکھا ہے کہ کچھ سیاہ کھوپڑیاں نمودار ہوئی ہیں جنہوں نے تمام انسانوں کو کھاڈالا ہے، بادشاہ نے حیرت کے ساتھ تصدیق کی اور کہا: اچھا تعبیر بتاؤ تو سطیح بولا: مجھے عرب کے ریگستانوں میں رہنے والے حشرات کی قسم! عنقریب تمہارے ملک پر اہل حبش حملہ کرنے والے ہیں اور وہ ابین سے لے کر حرش تک قابض بھی ہوجائیں گے، بادشاہ بولا: یہ تو بڑی دردناک خبر ہے لیکن یہ بتاؤ یہ میری زندگی میں ہوگا یا اس کے بعد۔ سطیح: نہیں تمہارے ساٹھ ستر سال بعد، پھر وہ بھی یہاں ٹھیک سے دم لینے نہ پائیں گے کہ انہیں بھاگنا پڑے گا۔ اچھا تو انہیں کون نکالے گا؟ ابن ذی یزن یمنی

زبان بار کہا یہ کہ کس کا نام آیا کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لیے

وہ پاک نبی ہوں گے ہاشمی و مطلبی ہوں گے، ان کے پاس خدا کی طرف سے وحی آئے گی اور تا قیامت اس ملک کی قسمت انہیں کے دامان کرم سے وابستہ ہوگی، آج تم کیسی باتیں کرر ہے ہو، کیا قیامت بھی قائم ہوگی۔ ہاں ہاں وہ آخری دن جب مخلصوں کو سعادت اور بدکاروں کو ہمیشگی کا عذاب دیا جائے گا، بدلتی ہوئی شفق کی قسم ہر دم بڑھتی ہوئی تاریکی کی سوگند اور چاند کی روز افزوں ضیا کی شہادت یہ باتیں تو ہو کر رہیں گی۔ (المستطرف)

مالک ابن نظر سطیح کی باتوں سے اس درجہ متاثر ہوا کہ اس نے اپنے بال بچوں کو حیرہ منتقل کر دیا۔

(۲) صبح میلاد نبوی ﷺ ایوان کسری کے چودہ کنگرے سرنگوں ہو گئے۔ گو اس نے لاکھ چاہا مگر ایسی باتیں کہیں چھپائی جا سکتی ہیں، مجبوراً اس نے اہل دربار کو جمع کر کے اس سانحہ کی خبر دی تو ایسا معلوم ہوا کہ آج سبھی اس قسم کی خبریں دینے کے لیے تیار ہو کر آئے ہیں۔ موبد اعظم کہنے لگا: آج میں نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا ہے کہ کچھ گھوڑوں کے آگے آگے کچھ اونٹ چلے آرہے ہیں اور سب دریائے دجلہ میں اتر گئے پھر اسے نہایت آسانی کے ساتھ پایاب دریا کی طرح پار کر کے تمام ایران وفارس میں پھیل گئے۔ اتنے میں رقعہ نویسوں نے خبر دی کہ آج پورے ملک ایران کے آتش کدے خاموش ہیں اور کوشش کے بعد بھی ان کی بجھی ہوئی آگ بھڑک نہ سکی، اسی دوران میں اڑتی پڑتی خبر یہ بھی ملی کہ دریائے ساوہ بھی خشک ہو گیا ہے، ان تمام وحشت اثر خبروں نے بادشاہ اور اہل دربار کو اتنا پریشان کیا کہ سب نے جمع ہو کر اس کے بارے میں غور کیا اور بالآخر یہ طے پایا کہ عرب کے کاہنوں اور قیافہ شناسوں سے اس بات میں رجوع کیا جائے، چناں چہ کسری نے ملک عرب نعمان ابن منذر کے پاس لکھا اور اس نے عبد المسیح بن عمر غسانی کو بھیج دیا تو نوشیرواں نے سب سے پہلے عبد المسیح سے پوچھا: بتاؤ ہم تم سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں، اس نے جواب دیا یہ بات تو میرے چچا سطیح کے سوا اور کوئی نہیں بتا سکتا۔ مابدولت تمہارے سفر کا پورا انتظام کر رہے ہیں تم ابھی ابھی شام کی طرف جاؤ اور ہمارے سوال کا جواب

لاؤ، چناں چہ عبد المسیح اسی وقت سطیح کے پاس روانہ ہوا اور وہاں اس وقت پہنچا جب کہ سطیح بستر مرگ پر تھا، عبد المسیح نے سلام کیا لیکن سطیح کو جواب دینے کی مہلت کہاں تھی، عبد المسیح نے ایک شعر پڑھا: اے یمن کے سردار تم گونگے ہو کہ نہیں سن رہے ہو۔ اے نجومی کیا تم عاجز ہو گئیم سطیح نے آنکھیں کھول دیں اور گویا ہوا۔ عبد المسیح جو کہنے اونٹ پر میرے پاس اس وقت آیا جب کہ میں مر رہا ہوں۔ اس کو کسریٰ کے نوشیرواں نے اس لیے بھیجا کہ کنگروں کے ٹوٹنے آگ کے بجھنے اور مویدوں کے خواب کے بارے میں دریافت کریم ان سب کا مطلب یہ ہے کہ جب تلاوۃ کا غلبہ ہو اور صاحب ہراوہ مبعوث ہوں نیز نہر ساوہ خشک ہو تو بابل میں اہل فارس ٹھہر نہیں سکتے اور نہ شام میں سطیح زندہ رہ سکتا ہیم ہاں ایران میں پارسیوں کے تاجدار گرے ہوئے کنگروں کی تعداد کے موافق ہوں گے یہ کہہ کر سطیح نے دم توڑ دیا اور عبد المسیح لوٹا۔ نوشیرواں نے حساب لگایا کہ اس طرح اگر فی بادشاہ پچاس سال بھی رکھ لیے جائیں تو حکومت سات سو سال تک ہمارے ہاتھوں سے کہیں باہر نہیں جاتی ہے، لیکن ہوا یہ کہ حضرت ذوالنورین کے عہد خلافت میں ایران کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور فارس مکمل طور پر اہل اسلام کے قبضہ میں آ گیا۔ [البدایۃ والنہایۃ ۲/۲۱۵]

محمد

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

سیدنا محمد ﷺ۔ اصل کائنات خلاصۂ موجودات جس نے ہستی کی زلف برہم سنواری، جس نے زندگی کا چہرہ نکھارا، حیات کی نبض جس کے دم سے دھڑک رہی ہے، وجود کا قافلہ جس کے دم سے رواں دواں ہے۔ لولاک لما خلقت الافلاک والارضین.

سیدنا محمد ﷺ۔ شاہکار فطرت، حبیب پروردگار خدا نے پیدا فرمایا تو حسن بے مثال بخشا، علم عطا فرمایا تو عالم ما کان و ما یکون بنایا، ہدایت فرمائی تو ہر مشکل ومبہم کا عقدہ کشا کیا، صیانت وعفاف کو ان سے زینت بخشی، عدل وانصاف کو ان سے قوت دی، سبحان اللہ محرم اسرار خدا، زینت عرش کبریا، مہبط وحی الٰہی، اندھی آنکھوں کی ضیا، بہرے کانوں کی جلا، بند دلوں کے راہنما۔

محمد رسول اللہ ارسلہ بالھدیٰ ودین الحق.

سیدنا محمد ﷺ۔ رحمت عالم چارہ گرغم: جس نے بے کسوں کی دست گیری کی، جس نے دردمندوں کی چارہ سازی فرمائی، جس نے ذروں کو ستاروں کا جمال بخشا، جس نے انسانوں کو جینے کا سلیقہ سکھایا، جس کے تبسم پنہاں کے صدقے زندگی مسکرا اٹھی۔

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

سیدنا محمد ﷺ صاحب اقتدار احمد مختار، نائب کردگار جن کا سجدہ فرش پر اور جن کا پرچم عرش پر، جن کی فرمانروائی زمین پر اوتیت مفاتیح الارض اور جن کی اطاعت آسمان پر عند ذی العرش مکین مطاع ثم امین . جن کا رعب وجلال ایک ماہ کی راہ پر مخالفوں کا دل

ہلا دے، جن کا پیار بزدلوں کو جری بنادے، مالک ہر خشک و تر، قادر بحر و بر، مختار شمس و قمر، مقتدر شجر وحجر، انا اعطینک الکوثر. جن کی شان انما انا قاسم و اللہ یعطی جن کا فرمان۔

مالک کونین ہیں گو پاس کچھ رکھتے نہیں
دو جہاں کی نعمتیں ہیں ان کے خالی ہاتھ میں

سیدنا محمد ﷺ۔ نبیوں کے نبی رسولوں کے امام، پیغمبروں کے قائد، عالم کے راہ نما، ہر نبی ان کا مژدہ گو اور مدح سرا، ہر پیغمبران پر ایمان لانے والا، اور ان کا گواہ، خدا کے مصطفٰی، قرآن سراپا، دست کریم ﴿وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی﴾ قدم ناز ﴿لا اقسم بھذا البلد﴾ رفتار ﴿سبحن الذی اسری﴾ گفتار ﴿ما ینطق عن الھوی ان ھو الا وحی یوحی﴾ چشم حق بیں ﴿ماذا غ البصر وماطغی﴾ دل حق آگاہ ﴿ما کذب الفواد ومارای﴾ روئے انور ﴿والضحی﴾ زلف معنبر ﴿واللیل اذا سجی﴾ اور قدموں نور ﴿قد جاء کم من اللہ نور﴾ سیرت ان کی ﴿وانک لعلی خلق عظیم﴾ لطف ان کا ﴿بالمومنین رؤف رحیم﴾ اطاعت ان کی ﴿من یطع الرسول فقد اطاع اللہ﴾ محبت ان کی ﴿فاتبعونی یحببکم اللہ﴾ خدا ان کا محافظ ﴿واللہ یعصمک من الناس﴾ وہ کائنات کے دافع البلا ﴿ما کان اللہ لیعذبھم وانت فیھم﴾ گویا۔

اللہ کی سرتا بقدم شان ہیں یہ — ان سا نہیں انسان وہ انسان ہیں یہ
قرآن تو ایمان بتاتا ہے انہیں — ایمان یہ کہتا ہے میری جان ہیں یہ

الغرض آپ کی ذات ستودہ صفات تمام صفات کمالیہ کی جامع نقائص سے پاک، احمد مجتبٰی محمد مصطفٰی بے مثال و بے مثل ممتنع النظیر مخلوق خدا۔

وصلی اللہ علی نور کز وشد نور ہا پیدا
زمیں از حب او ساکن فلک در عشق او شیدا

رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

انسانیت کی جن عظیم ترین ہستیوں کو تاریخ ساز اور عہد آفریں کہا جاتا ہے اگر غور سے ان کی سیرتوں کو دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دراصل وہ خود ہی زمانہ کی پیداوار اور اپنے عہد کی ایجاد تھے۔ عالم کا ہر سیاسی مدبر اور عظیم تر شہنشاہ تمام تر سطوت و جبروت کے باوجود اقتدار کی بقا حکومت کے استحکام اور سلطنت کے دوام کی خاطر اپنی قوم کے عوائد و رسوم ان کے اذکار و معتقدات کی رعایت کرتا ہے، اپنی بنیادی پالیسی کی ترتیب و تشکیل میں ان کے قومی محرکات کو خاص مقام عطا کرتا ہے، خواہ اصولی حیثیت سے وہ اس کا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔

کہتے ہیں کہ نپولین نے جب مصر پر غلبہ پایا تو اسلام کی محبت اور مسلمانوں کے مذہبی شعائر کے ساتھ ہمدردی کا بھرپور مظاہرہ کیا حتی کہ علمائے اسلام کے باہمی مناظروں کی سرپرستی کرتا۔ اس سے کسی نے شکایت کی تو اس نے کہا کہ یہ میری پالیسی ہے، اگر میں یہودیوں پر حکومت کرتا تو اپنے اہتمام میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا ہیکل تیار کرواتا۔

ہندوستان کے عظیم بادشاہ اکبر اور اس کے طبع زاد مذہب ''دین الٰہی'' کے پیچھے ہمارے خیال میں یہی پالیسی کام کر رہی تھی کہ مختلف الخیال قوموں کے دیس ہندوستان میں ساری قوموں کے تمام مذاہب کے امتزاج سے ایک ایسا مجموعہ ترتیب دیا جائے جو سب کے لیے قابل قبول ہو تا کہ اعتقاد کی مضبوط بنیادوں پر اکبر کی حکومت کا تخت عظمت بچھایا جا سکے۔

برخلاف اس کے مرسلین کرام بالخصوص سید المرسلین امام الرسل محمد عربی ﷺ عہد ساز اور زمانہ آفریں تھے، ان کو اس کی پرواہ نہ تھی کہ وقت کی رفتار کیا ہے، زمانہ کا ماحول کیا ہے؟ ماحول کا تقاضا کیا ہے؟ اور لوگ کیا کہتے ہیں؟ آپ عواقب و نتائج سے بے پرواہ مصنوعی مصلحت

اندیشوں اور دور بینیوں سے بے نیاز ہو کر اعلان حق فرماتے اور دنیا لاکھ عناد وانکار اور سرکشی کے باوجود آپ ہی کی آواز پر لبیک کہنے پر مجبور ہوتی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے سخت سے سخت وقت میں بھی کفر کے اصولوں سے صلح نہ کی، مختلف غزوات میں جب کہ حضور کو لوٹنے والوں کی سخت ضرورت تھی اور ایک آدمی کا اضافہ بھی جنگی حیثیت سے نہایت قیمتی تھا، مشرکین نے آپ کی مدد کی پیش کش کی کہ ہم آپ کی طرف سے کافروں سے جنگ کریں آپ نے فرمایا: انا لانستعین بمشرک. [کنز العمال ۳۵۷/۴، حدیث: ۱۰۸۸۷] (ہم مشرکوں کی مدد نہیں چاہتے)

شرفائے قریش آپ کے چچا ابو طالب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اپنے بھتیجے کو منع فرمائیں اس کی تبلیغ نے پورے عرب میں آگ لگا رکھی ہے۔ اگر وہ دولت چاہتے ہیں تو ہم عرب کا سارا مال ان کے قدموں میں جمع کر دیں۔ اگر حکومت کی خواہش ہے تو ہم انہیں اپنا بادشاہ تسلیم کر لیں۔ اگر عورت چاہتے ہیں تو سارے عرب کا منتخب حسن ان کی خواب گاہ میں جمع کر دیں۔ کسی طرح وہ ہمارے معبودوں کے خلاف صف آرائی چھوڑ دیں۔ اور اگر وہ کسی طرح باز نہیں آتے تو ہم آپ کو آگاہ کیے دیتے ہیں کہ ہم نے اب تک آپ کا پاس ولحاظ کیا، اب ہمارا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، ان کی زبان خاموش نہ ہوئی تو ہم ان کی زندگی کا چراغ خاموش کر دیں گے۔

سرداران قریش کے چلے جانے کے بعد جب ابو طالب نے آپ سے اس کا ذکر کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ:

"بھتیجے میرے کمزور کندھوں پر اتنا بوجھ نہ رکھو کہ میں اسے برداشت نہ کر سکوں" یہ سن کر آپ نے پیغمبرانہ عزم وجلال کے ساتھ فرمایا:

"چچا جان! یہ دنیا کا مال کیا چیز ہے اگر قریش کے لوگ میرے داہنے ہاتھ میں آفتاب اور بائیں ہاتھ میں ماہتاب رکھ دیں اور کہیں کہ اعلان حق چھوڑ دو تو یہ ناممکن ہے۔ یا تو اللہ کا کلمہ پورا ہوگا یا اسی راہ میں میری جان جائے گی"۔ [البدایہ والنہایہ ۴۲/۳]

ہزار بار نتائج سے ہو کے بے پروا اسی کا نام لیا جس کا نام لیتا تھا

ایسی مایوس کن حالت اور مخالف ماحول میں جرأت کا یہ معجزانہ ظہور پھر ایسی قوم کے سامنے جو اپنی سرکشی وعناد میں اس حد کو پہنچی ہوئی تھی کہ دعا کرتی تھی:

"اللھم ان کان مایقول محمد حقا فامطر علینا حجارة من السماء".

پھر تھوڑے دنوں کے بعد اسی قوم کا عجز ونیاز کے ساتھ آپ کے قدموں میں سر رکھ دینا، آپ کی ذات اقدس کے ساتھ اور آپ کے لائے ہوئے پیغام کے ساتھ والہانہ جذبۂ جاں نثاری، اور ایک ایک کر کے حضور کی ساری باتوں کو تسلیم کر لینا، اپنے معتقدات وعوائد سے یکسر پھر جانا، اس کی مخالفت کرنا، درآں حالے کہ اس سلسلہ میں آپ نے کبھی کوئی مداہنت نہیں فرمائی، سیاسی قائدین اور دنیاوی بادشاہوں کی طرح مصلحت اندیشی اور غلط دور بینی سے کام نہ لیا۔

کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں کہ آپ خدا کے برگزیدہ رسول ہیں، سیاسی مدبر اور قومی رہنما نہیں۔ پھر اگر دنیا کے عظیم ترین مدبروں، قائدوں، فلسفیوں اور دیگر علوم وفنون کے سربراہوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ وہ اپنی قومی رفتار اور ارتقا کی آخری کڑی ہیں، یعنی کسی بڑے فیلسوف اور حکیم کا ظہور اسی قوم میں ہوگا جو علم وحکمت سے شغف رکھتی ہو، جس کے افراد علم وفن کی شاہراہوں پر پوری جدوجہد کے ساتھ مدتوں ابھرنے کی کوشش کرتے رہے ہوں، پھر صدیوں کی رفتار اور ارتقا کے نتیجے میں ایک ایسا فلسفی جنم لے گا جو پوری انسانی آبادی کو جھنجوڑ کر رکھ دے گا۔ جو قوم اقتدار پرستی اور جہاں بانی کے میدان میں دوڑ لگاتی ہوگی، اس میں صدیوں کی جدوجہد کے بعد ایک عظیم فاتح پیدا ہوسکتا ہے۔ جو اپنے اولوالعزمانہ کارناموں سے پوری دنیا کا سر اپنے قدموں میں جھکا دے۔ اسی طرح عظیم شاعروں، محیر العقول خطیبوں اور دیگر تمام علوم وفنون کے ماہروں کا حال ہے۔

پس دنیا کا ہر بڑا انسان اپنے قومی جذبوں کا ترجمان، طبعی صلاحیتوں کا نمائندہ اور اپنے زمانہ کی روح اور خلاصہ ہوتا ہے، یہ ایک فطری قانون ارتقاء ہے جو تمام انسانی جہان کمال میں قدر مشترک کے طور پر پایا جاتا ہے۔

لیکن جب ہم حضور ﷺ کی زندگی پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آپ کی ذات کریم اس سلسلہ میں ایک معجزانہ استثنا نظر آتی ہے، آپ نے جس قوم میں نشو ونما پائی وہ زندگی کے تمام شعبوں میں زوال و پستی کی انتہائی منزلوں تک پہونچ چکی تھی، ان میں کوئی اجتماعی شعور سرے سے تھا ہی نہیں، طوائف الملوکی بلکہ خانہ بدوشی کی ان سرحدوں کو پہونچ چکے تھے جس کی مثال ہر علم سے عاری، ہر فن سے کورے، ہر قبیلہ مستقل بالذات، باہم کسی رابطہ قومی سے نا آشنا، آپس میں ایک دوسرے کو لوٹتے رہنا ہی ان کا مشغلہ تھا۔

پس ایسی گئی گذری قوم سے تو نہ عقلاً ہی یہ توقع ہوسکتی تھی نہ طبعاً کہ وہ ایسا مصلح جنم دے گی جو قائدین کی صف میں ان خصوصیات کا مالک ہے جو اس سے پہلے کسی کو حاصل نہ ہوسکیں، مثلاً وہ ایک ایسی قوم کا بانی ہوا جس کی ہمہ گیری نے رنگ ونسل اور قوم ووطن اور طبقات انسانی کی تمام مصنوعی حد بندیوں کو پارہ پارہ کردیا اور تمام نسل انسانی کو ایک عالمگیر اسلامی برادری میں منسلک کردیا، ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی جس کا ایک سرا اندلس میں خلیج بسکے سے ملا تھا اور دوسرا ہندوستان میں دریائے سندھ سے، اور ایک ایسے دین کی بنیاد ڈالی جو اپنی مثال آپ ہے۔

اس لیے سوائے اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ قوم عرب میں پیغمبر اسلام کا ظہور دنیاوی قائدین کی طرح نہیں ہے، جن کے لیے طویل فکری جدوجہد، طبعی سلسلۂ ارتقا کی ضرورت ہو، یہ تو صرف عنایت الٰہیہ کی کرشمہ سازی ہے جو رات کی تاریکی سے نور ظاہر کرتی ہے، سمندر کی اندھیری تہوں میں تابدار موتی جنم دیتی ہے، ہری پتیوں میں سرخ گلاب کا پیوند لگاتی ہے اور پتھر کے جگر میں نرم پودوں کا گہوارہ بناتی ہے۔

اسی نے اس انسان عظیم کو بھی اتنے گھناؤنے ماحول میں جنم دیا، اور اس کو ایک ایسا نور بنایا جو تاریکیوں کا سینہ چاک کرے تاکہ رب کے نور سے دھرتی میں چراغاں ہو۔

پس یہ قائد وریفارمر نہیں جو ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ تو نبی اور پیغمبر ہے جو مخالف ترین ماحول میں مبعوث ہوتا ہے تاکہ نئے ماحول جنم دے اور زمانہ کی ہوا کا رخ موڑ دے۔

معجزات وعجائب کا ظہور بھی نبوت کی نشانی ہے، لیکن اصل پیغمبرانہ عظمت اسی میں منحصر

نہیں کہ مظاہر ڈھلنے والے اور زائل ہو جانے والے ہیں، اصل عظمت شخصیت کی تاثیری قوت ہے جو مخاطب کے قلب و دماغ پر حاکمانہ قبضہ جما لیتی ہے، جس کے نتیجے میں متعلقین سبھی کے قلوب میں خواہ مخواہ اس عظیم تر شخصیت کا احترام، اس کی ہیبت، اس کی محبت اور اس کا رعب پیدا ہو جاتا ہے اور سب کے سب بے اختیار اس کی پیروی کرتے، اس کی نقل اتارتے اور اس کے سانچے میں ڈھلنے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں، اور اسی خمیر سے کام لے کر وہ ذات ایک نئے مذہب اور عقیدہ، ایک نئے صیغہ دینیہ کی بنیاد رکھتی ہے۔

فی الحقیقت پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی ایسی شخصیت کاملہ تھی جس میں آپ سے قبل ہو یا آپ کے بعد کوئی بھی آپ کا ہمسر نہ ہو سکا، اور خود معاصرین نے آپ کی رفعت وعظمت اور برتری کا گن گایا۔

تاریخ کی کیسی عجیب وغریب حقیقت ہے کہ جن لوگوں سے آپ کا سابقہ ہوا ان میں کتنے بلند ایوان والے تھے، کتنے عقل وتجربہ والے تھے، کتنے عظیم تر سرمایہ دار تھے، اک ذرا عیب بھی ظاہر کرنے سے کوئی چیز ان کو باز نہیں رکھ سکتی تھی، لیکن سب کے سب آپ کے مسخر ومنقاد، آپ کے اطاعت شعار ہو گئے، آپ کے اصحاب نے مسلسل تیرہ سال نا قابل برداشت شوائد برداشت کیے، عرب کے ہر قبیلہ نے اپنے زیر قبضہ لوگوں پر ایسے ایسے عذاب توڑے کہ دیکھنے والوں کے دل دہل اٹھے بلکہ آج اس کے ذکر سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور وہ لوگ اس کو عجیب وغریب صبر کے ساتھ برداشت کرتے تھے کہ خود حضور نے ان کا حال دیکھ کر ان کو ہجرت کی اجازت دے دی، اس پر بھی آپ کے متبعین دن رات بڑھتے ہی جاتے تھے، پروانے تھے کہ جان دینا سعادت سمجھتے تھے کہ سرمست تھے۔ ع

سر دوست سلامت کہ تو خنجر آزمائی

آخر اس رجوع اور ہدایت انگیزی کا سبب سوائے حضور کی تسخیری شخصیت کے اور کیا تھا؟ جس نے ان کے قلب ودماغ پر اس درجہ قبضہ جما لیا تھا کہ مخالف آندھیوں، لاتعداد اذیتوں اور عواقب ونتائج سے بے نیاز ہو کر آپ کی ایک ایک ادا پر جان دینا ہی وہ سرمایۂ حیات تصور

کرتے تھے، کیا دنیا کے تمام فلاسفہ مل کر بھی کوئی قوم پیدا کر سکتی ہیں، جیسے محمد عربی ﷺ نے ظاہر فرمائی جو علو نفس، صفائے طبع اور رقیق القلبی، راسخ الاعتقادی اور اظہار حق، اقامت عدل اور احترام امانت اور حق کی فرمانبرداری میں بے مثال تھے۔

پس آپ کی یہ بے مثال اور معجزانہ تاثیری قوت بھی اس امر کی گواہ ہے کہ آپ نبی اور رسول تھے۔

ولادت شریفہ

مکہ اشرف البلاد، خیر المہاد، بلد اللہ الامین، وہ شہر گرامی جس کی برکتیں بڑھتی ہی رہیں، فضائل روز افزوں ہی رہے۔ جہاں روندے ہوؤں کو امن ملتا رہا۔ جہاں دل سے پکارنے والوں کی پکار خدا سنتا رہا، ایام جہالت میں بھی ڈھونڈھنے والوں کو سارے عرب میں اس کے علاوہ پناہ کی جگہ نہیں ملتی تھی۔ اور تلاش کرنے والوں کے لیے اس کے علاوہ کوئی ٹھکانا نہ تھا، قدیم ایام سے بھی چوں کہ یہ سارے عرب کا کعبہ مقصود، اور زیارت گاہ عام تھا، جہاں سال بہ سال حج کی تقریب میں عرب کے تمام باشندے جمع ہوتے، اس لیے مکہ روحانی بزرگیوں کے ساتھ ساتھ، دنیاوی حیثیت سے بھی تجارت کی ایک بہت بڑی منڈی ہو گیا تھا، جہاں عرب کی قومیں ہند، مصر، شام کے تاجر اپنی قسمت آزماتے، ہندوستان کی عود، اگر، لونگ، الائچی، گرم مصالحہ، خوشبوئیں، کپڑے اور تلواریں عرب کے ہی بازار سے شام اور وہاں سے مغرب کے شہر و دیار میں پہونچتی تھیں۔ یہ مکہ کی ایک دوسری خوبی تھی کہ وہ قدیم دنیا کی ایک بین الاقوامی شاہراہ کا اہم اسٹیشن تھا جو مشرق و مغرب دونوں کو ملاتا تھا۔ آنے جانے والوں کی اتنی بھیڑ رہتی کہ اس وقت بھی بسا اوقات وہاں کی آبادی ایک لاکھ افراد تک پہونچ جاتی۔

وہاں کا سیاسی نظام ایک خاص قسم کی مذہبی جمہوریت تھا کہ وہ عرب کے عظیم ترین قبائل سے اپنے معہود طریقے پر ۲۰ آدمی چنتے جو مکہ کے حکمراں اور کعبہ کے نگراں ہوتے، یہ عجیب اتفاق ہے کہ حضور سید عالم ﷺ کے عہد میں وہ سارے ممبران سمٹ کر قریش کے قبیلہ میں جمع

ہو گئے تھے، بقیہ تمام قبائل عرب کے لق ودق صحرا میں ٹوٹے ہار کے دانوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے، ان کے درمیان اتحاد کا رشتہ یکسر گستہ ہو چکا تھا، بس اتنی بات تو مشترک تھی کہ سب کی نسل ایک تھی، زبان ایک تھی اور کعبہ کے گرد سال میں ایک دفعہ ملتے، بقیہ ہر خاندان کا امیر الگ، قائد وراہبر الگ، معبود الگ اور بیشتر رسوم مذہبی الگ، جنگ وجدال ان کا پیشہ، قتل ونہب ان کا ذریعہ آمدنی، بھائی کو قتل کر کے فخر کرتے، عصمتیں لوٹ کر کے اتراتے۔

اسی طرح صدیاں بیت گئیں اور سارا عرب باہمی جنگ وجدال کی بھٹی میں پھنکتا رہا، سلب ونہب، تحاسد وتباغض کی آگ میں جلتا رہا، لڑائی کے زباں دراز شعلے مردوں کو کھاتے رہے، عورتوں کو بیوہ کرتے رہے، بچوں کو یتیم بناتے رہے اور قوم کے آتش نوا شعرا شعلہ بیان مقررین عزائم کو اکساتے رہے۔ جذبات کو بھڑکاتے، بزدلوں میں جوش کی رو دوڑاتے رہے، گویا جنگ کی بھٹی میں لکڑیاں ڈالتے رہے، اور جلتی پر تیل چھڑکتے گئے۔ حرب بسوس وداحس جس کے مشہور شواہد ہیں۔

ایسے شہر اور ایسی قوم میں مشہور روایات کے مطابق ۱۲ ربیع الاول عام الفیل کی صبح صادق کے وقت، دعائے خلیل، نوید مسیحا، زمزمہ داؤد، ترانہ سلیماں، قریش کی صفات حسنہ کا خلاصہ، بنی ہاشم کا انتخاب، کافہ اہل عرب کے سرتاج، نسبی خوبیوں کے مقصود اور ذاتی برتریوں کے مراد، محمد عربی، فداہ ابی وامی ﷺ رونق افروز بزم عالم ہوئے۔ اللھم صلی علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ الامجاد.

شرف نسبی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ حضور ﷺ کے آبائے کریم اور امہات طاہرات میں سب کے سب سفاح جاہلیت اور آلودگی شرک وکفر سے پاک وصاف رہے۔

ارشاد الٰہی ہے:

﴿وَتَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ﴾ [شعراء: ۲۱۹]

آپ کی نسبی پاکیزگی اور نسبی طہارت، اللہ اللہ! کل کا کل سلسلۃ الذہب اور عقد ثریا، ابراہیم خلیل اللہ، رافع البیت اس کے وسط القلادہ، اسماعیل ذبیح اللہ گل سرسبد کنانہ، اس کی شان تو قریش حسن انتظام، ہاشم جسم تو جان کی جان ابوالقاسم (ﷺ) آپ خود فرماتے ہیں:

"ان اللہ اصطفیٰ من ولد ابراھیم اسماعیل، واصطفیٰ من ولد اسماعیل بنی کنانۃ، واصطفی من بنی کنانۃ قریشاً، وواصطفٰی من قریش بنی ہاشم، واصطفانی من بنی ھاشم، فانا من خیار الی خیار"۔

[خصائص الکبریٰ ۱/۳۸]

اور آپ کے چچا ابوطالب زمزمہ سنج ہیں۔

اذا اجتمعت یوما قریش لمفخر — فعبد مناف دھاد صمیمھا
وان حصلت انساب عبد منافھا — ففی ھاشم اشرافھا وقدیمھا
وان فخرت یوما فان محمدا — ھو المصطفی من سرھا وکریمھا

[سیرت ابن ھشام ۱/۱۷۲]

الغرض آپ کے آبا میں نہ تو کوئی رذیل نہ متبذل، سب کے سب سردار قائد ابرار ﷺ وعلیٰ آبائہ الاخیار۔

نشو ونما

ایام طفولیت سے عہد شباب تک آپ نے زندگی کے مختلف مراحل اس طرح طے فرمائے کہ پروردگار خود آپ کی حفاظت وحمایت فرماتا رہا، تربیت و پرداخت کرتا رہا، زندگی کی آلودگیوں سے آپ کو بچاتا رہا اور محاسن اخلاق سے آپ کو نوازتا رہا، اس میں نہ تو کسی دوسرے کی ذات پر بھروسہ کیا اور نہ ہی کسی مربی اور اتالیق پر اعتماد کیا، کیوں کہ آگے چل کر آپ کو صفوۂ کائنات اور خلائق ہونا تھا، محبوب رب العالمین اور رحمت عالم بننا تھا۔

تو صرف اپنی قوم ہی میں نہیں پوری انسانیت میں حسن خلق، مہر ومروت، کرم ورافت،

بردباری اور صدق لہجہ میں آپ اپنی نظیر آپ ہی ہو گئے۔ عالم یہ ہوا کہ عنفوان شباب میں ہی سارا عرب آپ کو "الصادق الامین" کہہ کر پکارتا۔ کیوں کہ وہ دیکھ رہے تھے کہ مکارم اخلاق کی ایک ایک خوبی آپ کی ذات کریم میں اس طرح جمع ہو گئی ہے کہ اس وقت آپ کا ہمسر کوئی نہ ہو سکا، نہ آپ کے قبل نہ آپ کے بعد، اور کیوں نہ ہوتا کہ آپ کی اٹھان ہی نرالی اور آپ کی نشو ونما ہی معجزانہ تھی، آپ جوان ہوئے تو سارا عرب آپ کے صبر وضبط، زہد وتقویٰ، جواں مردی وعالی حوصلگی، علم وحکمت، عفو ودرگزر، الغرض آپ کی ایک ایک خوبی کے زیر فرمان تھا اور آپ کو دیکھنے والا وجد وسرور میں پکا اٹھتا تھا۔

واحسن منک لم تر قط عینی

واجمل منک لم تلد النساء

خلقت مبرأ من کل عیب

کانک قد خلقت کما تشاء

حالاں کہ ابتدا ہی سے جو ماحول آپ کو ملا اس میں آپ کے چہار جانب فقر وفاقہ، عجز ودرماندگی، بکھری ہوئی تھی، خود آپ کا حال بھی ان سے کچھ علیحدہ نہ تھا بلکہ آپ اپنے ہم سنوں میں یتیمی کا داغ بھی رکھتے تھے۔

کوئی ظاہری اتالیق نہ تھا جو آپ کو سنوارتا، معروف معنوں میں مربی نہ تھا جو آپ کی نگہداشت کرتا، آپ کا گھرانہ بت پرست اور صنم کدوں کا نگراں، آپ کے عہد کے وہم ‌ن بتوں کی رسیاں اوران کے خدمت گزار، مگر آپ کے عقیدہ کی طہارت ہے کہ نسیم سحری کی طرح بے داغ ہے، اور عمل کی نظافت ہے کہ برگ گل کی طرح فطری اور مقدس، لیکن اس پر تعجب کیوں کیا جائے کہ آپ خود فرماتے ہیں۔ ادبنی ربی فاحسن تادیبی.

[کنز العمال ۱۱/۴۰۶، حدیث: ۳۱۸۹۵]

یہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ اپنے بچپن میں بھی خدا کے رسول اور عام بچوں کی فطری روش سے بالکل الگ تھلگ ایک معجزانہ شان رکھتے تھے۔

ورنہ جس طرح عام بچوں کی فطری روش ہوتی ہے کہ اپنے گردوپیش جو ہوتا دیکھتے ہیں اسی کی نقل اتارتے ہیں، اسی سے متاثر ہوتے ہیں، اسی پر ان کی زندگی کا آئندہ ڈھانچہ بنتا ہے، آپ بھی عرب کی وثنیت میں مبتلا ہوتے اور مکہ کی بت پرستیوں میں آلودہ ہوتے۔ (عصمہ اللہ وحاشاہ) لیکن وہاں تو تربیت الٰہی آپ کی کفیل تھی اور توجہ ربانی آپ کی نگراں اس لیے نہ کبھی آپ نے کسی بت کو سجدہ کیا، نہ ان کے قومی تہواروں میں شریک ہوئے، نہ ان کے چڑھاوے کا گوشت کھایا، نہ کبھی شراب پی۔

آپ زندگی بھر اپنی محنت اور کمائی سے روزی حاصل کرتے ہوئے یہاں تک کہ عام خلق میں آپ کے حسن معاملہ اور عظیم تر امانت داری کی شہرت پھیل گئی جس سے متاثر ہوکر خدیجہ بنت خویلد نے اپنا مال دے کر اپنے غلام میسرہ کو آپ کے ساتھ کیا، اور شام کی طرف تجارت کے لیے بھیجا، جب وہ واپس لوٹا تو خدیجۃ الکبریٰ کے حضور پورے سفر میں آنے والی دیانت داریوں، حسن معاملہ، طہارت و برکت اور صدق معاملت سے رطب اللسان تھا، آپ کی خوبیوں سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ کاروان عمر کی چالیس منزلیں طے کر لینے کے باوجود خود اپنی شادی کا پیغام سرور عالم ﷺ کو دیا اور باوجود اس کے کہ آپ کی عمر شریف اس وقت چوبیس سال تھی۔ آپ نے شادی فرمالی، اور پوری زندگی جب تک وہ رہیں انتہائی الفت ومحبت کے ساتھ قابل رشک زندگی گزاری، تنہا انہیں کے ساتھ خوشگوار زندگی پر قانع رہے اور کسی دوسری شادی کا خیال بھی نہ فرمایا، عمروں کا یہ فرق پر مسرت ازدواجی زندگی میں کبھی حارج نہ ہوا۔ اس عیش کو دیکھ کر پردیسی مثال دیتے اور احباب تعریف کرتے اور انہوں نے بھی بے مثال۔ جذبۂ جاں نثاری کے ساتھ، اپنے مال، اپنی عقل، اپنی جان کے ساتھ سرکار کی رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ اسی لیے حضور نے ان کے بارے میں فرمایا: آمنت بی حین کفروا.

یہ بات البتہ تھی کہ جوں جوں آپ کی عمر زیادہ ہوتی جاتی آپ کی تنہائی پسندی بڑھتی جاتی، مراقبہ اور توجہ الی اللہ میں زیادتی ہوتی جاتی اور آپ ہفتہ کا آزوقہ لے کر غار حرا میں تعبد وتحنث کی زندگی گزارنے کے عادی ہوگئے تھے تاکہ آپ کی روح عالم معانی کی طرف متوجہ ہوسکے

اور آپ وحی الٰہی کے لیے تیار رہیں۔ اور یہ تو واضح امر ہے کہ آپ نے کسی استاد سے سبق نہیں لیا، نہ کبھی لکھنے پڑھنے کی مشق بڑھائی اور عالم وعلوم سے معروف طریقہ پر سروکار نہ رکھا۔

عظمت محمدی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم

انسانوں کا وہ طبقہ جس کا تصور کسی ایسی ہستی کے اعتقاد سے خالی ہے جو مافوق الفطرت ہے، یا جس کی طرف وہ اپنی تمام حاجتوں، پوری تمناؤں اور بھرپور امیدوں کے ساتھ رجوع کر سکے، یا اپنے تمام افعال واقوال کا جس کے سامنے جواب دہ ہو سکے۔ اپنے طبقہ کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے خود اپنی بصیرت اور فطرت وعقل کی روشنی میں لائحہ حیات اور رہن سہن کے طور طریقے بنانے پڑتے ہیں وہ خود جتنی پابندی چاہے اپنے اوپر لاد سکتا ہے اور جتنا چاہے آزاد رہ سکتا ہے، یا حالات اس کو جیسا بننے پر مجبور کریں گے ویسا ہی یہ ہو سکتا ہے۔ بالفاظ دیگر جو لوگ کسی مذہب کے پابند یا حیات بعد الممات کے قائل نہیں انہیں اپنا دستور خود ہی مرتب کرنا پڑتا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ صرف اسی نظریہ سے فوائد مرتب کریں گے۔ دنیوی حیات میں کہاں تک آسانی اور آسائش بہم پہونچائی جا سکتی ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ مذہبی اور خدا پرست واقع ہوتے ہیں ان کے یہاں عمل، قانون سازی، اور آئین طرازی کے بارے میں کچھ اس قسم کے خیالات پائے جاتے ہیں۔

(وان العقل لاینفک عن الهوی فلایصلح حجةً بنفسه بحال) یعنی الوهم کثیراً مایتعارض العقل فیخلط علیه مطلوبه ولذا تری ان بعض العقلا یخالف البعض بل یناقض نفسه فاذا کان العقل کذلک فکیف یعتمد علیه.

[حسامی مع النامی ص ۱۳۷، مجلس برکات]

عقل خواہشات سے پاک نہیں ہو سکتی، اس لیے اس کو حجت نہیں قرار دیا جا سکتا، یعنی وہم اکثر عقل سے خلط ملط ہو جایا کرتا ہے، اور چند عقل مند آپس میں ایک دوسرے کی مخالفت کرنے لگتے ہیں، بلکہ ایک ہی آدمی عقل کے سہارے متناقض باتیں کہتا ہے، پھر ہم قانون سازی

میں عقل پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں۔

اس لیے وہ ایک ایسی ہستی کے وجود پر یقین رکھتے ہیں جو اپنے علم وحکم میں یکتا اور بے نیازی میں فرد ہو۔ ساری کائنات اس کی نگاہ میں ایک ہو اور وہ سب پر برابر رؤف ورحیم ہو جو عام انسانوں کے لیے مکمل ضابطۂ حیات اور اسوۂ عمل بنائے، چناں چہ وہ اپنے کو تمام اعمال میں جواب دہ بھی اسی کا تصور کرتے ہیں اور کارگاہ حیات میں ہر ہر قدم پر اس کے ارشادات واحکام کے متلاشی بھی رہتے ہیں، اور یہیں سے یہ امر بھی واضح ہو جاتا ہے کہ ان لوگوں کے لیے جو قانون ہوگا اس کی دو حیثیت ہوگی، ایک تو وہ جسے وہ دنیا کی زندگی میں باہم برت سکیں۔ دوسرا وہ جس سے اپنے شارع کی رضا مندی حاصل کریں اور اس کے ساتھ تعلق قائم رکھ سکیں۔ مذہب پرست یہاں آکر ایک قدم اور بڑھاتے ہیں اور وہ یہ کہتے ہیں کہ ظاہر ہے کہ عام انسانوں میں خود خدا آکر تو یہ قانون لوگوں کے سپرد کرنے سے رہا، اس لیے وہ اپنے کسی خاص بندے کو اس کام کے لیے چن لیتا ہے جس کے واسطے سے عام انسانوں تک اپنے پیغام اور دساتیر پہونچائے جس کو اصطلاح میں رسول و نبی جانتے ہیں۔

والرسول انسان بعثه الله تعالىٰ الى الخلق لتبليغ الاحكام.

[شرح عقائد ص ۲۷، مجلس برکات]

ذلک ان العباد لا طاقة لهم على تلقى الأوامر والنواهى من الله بلا واسطة بل ولا بواسطة ملک، فمن رحمته ولطفة واحسانه ارسال الرسل من البشر.

[حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین شیخ احمد الصاوی ۱۹/۱، دار الاحیاء التراث العربی]

اور یہ اس طرح کے بندوں کو خدا سے بلا واسطہ یا بواسطہ ملائک حاصل کرنا ممکن ہی نہیں پس یہ خدا کا بڑا احسان ہے کہ اس نے اپنے فضل سے آدمیوں میں رسول بنایا۔

پھر رسولوں کی حیات میں ایک گھڑی وہ بھی آتی ہے جب خاص طور سے وہ بارگاہ قدس میں ان احکام وامر کے قبول کرنے کے لیے بلائے جاتے ہیں، اور قدرت کی طرف سے ان کے

لیے مادیات کے حجابات اٹھائے جاتے ہیں، اور اس گھڑی کو انبیا کی زندگی میں زریں گھڑی تصور کیا جاتا ہے۔ اور جو سچ پوچھو تو وہ لمحۂ حیات نہ صرف انبیائے کرام کی زندگی کا زریں وقت ہوتا ہے بلکہ عام انسانوں کے لیے بھی عزت وسربلندی کا یادگار وقت ہے۔

(لی مع الله وقت لایسعنی فیه ملک مقرب ولانبی مرسل. [کشف الخفا ومزیل الالباس ۲/۲۲۶، از شیخ اسماعیل بن محمد عجلونی، دار التراث قاهره]

میرے لیے خدا کے ساتھ ایک ایسا وقت ہے جس میں فرشتوں اور رسولوں کی بھی رسائی نہیں ہوتی۔

چناں چہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے متعلق توریت میں ہے۔ یعقوب بیر سبع سے نکلا اور مدائن کی طرف روانہ ہوا اور وہاں ایک مقام پر جا کر لیٹا کیوں کہ سورج ڈوب گیا تھا اور اس مقام سے کچھ پتھر اپنے سر کے نیچے رکھ لیے اور وہیں سو رہا، وہاں خواب دیکھا کہ زمین سے آسمان تک ایک زینہ لگا ہوا ہے جس پر خدا کے فرشتے چڑھ اتر رہے ہیں اور خدا اس پر کھڑا ہے اور اس نے کہا: میں ہوں خداوند تمہارے باپ ابراہیم واسحاق کا جس زمین پر تو سویا ہے وہ تجھ کو اور تری نسل کو دوں گا۔

تفسیر خازن ۲/۲۸ میں ہے:

کذلک نری ابراھیم ملکوت السمٰوٰت والارض. کی تفسیر میں لکھا ہے

جس طرح حضرت ابراہیم کو بصیرت دینی عطا کی زمین وآسمان کی بادشاہیاں بھی دکھائی گئیں۔ حضرت مجاہد اور سعید بن جبیر نے کہا کہ یہ اس طرح ہوا کہ حضرت ابراہیم ایک چٹان پر کھڑے ہو گئے۔ پس آسمان کے حجابات اٹھا دیئے گئے یہاں تک کہ انہوں نے عرش وکرسی اور تمام آسمانوں میں جو کچھ ہے سب دیکھ لیا اور جنت میں اپنا ٹھکانا بھی دیکھا۔

چناں چہ قرآن کی آیت:

﴿وآتیناه فی الدنیا حسنة﴾

کا یہی مطلب ہے۔ اور زمین کو بھی منکشف کیا گیا یہاں تک کہ اس کا نچلا حصہ بھی دیکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر میں قرآن میں ہے: اور کچھ تمہیں موسیٰ کی خبر آئی جب اس نے ایک آگ دیکھی تو اپنی بیوی سے کہا: ٹھہرو مجھے ایک آگ نظر پڑی شاید میں تمہارے لیے اس میں کچھ چنگاری لاؤں یا آگ پر راستہ پاؤں۔ پھر جب آگ کے پاس آیا ندا فرمائی گئی کہ اے موسیٰ میں تیرا رب ہوں، تو اپنے جوتے نکال دے، بے شک تو پاک جنگل طوی میں ہے اور میں نے تجھے پسند کیا، کان لگا کر سن جو تجھے وحی ہوتی ہے۔ بے شک میں ہی ہوں اللہ کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری بندگی کر اور نماز قائم رکھ۔ [والنجم]

دوسری جگہ فرمایا: اور جب موسیٰ ہمارے وعدے پر حاضر ہوا اور اس نے رب سے کلام کیا۔ عرض کیا: اے میرے رب مجھے اپنا دیدار دکھا دے، فرمایا: تو مجھے ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ اپنی جگہ پر ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔ پھر جب اس کے رب نے پہاڑ پر اپنا نور چمکایا اسے پاش پاش کر دیا اور موسیٰ گرا بے ہوش۔

مذکورہ بالا اقتباس سے یک گونہ اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ اکثر اولوالعزم پیغمبروں کی حیات میں وہ ساعت سعید مظہر جلال و جمال بن کر آتی ہے۔ جب حسن ازل کے بے حجابانہ جلوے اپنے گوناگوں شیون و صفات کے ساتھ اس برگزیدہ بندۂ الٰہی پر جنت نگاہ اور سکون قلب بن کر چھا جاتے ہیں اور اسی عالم کیف و نور میں ایک طرف ضابطۂ حیات جسمانی اور لائحہ نظام روحانی بھی بارگاہ عزت پناہ سے کرامت ہوتا ہے۔ پھر آپ کا کیا خیال ہے۔ خلاصۂ موجودات، باعث ایجاد عالم، سرتاج انبیا خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے بارے میں؟ دنیا جانتی ہے کہ آج تیرہ سو سال گزرنے کے بعد بھی جب رجب المرجب کا چاند افق عالم پر طلوع کرتا ہے دنیا ایک بار غلغلۂ محمد اور معراج محمد میں غرق ہو جاتی ہے اور لوگ بھول جاتے ہیں کہ کسی اور کو بارگاہ الٰہی سے تقرب و شرف باریابی نصیب ہوا تھا، اور قرآن پاک نے اس ذکر پاک کو کچھ ایسے لاہوتی انداز اور والہانہ طریقہ سے بیان کیا ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ پاکی ہے اسے جو اپنے بندہ کو راتوں رات لے گیا مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک جس کے گرد ہم نے برکت رکھی

کہ ہم اسے اپنی عظیم الشان نشانیاں دکھائیں بے شک وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔[بنی اسرائیل]

اسی پیارے چمکتے تارے محمد کی قسم جب یہ معراج سے اترے! تمہارے صاحب نہ بھٹکے نہ بے راہ چلے اور وہ کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کرتے۔ مگر وحی جو انہیں کی جاتی۔ سکھایا سخت قوتوں والے طاقتور نے اور وہ آسمان بریں کے سب سے بلند کنارے پر تھا۔ پھر وہ جلوہ نزدیک ہوا پھر خوب اتر آیا تو اس جلوے اور اس محبوب میں دو ہاتھ کا فاصلہ رہا بلکہ اس سے کم، رب نے وحی فرمائی اپنے بندے کی طرف جو وحی فرمائی، دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا تو کیا تم ان کے دیکھے ہوئے پر ان سے جھگڑتے ہو اور انہوں نے تو وہ جلوہ دوبارہ دیکھا سدرۃ المنتہی کے پاس جس کے پاس جنت الماوی ہے، اور جب سدرہ پر چھا رہا تھا، جو چھا رہا تھا آنکھ نہ کسی طرف پھری نہ حد سے بڑھی، بے شک اپنے رب کی بڑی نشانیاں دیکھی ں۔[والنجم]

اور احادیث کریمہ میں مزید وضاحت کے ساتھ اس کا ذکر ہے۔ ۲۷ رجب کی مشک بیز رات میں کوکبۂ رسالت کے مدینے کی طرف کوچ کرنے سے کم وبیش سال بھر قبل مکہ میں جب کہ آں حضرت ﷺ ام ہانی کے مکان یا حطیم میں مصروف خواب ناز تھے۔ حضرت جبریل امین آئے ان کے ساتھ قدسیوں کی ایک جماعت تھی، وہ آں حضرت ﷺ کو چاہ زمزم کے پاس لائے وہاں سینۂ اطہر چاک کر کے قلب اطہر نکالا گیا اور آب زم زم سے دھو کر اس میں نور و ایمان وحکمت ومعرفت بھر دیا گیا، پھر ایک جانور گدھے ۔سے بڑا خچر سے چھوٹا لایا گیا جس کی باد پائی اور برق رفتاری کا یہ عالم تھا، وہ اپنا قدم حد نگاہ پر رکھتا تھا۔ اس سمندر باد پا پر سوار ہو کر آپ بیت المقدس میں پہونچے وہاں انبیا سابقین پہلے ہی سے موجود تھے، آپ نے سب کو دو رکعت نماز پڑھائی، باہر نکلے تو دو پیالے جبریل امین نے دودھ وشراب سے لبریز پیش کیے، آپ نے دودھ نوش فرمایا تو جبریل نے کہا کہ آپ نے فطرت پسند فرمائی۔ ورنہ آپ کی امت گمراہ ہو جاتی۔ پھر حرم پاک کی سرزمین پر سجدہ ریزی کرنے والا یہ رسول معظم عرش الٰہی پر عظمت محمدی کا پرچم نصب کرنے کے لیے اس فضائے نیل گوں میں مائل پرواز ہوا۔ اور چشم فلک نے دیکھا کہ دم زدن میں حضرت جبریل پہلے فلک کا دروازہ کھلکھلا رہے ہیں، ادھر سے سوال ہوا کون؟ جواب دیا

گیا جبریل۔ اور بھی کوئی ساتھ ہے؟ محمد رسول اللہ ﷺ! کیا بلائے گئے تھے؟ ہاں! دروازہ کھول دیا گیا۔ اندر پہونچ کر سب سے آخری نبی نے سب سے پہلے نبی آدم کو سلام کیا اور ایک عجیب منظر دیکھا کہ حضرت آدم کے دائیں کچھ سفید سائے ہیں جنھیں دیکھ کر وہ مسرور ہوتے ہیں اور بائیں طرف کچھ سیاہ پرچھائیاں ہیں جن کو ملاحظہ کر کے غمزدہ ہوتے ہیں۔ حضرت جبریل سے دریافت فرمانے پر عرض کیا: کہ داہنی طرف حضرت آدم کی جنتی اولادیں ہیں اور بائیں طرف اہل جہنم ہیں جنھیں دیکھ کر غم گین ہونا ایک فطری فعل ہے، پھر ہر ہر آسمان پر کسی نہ کسی نبی و رسول نے اس مقدس مہمان کی پذیرائی کی، کہیں حضرت عیسیٰ نے مبارک و سلامت کہی، کہیں حضرت موسیٰ نے تہنیت و تبریک فرمائی، تو کہیں حضرت یحییٰ اور ادریس نے خیر مقدم کا ترانہ گایا، یہاں تک کہ ساتویں آسمان پر آپ نے دیکھا کہ زمین کعبہ کے مؤسس حرم الٰہی کو اپنے سجدوں سے بسانے والے حضرت ابراہیم آسمان کے کعبہ اور ملائکہ کے مرکز عبادت بیت المعمور سے پشت لگائے ہوئے۔ آپ کے لیے چشم براہ ہیں۔ مرحبا یاابن الصالح کے مژدہ گو ہیں۔

پھر آپ کو جنت کی سیر کرائی گئی جس کے گنبد موتی کے ہیں اور زمین مشک کی اور آپ بلند ہوتے گئے تا آں کہ آپ نے قلم قدرت کے چلنے کی آواز سنی اور سدرۃ المنتہی پہونچ کر جبریل امین اپنی اصلی شکل میں ظاہر ہوئے، پھر سدرہ کو انوار الٰہی کی تجلیوں نے ڈھک لیا اور کچھ ایسے جلوہائے رنگا رنگ چھا گئے کہ زمین کے خزانے میں اس کی تعبیر کے لیے الفاظ نہیں، اور انسانی زبان میں اس کے ادائیگی کی طاقت نہیں۔ یہی عالم امکان کی وہ آخری حد ہے جہاں اوپر سے آنے والی چیزیں اترتی ہیں اور نیچے سے جانے والی چیزیں پہونچتی ہیں۔ عام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ سفر معراج یہیں سے ختم نہ ہو گیا کتنی اور منزلیں ہیں جن کے چہرے سے نقاب اٹھائی نہیں جا سکتی اور جن کی لطافت و نزاکت، عظمت و رموزت کے متحمل کلمات و الفاظ اتنا ہی ہو سکتے ہیں جتنا قرآن نے بتایا ہے:

﴿لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى﴾ [النجم: ۱۸]

اس وقت بارگاہ الٰہی سے تین تحفے ملے (۱) سورہ بقرہ کی آخری آیتیں (۲) شرک نہ

کرنے والوں کی عام مغفرت (۳) نمازیں ۔ واپسی میں حضرت موسیٰ سے پھر ملاقات ہوئی انہوں نے پوچھا کیا کیا حکم ہوا۔ فرمایا: پچاس وقت کی نمازیں ۔حضرت موسیٰ نے کہا: میں بنی اسرائیل کو آزما چکا ہوں یہ بار گراں آپ کی امت سے نہ اٹھ سکے گا جس پر آپ بار بار بارگاہ الٰہی میں جاتے اور آتے رہے یہاں تک کہ پانچ وقت کی نمازیں رہ گئیں، جناب کلیم تو اب بھی یہی چاہتے تھے کہ مزید تخفیف کرائی جائے لیکن حضور نے یہ فرما کر رہنے دیا کہ اب میں مزید تخفیف کے لیے عرض کرتے ہوئے شرماتا ہوں، ندا آئی اے محمد گو یہ نمازیں پانچ وقت کی ہیں لیکن ثواب وہی پچاس وقت کا ملے گا اور یہ غیر معمولی سفر ختم ہوا۔

گزشتہ حصہ مضمون میں ہم نے یہ بتایا تھا کہ مذہب پرست طبقہ قانون سازی اور دستور کی تخلیق کا حق صرف خالق کائنات وخدائے لایزال کے لیے مانتا ہے اور آپ کو نائب الٰہی، خلیفۃ اللہ یا با الفاظ دیگر انہیں قوانین الٰہیہ کا اجراء ونفاذ کرنے والا جانتا ہے اور کسی خاص قوم کی صلاحیتوں کی بنا پر اس رسم استخلاف ونیابت فی الارض کی تقریب کا نام معراج انبیا ہے۔ جیسا کہ حضرت یعقوب، حضرت ابراہیم نیز حضرت موسیٰ کی تاریخ سے معراج ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ہم اپنے مضمون میں معراج محمدی ﷺ کے دیگر پہلوؤں سے قطع نظر کر کے صرف اس حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں اس رسم استخلاف ونیابت کے عنصر کی کہاں تک شمولیت ہے۔ چناں چہ حسب ذیل قرائن شہادت دیتے ہیں کہ قدرت نے اس رات میں قوموں کی سرداری اور قوانین ربانی کے اجراء کی ذمہ داری مسلم قوم کو تفویض فرمائی۔

واقعہ معراج: اس کی تاریخ میں گو جزوی اختلاف ہو، تاہم سب اس بات پر متفق ہیں کہ یہ واقعہ ہجرت نبوی ﷺ سے کم وبیش ایک سال قبل کا ہے اور اسلام کی پوری زندگی دو حصوں میں منقسم ہے۔ مکی زندگی اور مدنی زندگی، مکہ کی اسلامی حالت سرتاسر عاجزی ومسکنت۔ بے چارگی وبے کسی ہے۔ جب کہ مدینہ میں اسلام کے عروج وعظمت، شوکت ودبدبہ کا آفتاب نصف النہار پر نظر آتا ہے، مکہ میں مسلمانوں کو غلامی وبے بسی اور محکومیت کی دنیاوی قیادت کا فخر حاصل تھا۔ رسول عربی ﷺ کے معراج کی ابتدا بیت اللہ کو قرار دینا اور اس پاک سفر کی ایک منزل

بیت المقدس کی مسجد اقصی کو ٹھہرانا صرف اسی لیے تھا کہ آئندہ عالم روحانیت وکائنات شریعت میں اسلامی ٹکسال ہی کا سکہ چلے گا اور عالم مادیات وحاکمانہ نظام میں بھی مسلمانوں ہی کی فرماں روائی اور اسلام کی حکومت ہوگی۔ کیوں کہ دین ودنیا کے یہ دونوں مرکز (کعبہ ومسجد اقصیٰ) آج کی مقدس رات میں محمد رسول اللہ کی تحویل میں دیئے جاتے ہیں اور دنیائے روح وجسم کے ان دونوں پایۂ تخت پر اسلامی رسول کا قبضہ کردیا جاتا ہے تاکہ دنیا یہ دیکھ لے کہ ناخدائے کشتیٔ اسلام کے سر پر بیت اللہ کے صحن میں تقدس ابراہیمی کا تاج رکھا گیا تو مسجد اقصیٰ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے جاہ وجلال والے تخت ومنبر پر بھی بٹھلایا گیا، اس لیے کہ آئندہ نظام روح وجسم کا واحد فرمانروا سربراہ کار نبی عربی ہی ہے۔

امامت انبیا: گزشتہ انبیائے کرام اپنے اپنے زمانوں میں صاحب وقت اور متصرف امور تھے۔ پھر ان پر ہر نوع کے انبیا تھے۔ کتنے وہ جو صرف آسمانی بادشاہت کی بشارت دیتے تھے اور کتنے وہ تھے جو شب کی طویل سجدہ ریزی کے بعد صبح کے تخت شاہی پر بیٹھ کر دادِ معدلت گستری بھی دیتے تھے۔ اور کتنے ایسے تھے جو صومعوں میں صف بندی صلوۃ کے ساتھ ساتھ میدان کارزار میں بھی صفیں درست کرتے تھے اور ان کے تسبیح دار ہاتھوں میں بسا اوقات تلواریں بھی چمکتی تھیں، اور کتنے آدمیوں کی آبادی اس کی تاسیس اور قیادت کے ماہر تھے، الغرض وہ اپنے اپنے فرائض کے لحاظ سے باہم مختلف النوع تھے۔ معراج کی رات میں سید الانبیا بارگاہ عزت وعظمت میں حاضری کے لیے بیت المقدس پہونچے تو مسجد اقصیٰ میں سب انبیا جمع تھے اور سب نے بالاتفاق اپنا پیشوا اور دو رکعت نماز کا امام بنایا۔ اس کو ہم رسول عربی کی رسم تاجپوشی جشن تخت نشینی کے علاوہ اور کیا کہہ سکتے ہیں۔ گویا اس وقت حضرت سلیمان نے اپنی حکومت، عیسیٰ علیہ السلام نے امامت تقدس، ابراہیم علیہ السلام نے سربراہ کاری اقوام، موسیٰ علیہ السلام نے نظام سیاست وتمدن اور دیگر انبیا نے اپنے اپنے منصب سے دستبرداری ظاہری فرمادی اور اعلان کردیا کہ آج سے دین محمد رسول اللہ کا، حکومت ان کے ماننے والوں کی۔ نظام اسلام کا اور سیاست اس کے دستور کی ہے۔ اور اسی طرح ازل میں انبیا نے محمد رسول اللہ کے حق میں اپنے عہدوں سے

دستبرداری کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ خدائے قدوس نے ازل میں تمام انبیا سے ایک وعدہ لیا کہ اگر وہ نبی جو تم سب کی صداقت کرنے والا ہے تمہارے زمانے میں آئے تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اس کی مدد و نصرت کرو گے سب نے اقرار کیا۔ خدائے پاک نے تصدیق فرمائی میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوتا ہوں اور تم سب ایک دوسرے پر گواہ بن جاؤ۔

سورۂ بنی اسرائیل اور تذکرہ معراج: سورۂ بنی اسرائیل میں معراج نبوی اور تاریخ عروج وزوال بنی اسرائیل پہلو بہ پہلو اس طرح بیان کی گئی ہے: پاکی ہے اسے جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گیا جس کے گرد ہم نے برکت رکھی تا کہ ہم اسے اپنی عظیم نشانیاں دکھائیں بے شک وہ سنتا اور دیکھتا ہے اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت فرمائی اور اسے بنی اسرائیل کے لیے ہدایت کیا کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ ٹھہراؤ۔ اے ان کی اولاد! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا (بے شک وہ بڑا شکر گزار بندہ تھا) اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں وحی بھیجی کہ ضرور تم زمین میں دوبارہ فساد مچاؤ گے اور ضرور بڑا غرور کرو گے پھر جب ان میں پہلی بار کا وعدہ آیا ہم نے تم پر اپنے بندے بھیجے سخت لڑائی والے تو وہ شہروں کے اندر تمہاری تلاش کو گھسے اور یہ ایک وعدہ تھا جسے پورا ہونا تھا پھر ہم نے ان پر الٹ کر تمہارا حملہ کر دیا اور تم کو مال و بیٹوں سے مدد دی اور تمہارا جتھا بڑھا دیا۔ اگر تم بھلائی کرو گے اپنا بھلا کرو گے اگر برائی کرو گے تو اپنا برا، اور جب دوسری بار کا وعدہ آیا کہ دشمن تمہارا منہ بگاڑیں اور مسجد میں داخل ہوں جیسے پہلی بار داخل ہوئے تھے اور جس چیز پر قابو پائیں تباہ و برباد کر دیں۔ قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم کر دے اگر تم پھر شرارت کرو گے تو ہم پھر تم پر عذاب کریں گے (بنی اسرائیل) تفسیر ابن کثیر وغیرہ نے اس پر اتنا اضافہ کیا کہ قدرت کا کیا ہوا یہ آخری وعدہ عذاب بھی پورا ہوا۔ اور زمانہ رسالت مآب میں بنی اسرائیل کی حد سے بڑھی ہوئی سرکشی نے ان کی عظمت وعروج کا آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب کر دیا اور ضربت علیہم الذلۃ والمسکنۃ کا ربانی طوق ان کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ قرآن کریم کے اس انداز بیان سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جس طرح ہم نے حضرت موسیٰ کو معراج عطا کی اور اس کے بعد پوری قوم بنی اسرائیل پر سیادت

وقیادت، مذہب وحکومت، دنیا وآخرت کی ہر شان وشوکت کا فتح یاب ہو گیا۔ اور خدائے بنی اسرائیل نے وعدہ فرمایا کہ تم جب تک ہمارے ارشادات پر عمل کرتے رہو گے ہم تمہاری زندگی کو پر بہار حیات آفریں کرتے رہیں گے۔

اسی طرح ہم اپنے عربی محبوب کو بھی معراج عطا فرما کر ایک بار پھر عرب کے بوریا نشینوں اور پوری قوم مسلم کو ساری کائنات کی زمام اختیار سونپ دیتے ہیں اور قیام دین وتاسیس قوانین نبوت اور اقامت عدل کا بار گراں پھر ایک بار ناتواں انسانوں کے کندھے پر رکھا جاتا ہے۔ ہاں صرف فرق اتنا ہے کہ بنی اسرائیل کی سرکشیوں پر ان سے اختیارات سلب کر لینے کی دھمکی دی گئی ہے اور یہاں انـه هـو السـميع البصير کہہ کر استحقاق نیابت کیا جاتا ہے اور واقعات دنیا میں بھی اس وقت بنی اسرائیلوں کا آفتاب عظمت ڈوب رہا تھا اور اس قوم کا مہر منیر بلند ہو رہا تھا۔ ان کی سربلندی کا پھریرا سرنگوں ہو رہا تھا اور ان کا پرچم ارجمند پوری طاقت سے لہرا رہا تھا۔ لیکن جہاں تک امر معراج کا تعلق ہے دونوں انبیا کی معراج ایک نوع کی ہے۔

﴿وآتينا موسىٰ﴾ معطوف على جملة ﴿سبحان الذى اسرى بعبده﴾ ومنا سبتها لما قبلها ان كلا متعلقة بعطايا نبي فالأول متعلقة بعطايا سيدنا محمد وهـذه متعلقة بعطايا موسىٰ عليهما السلام بجامع ان موسىٰ عليه السلام اعطى التـورـة بـمسيـره الـى الـطـور وهـو بـمنزلة معراجه ﷺ لانه منح ثمة التكلم وشرف باسم الكليم .

[حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین از شیخ احمد صاوی ۲/۳۳۹، دار احیاء التراث العربی]

حضرت موسیٰ علیہ کا تذکرہ بنی اسرائیل میں معراج محمدی کے بیان کے متصلا بعد ہی اس لیے ہے کہ ان دونوں ذکر میں پیش وجہ مشترک معراج ہی ہے کہ حضرت موسیٰ کا طور پر جانا اور احکام وفرامین جسے بشکل توراۃ مشرف ہونا اور خطاب کلیم سے مشرف ہونا معراج رسول عربی کی طرح ہی ہے۔

خواتیم سورہ بقرہ: اور پھر سب سے بڑھ کر معراج مقدس کا وہ تحفہ جسے سورۂ بقرہ کی آخری

آیتیں کہا جاتا ہے اور جس کی تعریف میں زبان نبوت نے بیش بہا موتی پروئے ہیں (مثلا انزل الیہ آیتین من کنوز الجنۃ) [الدر المنثور فی التفسیر الماثور، از امام جلال الدین سیوطی ۱۳۹/۲ دار الفکر] اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ معراج کی اس ضیا بار رات میں پیش گاہ قدرت سے آئندہ نظام وقیام کی باگ ڈور مسلمانوں کو عطا کی گئی اور ان آیتوں کی شکل میں نظام اسلام کے دستور کی اساس اور اسلامی اسٹیٹ کی قرارداد عطا کی گئی ہے۔ چناں چہ وہ آیتیں حسب ذیل ہیں۔

رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے پاس رب کے پاس سے اترا اور ایمان والے سب نے مانا اللہ اس کے فرشتوں اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے اور عرض کی ہم نے سنا اور مانا تیری معافی ہو اے ہمارے رب اور تیری ہی طرف پھرنا ہے۔ اللہ کسی جان پر بوجھ نہیں ڈالتا مگر اس کی طاقت بھر، اس کا فائدہ ہے جو کمایا اور اس کا نقصان ہے جو برائی کمائی۔ اے ہمارے رب ہمیں نہ پکڑ اگر ہم بھولیں یا چوکیں۔ اے ہمارے رب ہم پر بھاری بوجھ نہ رکھ جیسا تو نے ہم سے اگلوں پر رکھا۔ اور اے ہمارے رب ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی ہمیں سہار نہ ہو اور ہمیں معاف فرمادے اور بخش دے۔ اور ہم پر مہربانی کر تو ہمارا مولیٰ ہے اور تو کافروں پر ہمیں مدد دے۔ [سورہ بقرہ]

رسول اور تمام مسلمان خدا کے سارے احکام پر ایمان لائے اور سمعنا واطعنا کہا، آیت کے اس ٹکڑے میں اسلام کے اس بنیادی اصول کا اعلان کیا گیا ہے کہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو ہے اور بندے کا کام دل سے ماننا زبان سے اقرار کرنا اور جوارح سے عمل کرنا۔

انما ختم السورۃ بھاتین الآیتین لانھا بنیت فیہ فرض الصلوۃ والزکوۃ والصوم والحج والطلاق والایلاء والحیض والجھاد وقصص الانبیاء فناسب ان یذکر تصدیق المومنین والنبی بجمیع ذلک.

[حاشیۃ الصاوی علی تفسیر الجلالین، از شیخ احمد صاوی ۱۳۶/۱، دار احیاء التراث]

البحث عن احکام الافعال فی الوجوب والجواز والحظر أما القسم

الأول فمستفاد من العقل و الثاني مستفاد من السمع، والقسم الأول هو المراد بقوله (والمؤمنون كل آمن بالله) والقسم الثاني هو المراد بقوله ﴿قالوا سمعنا واطعنا﴾ افاد انه ليس في الوجود قول يجب الا قوله وليس في الوجود امر يقال في مقابلته اطعنا الا امره. [تفسیر کبیر ج ۷ ص: ۱۴۷]

اپنے قوانین فرائض اور احکام بیان فرماتے تھے، اس لیے یہ مناسب معلوم ہوا کہ بندوں کی پوزیشن کا اعلان کر دیا جائے کہ وہ سب ان کی تصدیق کرتے ہیں اور اس کے نفاذ کا وعدہ کر رہے ہیں۔ قوانین افعال، وجوب، جواز، اباحت ومنع کا علم شارع سے سن کر ہی ہو سکتا ہے اور سمعنا واطعنا سے اسی طرف اشارہ ہے اور یہ بتا رہا ہے کہ وجود میں کوئی بات قابل سماعت سوائے خدا کے نہیں اور امکان میں کوئی قانون ایسا نہیں جس کی اطاعت واجب ہو مگر خدا کا قانون۔

ہم پر مہربانی کر تو ہمارا مولیٰ ہے اور کافروں پر ہمیں مدد دے، سب نے مانا اللہ اس کے فرشتوں اور رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم کسی پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔

اگر خواتیم سورہ بقرہ کا گزشتہ ٹکڑہ اسلامی نظام کی داخلی قانونی اساس کی طرف ایک خفیف اشارہ کرتا ہے تو یہ دونوں ٹکڑے اس کی بیرونی پالیسی کو واضح کر رہے ہیں، کیوں کہ یہ اسلام کی عام خارجہ پالیسی ہی تو ہے کہ اسلام کا کلمہ بلند تمام ادیان پر غالب کیا جائے جیسا کہ ارشاد باری ہے:

﴿هو الذى ارسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله﴾

ليعليه على جنس الدين كله بنسخ ما كان حقا واظهار فساد ما كان باطلاً أو بتسليط المسلمين على أهله اذ ما من أهل دين الا و قد قهرهم المسلمون.

[التفسیر البیضاوی، از امام قاضی ناصر الدین بیضاوی، ۵/۲۰۸ دار الفکر]

خدا نے نبی عربی کو اس لیے مبعوث فرمایا کہ اسلام سے باہر تمام مذہبی کثرتوں کو مٹا کر ایک وحدت اسلامی بنا دے۔ وہ اس طرح کی باقی آسمانی مذاہب کے اختتام کی تاریخ بیان

کر دے اور باطل دینوں کی برائیوں کو عالم آشکارا بنا دے، یا اہل اسلام کا سیاسی و مذہبی غلبہ اہل باطل مذہب پر ہو جائے اور اسی امر کی طرف سورۂ بقرہ کا یہ اختتامی ٹکڑا بھی واضح اشارہ کرتا ہے۔

﴿وَارْحَمْنَا أَنتَ مَوْلَانَا فَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ﴾ باقامة الحجة والغلبة في قتالهم والمراد به عامة الكفرة. [التفسیر البیضاوی، از امام قاضی ناصر الدین بیضاوی ۱/۵۸۸ دار الفکر۔ تفسیر الجلالین ص ۴۲، مکتبہ الریاض الحدیثیہ]

اے ہمارے معبود تو ہمارا مولیٰ ہے ہم پر رحم فرما اور کافروں پر ہماری مدد فرما، مذہبی اور سیاسی ہر طرح کا غلبہ عطا فرما کر کسی خاص گروہ پر نہیں بلکہ عام کافروں اور ان کی ہر قسم پر۔

لیکن دیگر مذہب کے اس گروہ میں اہل کتاب کے ساتھ معاملے کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے کہ اسلام کسی گزشتہ منسوخ شدہ مذاہب کی تکذیب کرنے اور اس کو جھٹلانے نہیں آیا ہے بلکہ اس کی تصدیق گزشتہ رسولوں کا تو اردو صحیح اور اصل کتابوں پر ایمان اور ان کے ادھورے اور نا تمام کام کی تکمیل کے لیے مانا اللہ کو اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہتے ہوئے کہ ہم ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔

انہیں آیتوں میں اس اصول پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ انسان اپنے تمام اعمال میں جواب دہ درحقیقت خدائے وحدہ لاشریک کی بارگاہ میں ہے، اس لیے نہ صرف یہ کہ دانستہ کوتاہیوں اور اسلامی قوانین کی بالقصد مخالفتوں سے خدا کے حضور معافی کا طلب گار ہو بلکہ نادانستہ غلطیوں کے بارے میں بھی یہ کہے۔ اے ہمارے: رب ہمیں بھول چوک میں نہ پکڑ اور ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کی طاقت نہ ہو۔ خواتیم سورہ بقرہ سے متعلق بحث کو پھر ایک بار ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ آیتوں کے مختلف ٹکڑوں سے اسلامی اسٹیٹ کے بنیادی قانون کا پتہ چلتا ہے۔

خلاصہ: (۱) یہ کہ قانون سازی بندوں کا حق نہیں بلکہ یہ صرف امر الٰہی ہے او رسلمانوں کا کام پیروی کرنا اور برتنا ہے۔ جب ہی تو یہ کہا جاتا ہے کہ سب نے خدا کے احکام کی اطاعت کی گویا احکام کا اجراء امر الٰہی ہے اور بندوں کا کام اس کا نفاذ اور پابندی نیز اسلامی نظام

کے ساتھ مکمل وفاداری ہے۔

(۲) اس کی خارجہ پالیسی یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ تمام مذاہب کو ختم کر دیا جائے تا کہ دنیا میں صرف ایک عالمگیر اسلامی برادری رہ جائے جیسا کہ ﴿فانصرنا علی القوم الکافرین﴾ سے ظاہر ہے۔ ہاں اس سلسلہ میں غیر آسمانی مذاہب سے تو اسلام کا کوئی سمجھوتہ نہیں اور البتہ اس حد تک اتفاق ہے کہ ان کے رسولوں ان کی صحیح آسمانی کتابوں پر ہمارا بھی ایمان ہے (شریعت البتہ ان کی منسوخ ہے) جیسا کہ اللہ کے رسولوں، ان کی کتابوں پر ہم کو ایمان لانے سے ظاہر ہے۔

(۳) یہ کہ تمام افعال و اعمال میں جو ہر مسلمان اپنی زندگی میں کرتا ہے۔ جواب دہ خداوند قدوس کی بارگاہ میں ہے جیسا کہ اے رب بھول چوک میں ہم سے مواخذہ نہ کرنے سے ظاہر ہے۔

قرارداد مقاصد: پھر گزشتہ بحث سے اس امر پر بھی ایک اجمالی روشنی پڑتی ہے کہ اسلام کا مقصد دنیا میں ابدی صداقتوں کی تصدیق، الٰہی قوانین کا نفاذ و اجرا اور ساری کائنات کو ایک مرکز پر لانا اور صالح معاشرہ پیدا کرنا ہے، اور تاریخ معراج یہ بتاتی ہے کہ اس مقدس رات میں رسول اللہ کو جب یہ خواتیم بطور تحفہ عطا کیے گئے تو رسول عربی نے باقاعدہ اس کا اقرار کیا اور ملائکہ نے اس کی تصدیق کی۔ خود ذات احدیت نے قبول فرمایا:

در خبر است کہ حضرت رسالت پناہ ایں دعا در شب معراج می گفت و ملائکہ آمین می کردند و حق سبحانہ تعالیٰ اجابت می فرمود۔

[تفسیر حسینی، از ملا محمد حسین واعظ کاشفی ۱؍۵۴ مطبع احمدی کان پور]

ترجمہ: شب معراج میں حضرت رسالت پناہ نے خواتیم سورہ بقرہ کا اعادہ فرمایا اور ملائکہ نے آمین کہا اور خود ذات احدیت نے قبول فرمایا:

اس سے بخوبی اندازہ اس بات کا ہوتا ہے کہ خالق کائنات نے نظام عالم کی باگ ڈور نبی ﷺ کو سپرد کی اور ان سے نظام اسلامی کے قیام کا اقرار لیا۔ پس اس لحاظ سے بھی معراج محمدی

اسلامی سٹیٹ کے تاسیس کی تقریب ہے۔

نماز: یونہی نماز بھی ایک خالص عبادت ہے اور بندے وخدا کے درمیان ایک روحانی معاملہ ہے لیکن چوں کہ یہ بھی اسی شب معراج کا ایک تحفہ ہے اس لیے اس میں بھی بہت زیادہ سیاسی وانتظامی اسپرٹ موجود ہے اور اسی لیے تمام مذاہب کی عبادتوں کے برخلاف نماز میں جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے تا کہ دن میں ۵/مرتبہ ایک محلہ کے لوگ ایک جگہ جمع ہوں پھر ہفتہ میں ایک بار پورے شہر کا اجتماع ہو جہاں نہ صرف خدا کی خوشنودی کے لیے عبادت ہی ہو بلکہ مسلمانوں کے اجتماعی مسائل اور تنظیمی روح پر غور کیا جائے، ساتھ ہی ڈسپلن اور عسکریت کی عملی مشق بھی ہونی چاہیے۔

آخری بات: ہمارے مضمون سے کم از کم اتنا تو پتہ چل ہی گیا ہوگا کہ معراج محمدی ﷺ جہاں آپ کے منصب رفیع کی ایک زرین کڑی ہے وہیں خود عام مسلمانوں کے لیے بھی اس میں عمل کرنے کی بہت سی باتیں ہیں اور ہمارے رسول کا اس پاک رات میں یہ اعتراف (کہ خدایا ہم تیرے تمام فرامین کے ساتھ مکمل وفادار اور اس پر عمل کرنے والے ہیں اے ہمارے معبود ہم اس کا نفاذ کریں گے جو بھول چوک ہو معاف کرنا اے ہمارے معبود تمام عالم کو تیرا پیغام منوائیں گے تو ہماری مدد کرنا)

آج بھی پکار کر ہماری طرف سے کیے ہوئے اس عہد کی یاد دلاتا ہے اور ہم کو ہمارے اصلی کام کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

کمالات نبوت!

مسلمان کہلائے جانے والوں میں یہ بحث بار بار بڑے شد و مد کے ساتھ جاری رہی ہے کہ منصب نبوت کے مناسب کمالات کے علاوہ دیگر کمالات کا ذات رسالت میں پایا جانا شرعاً ثابت ہے یا نہیں اور کوئی دوسرا ان کمالات میں زیادہ سے بڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ جن احباب کے دماغ میں علم مصطفےٰ ﷺ سے متعلق ایمان کا کوئی گوشہ بھی محفوظ ہوگا وہ اس نزاعی مسئلہ سے بخوبی

واقف ہوں گے۔ ہم کسی ایسی بحث کے فیصلہ کرنے کا ارادہ تو نہیں رکھتے تاہم سیرت نبوی ﷺ کے چند ایسے واقعات ضرور سامنے رکھنا چاہتے ہیں جس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خالق کائنات اپنے حبیب ﷺ کو دنیاوی اور دینی ہر قسم کے کمالات سے سنوارتا ہے اور اس کی مشیت یہ نہیں چاہتی کہ کوئی دنیوی کمال میں بھی رسول عربی سے بڑھ جائے۔

[نسیم الریاض شرح شفائے قاضی ص ۳۸۳ میں ہے]

(۱) رکانہ ابن یزید القرشی کہتے ہیں کہ ہم اور رسول اللہ ابو طالب کی بکریوں میں تھے، مجھ سے رسول اللہ نے فرمایا: تم مجھ سے لڑو گے میں نے کہا تم سے؟ آپ نے فرمایا: ہاں اچھا میں تم کو پٹک دوں تو کیا دو گے، حضور نے فرمایا: ایک بکری، یہ سن کر لڑنے پر آمادہ ہو گیا کیوں کہ مجھے اپنی طاقت پر سارے عرب میں گھمنڈ تھا، چناں چہ ہم لڑے اور حضور نے مجھے چت کر دیا اور مجھ سے ایک بکری انعام کی لے لی، آپ نے فرمایا: پھر لڑو گے میں نے کہا جی ہاں، آپ نے پھر پچھاڑ دیا اور انعام کی دوسری بکری بھی لے لی۔ میں جب دھول جھاڑ کر اٹھا تو ادھر ادھر نگاہ دوڑا کر دیکھا کہ کہیں کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے ورنہ میری ساری دھاک ختم ہو جائے گی، اتنے میں حضور نے پھر فرمایا پھر لڑو گے میں نے کہا ہاں، سوچا کہ شاید اس دفعہ قسمت یاوری کرے لیکن آپ نے مجھے تیسری بار بھی زیر کر ہی لیا اور وعدہ کی ایک مزید بکری لے لی، آپ نے جب چوتھی بار اظہار آمادگی فرمایا تو میں نے عرض کی جی بس تین دفعہ کا تجربہ ہی کافی ہے، آگے کی ہمت نہیں، رسول اللہ نے جب مجھے زیادہ ملول دیکھا تو فرمایا: تمہاری بکریاں تو میں تمہیں دے ہی دیتا ہوں اس کا غم نہ کرو، چناں چہ آپ کی اس شہ زوری کا مجھ پر اتنا اثر تھا کہ جیسے ہی آپ نے اعلان رسالت کیا اور مجھے اطلاع ملی میں مسلمان ہو گیا۔

(۲)

سہیلی نے ذکر کیا ہے کہ ابوالاسد بن الجمحی جس کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ گائے کی کھال پر کھڑا ہو جاتا اور دس آدمیوں سے کہتا کہ اس کو کھینچ کر میرے قدموں کے نیچے سے نکال لو کھال ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی مگر ابوالاسد حرکت تک نہ کرتا۔ اس نے بھی جناب رسالت مآب کو

چیلنج دیا اور کہا کہ اگر آپ مجھے بچھاڑ دیں تو میں آپ پر ایمان لے آؤں گا آپ نے تین مرتبہ اسے زک دی لیکن وہ بدنصیب مسلمان نہ ہوا۔

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم

رجب المرجب کا پورا مہینہ اور خصوصیت کے ساتھ اس کی چھبیسویں تاریخ اہل اسلام کے لیے باعث مسرت اور سرمایۂ افتخار ہے، کیوں کہ اس ماہ کی ایک تاریک رات میں انسانیت عظمیٰ کا ستارہ اقبال مہر و ماہ کی بلندیوں سے بھی بلند ہو گیا تھا۔ اور اسی شب میں وکیاوی الصان کو اوج و شرف، عزت و بزرگی، رفعت اور مجد عطا کیا گیا۔ خدا کی وسیع زمین کی خلافت پرستاران توحید کے لیے ہے، اس کے اعلان کا بھی یہی وقت ہے۔ اور یہی وہ رات ہے جب شاہد ازل نے انسانیت کو شرف باریابی عطا فرمایا اور اسی شب میں اہل اسلام کا ناخدائے اعظم دنیٰ فتدلیٰ کے قرب اور ﴿فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ﴾ کی عنایتوں سے نوازا گیا اور اسی شب میں مسلمانوں کے لیے بھی تقرب الٰہی کی سبیل نکال دی گئی اور ان کے لیے ہر طاغوتی طاقت کے مقابلے میں فتح و نصرت کا وعدہ بھی کیا گیا، اس لیے اس مبارک تقریب کی یاد میں آج ہم جتنا بھی اظہار مسرت کریں کم ہے اور جس قدر بھی بہجت و سرور کا مظاہرہ کریں تھوڑا ہے۔ اور بڑے ہی مبارک ہیں وہ لوگ جو ان ایام میں اظہار مسرت کے لیے رجبی شریف کی مجلس طرب منعقد کرتے ہیں، مگر کونسی ایسی مجلس طرب ہوگی جہاں غم کی تلخیاں نہ ہوں، اور کون سی صہبائے عیش و مسرت ہوگی جو درد الم کی کدورت سے منزہ ہوگی، اور کون سا ایسا مسرور قلب ہوگا جو درد و تڑپ کی کار فرمائیوں سے خالی ہوگا۔ اسی لیے یہ پر مسرت رات بھی اپنے ساتھ کچھ تلخیاں لاتی ہے اور وہ تلخیاں ہیں روح مسرت کے فقدان کی۔ اور اندوہناکیاں ہیں خانہ ویرانی کی، اور پریشانیاں ہیں باب معراج میں خانہ جنگیوں کی جن سے ہر سال ہمارے زخم مندمل شدہ ہرے ہو جاتے ہیں۔

آپ ذرا اس وقت کا تصور کریں کہ رسول عربی فداہ ابی و امی صلی اللہ علیہ وسلم کی یاد معراج میں

آپ نے ایک مجلس طرب منعقد کی۔ اظہار تشکر کے طور پر تذکرۂ معراج کو لطف لے لے کر بیان کرنا شروع کیا کہ رجب کی اسی مقدس رات میں عالم بالا سے حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور سب سے پہلے آپ کے سینۂ اقدس کو چاک کیا۔ پھر دل نکال کر اسے نور ایمان سے منور کردیا، اتنے میں براق آیا جس پر سوار ہو کر آپ بیت المقدس تشریف لے گئے، وہاں سے آسمانوں کی سیر کی اور ہر فلک پر کسی نہ کسی پیغمبر سے ملاقات ہوئی تو ہر ایک نے حسب مراتب آپ کا خیر مقدم کیا۔ پھر آپ سماوات کی نیرنگیوں کو ملاحظہ فرماتے ہوئے وہاں پہونچ گئے جہاں سے عالم امکان کی سرحدیں ختم ہو جاتی ہیں اور پھر تو محبوب اور محب میں جو راز و نیاز ہوئے اسے تو وہی جانے جس نے وحی کی اور وہی سمجھے جس کی طرف وحی کی، ہاں اتنا البتہ معلوم ہوا کہ پیش گاہ الٰہی سے آپ کو تین عظیم الشان تحفے ملے ہیں (۱) سورہ بقرہ کی آخری آیتیں (۲) امت محمدیہ میں جو شخص شرک کی آلائشوں سے بچا رہے گا۔ اس کی نجات کا مژدہ (۳) پچاس وقت کی نمازیں جن کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے بار بار حضرت باری میں جا کر کم کرایا جو گھٹ کر صرف پانچ وقت کی رہ گئیں۔ مگر ثواب وہی پچاس وقت کا ہے۔ وہاں سے آپ نے جنت و دوزخ کی سیر کی اور بیت المقدس میں واپس تشریف لائے اور سارے انبیا کے مجمع میں یہ مرتبہ صرف آپ کو مرحمت ہوا کہ سب کی امامت آپ نے فرمائی اور ان کی سرداری کا حق ادا کیا۔ اس طرح دنیا نے دیکھا کہ وہ رسول ہاشمی جو زمانہ کے لحاظ سے سب سے آخر میں آیا تھا مرتبہ میں سب سے اول ہے۔ "هو الاول هو الآخر" پھر یہ سب اتنی جلدی ہوا کہ ماہ و انجم کے وہ چراغ جو سر شام جلائے گئے تھے ابھی جھلملانے بھی نہ پائے تھے۔ پھر اس سارے سفر میں اس محترم مہمان کے قدوم میں جو خاص اہتمام، عالم بالا کی مخصوص آرائش و تزئین اور ساری کائنات کا ایک عجیب عالم نور اور ملا اعلیٰ کی جلوہ ریزیاں ایک ایک کر کے آپ تفصیل سے بیان کر رہے تھے کہ ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا: یہ کیا بے سروپا باتیں ہیں، مکہ سے بیت المقدس تک ایک طویل مسافت، کیا ایک انسان اسے رات کے تھوڑے حصہ میں طے کر سکتا ہے۔ اسی طرح مادی انسان کا زمین سے بلند ہونا ہی محال ہے، اور اگر کوئی اوپر جائے بھی تو کیا زمہری کا

منجمد کرے اسے برف کا تودہ کیے بغیر دم لے گا؟ آگ کا آتشیں کرہ اس کے وجود کو پھونکے بغیر چھوڑ دے گا۔ اور ان سارے مقامات سے کوئی گزر بھی جائے تو آسمان جو نہ پھٹ سکتا ہے نہ جڑ سکتا ہے وہ اپنا سینہ چیر کر کس طرح آمد و رفت کے لیے راستہ بنا دے گا۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب فلسفۂ قدیم کے مقلد ہیں، اس لیے رسول عربی کی معراج کو بھی اسی عینک سے دیکھ رہے ہیں۔ دوسرے نے کہا آسمان پر جانا تو جب ہو کہ آسمان کا وجود بھی ہو، خدا سے ملنے کے لیے تو خدا بھی ہونا چاہیے۔ یہ قصہ اور مذاہب کے قصوں سے اخذ کر کے اپنے نبی کی عزت افزائی کے لیے ایجاد کیا گیا ہے۔ معلوم ہوا کہ یہ حضرت جدید فلسفیانہ خیالات کے امین ہیں۔ تیسری طرف خود اہل اسلام میں تاریخ معراج کے تعین کے متعلق غوغا۔ معراج کی تفصیلات میں اختلافات، کوئی معراج جسمانی کا قائل، دیدار الٰہی کا مقر، اور اس سارے واقعہ کو بیداری کا واقعہ کہنے والا، اور معراج کو روح اور جسم دونوں کے ساتھ تسلیم کرنے والا (یہی جمہور اہل اسلام کا مذہب حقہ ہے) کوئی سرے سے اس کا منکر کہ معراج جسمانی نہ تھی روحانی تھی۔ واقعہ بیداری کا نہ تھا خواب کا تھا، اور آں حضرت نے خدا کو نہ دیکھا جبریل کو دیکھا۔ مختصر یہ کہ چھوٹی چھوٹی جزئیات میں اختلاف و تضاد کی بھرمار ہے۔

اب آپ ہی بتائیے کہ اس مجلس طرب کی تلخیوں کا کیا حال ہوگا جہاں بات تو اظہار مسرت کے لیے شروع ہوئی تھی مگر اختلاف و تضاد کی ایک وسیع معرکہ آرائی شروع ہو گئی اور جذبات مسرت کی جگہ تلخیوں نے لے لی۔ اس طرح ساری محفل کا مزا کرکرا ہو گیا۔

قرآن کہتا ہے کہ ہاں ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ تاکہ اہل تسلیم منکروں سے ممتاز ہو جائیں، اور خدا نے اس واقعۂ معراج کو لوگوں کے لیے آزمائش گاہ بنا دیا تاکہ لوگوں کی قوت ایمانی کو اس سے پرکھا جائے۔ چناں چہ آج ساڑھے تیرہ سو برس گزر گئے مگر قرآنی صداقت اپنی پوری قوت سے جلوہ گر ہے۔ اس موضوع پر کتنی کتابیں تصنیف ہوئیں اور خدا ہی جانے ہر سال کس قدر مجلسیں منعقد ہوتی ہیں مگر مصنف اور ہر مقرر کا مرکز خیال وہی اختلافات ہوتے ہیں جن میں وہ اپنی سمجھ کے موافق کسی کی تائید اور کسی کی تردید کرتا ہے، اور یہ واقعہ اب تک لوگوں کے لیے

آزمائش گاہ بنا ہوا ہے۔

مگر غالباً اس سے کسی کو انکار نہ ہوگا کہ نبی امی ﷺ کے اس سفر شبانہ سے جو احکام وہدایات اہل اسلام کے لیے حاصل ہوتی ہیں وہ یقیناً فلاح وسعادت کا سرچشمہ ہیں، اس لیے ہم انہیں پر روشنی ڈالیں گے کیوں کہ آج مسلمانوں کو سب سے زیادہ انہیں کی ضرورت ہے اور حقیقی معنوں میں اس جشن مسرت میں حصہ لینے والا بھی وہی ہوسکتا ہے جو صحیح معنوں میں اس رات کے پیغام عمل پر گامزن ہو۔ ہم نے مانا کہ یہ رات مسرتوں سے لبریز رات ہے مگر ان کو اظہار مسرت کا کیا حق ہے جو اس شب کی تعلیمی روح کو بھول بیٹھے ہیں، اور یہ واقعہ مسلمانوں کے لیے یقیناً باعث عبرت ہے، مگر ان کو کیا جو خصوصیت اسلام کو پس پشت ڈال رہے ہیں۔ کاش مسلمان یہ سمجھتے کہ اس مقدس رات میں ہمارے لیے بھی کوئی پیغام عمل ہے اور اس نورانی سفر میں ہمارے لیے بھی تعلیم وہدایت کا نور ہے۔

آہ! یہی تو وہ شب تھی جس میں اللہ نے مسلمانوں پر نماز فرض کی جس کے لیے حدیث میں آیا "الصلوۃ معراج المؤمنین" یعنی نبی اسلام کو اللہ نے اپنے حریم قدس میں بلاکر شرف باریابی عنایت کیا اور قرب کی لذتوں سے نوازا، تو ہر مسلمان کے لیے بھی قرب کی نعمت رسول اللہ کے صدقے میں دن میں پانچ مرتبہ ارمغان کردی گئی ہے، مگر آج کتنے مسلمان ہیں جو معبود کی اس عنایت سے فائدہ حاصل کررہے ہیں؟ افسوس کہ ہمارا رب تو ہم کو پیار سے بلائے، مگر ہم اس سے نفرت کرتے ہیں وہ ہمیں بلاتا ہے تو ہم اس سے بھاگتے ہیں، اور وہ ہم سے تعلق جوڑتا ہے تو ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں، اس لیے ہم ذلیل ہورہے ہیں اور تباہ وبرباد کیے جارہے ہیں۔ ہماری ہوا خیزی بھی ہورہی ہے اور افلاس ونکبت میں بھی ہم ہی گرفتار ہیں اور ہمارے جرموں کی سزا بھی یہی ہونی چاہیے تھی۔ خالق عادل دن میں ۵؍مرتبہ پیار سے بلائے۔ اور ہم کانوں میں انگلی ڈال لیں۔ پھر ہم کس امید پر آسمان کے تلے خرسند ہونا چاہتے ہیں۔ وہ معبود اپنی بارگاہ میں باریابی کا موقع بار بار عنایت کرے اور ہم منہ پھیر کر دوسروں کے در پر نیاز مندی بجالائیں۔ پھر کس زمین کے سینہ پر ہم آسودہ ہونا چاہتے ہیں، وہ تو ہم سے ہر آن تعلق

جوڑتا ہے مگر ہم اس سے قطع تعلق کرتے ہیں، پھر کس لیے گردش زمانہ ہمارے لیے سازگار ہوگی۔
خدا کے ساتھ بے وفائی کر کے ہم اس کی بادشاہت میں کس طرح چین سے رہ سکتے ہیں۔

اور یہی تو وہ رات تھی جس میں ہم کو پیغمبر اسلام کے ذریعہ تعلیم دی گئی تھی کہ ہم رات کی تنہائی میں، دن کے مجمعوں میں، خلوت میں، جلوت میں، جہاں کہیں ہوں اور جس حال میں ہوں اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا کریں۔

"اے ہمارے رب! تو ہمیں ہماری بھول چوک کے بدلے مت پکڑنا اور اے ہمارے آقا ہم پر احکام و شرائع کے وزنی بوجھ مت لاد دینا جس کو تو نے گزشتہ امتوں پر ڈالا تھا۔ اے ہمارے معبود! ہم کو ہماری طاقت سے زیادہ بوجھل نہ کرنا، اے مولا تو ہمیں معاف فرمادے۔ ہمیں باطل پر فتح عنایت فرما"۔ [آخر سورۂ بقرہ]

مگر افسوس کہ ہم اپنی نادانستہ گناہوں کی معافی کیا مانگتے کہ جان بوجھ کر بھی جو گناہ کرتے ہیں اس کی خاطر ایک لمحہ کے لیے بھی ہمارے چہرے اشک ندامت سے آلودہ نہیں ہوتے اور ہم اس کے احکام میں آسانی اور نرمی کی گزارش کیا کرتے سرے سے اس کی بندگی و محکومی سے ہی آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ ہماری گردنیں دنیا کی ہر معمولی سے معمولی چیز کے سامنے جھک سکتی ہیں۔ مگر خدائے ذوالجلال کے سامنے گردن جھکانا اور اس کا مطیع و فرمانبردار ہونا۔ برداشت نہیں اور اس سے اپنی فتح و نصرت کے لیے دعا کیا مانگتے کہ غلامانہ نظام زندگی ہمیں پسند ہے۔ کہ تم مجھ سے معافی مانگو میں تمہیں معاف کردوں گا۔ کارزار حیات میں آسانی طلب کرو میں دوں گا، اور مجھ سے فتح و ظفر مانگو میں عنایت کروں گا۔ مگر ہم سعادت پر شقاوت، نیکی پر مجرمیت، سبک روی پر گراں باریت، اور حاکیت پر محکومیت کو پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں۔ پھر ہمیں اپنی تباہی کا شکوہ کیوں؟ اپنے انتشار کی شکایت کس لیے؟ اور اپنی بے کسی اور کس مپرسی کا ماتم عبث ہے۔ تم اپنے بدن میں چرکے اپنے ہی ہاتھوں سے لگاتے ہو، اور پھر لوگوں کو اپنا خون آلودہ جسم بھی دکھاتے ہو۔ اپنے گریبانوں کی دھجیاں خود ہی تارتار کرتے ہو۔ پھر اوروں کے شکوہ سنج بھی ہو؟ اور تلخی حیات کی طرف بے تابانہ دوڑتے ہو پھر مصیبت سے گھبراتے بھی ہو؟ یاد رکھو۔

"غود کردہ را علاج نیست"۔

اور یہی تو وہ رات تھی جس میں ہم سے کہا گیا تھا کہ تم اعلان کردو کہ ہم اللہ اور اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں، کوئی تفریق نہیں کرتے کہ ایک کو تو مانیں اور دوسروں سے انکار کردیں، اور یہ عدم تفریق اس لیے ہے کہ اللہ کے تمام رسول ایک ہی دین کے داعی تھے۔

آہ! ہم سے کہا گیا تھا کہ ہم رسولوں اور کتابوں پر ایمان لانے میں تفریق نہ کریں تا کہ یہودی اور عیسائیوں کی گروہ بندیوں کا خاتمہ ہوجائے اور تمام آسمانی مذاہب کی خانہ جنگیاں دور ہوجائیں اور ابدی اتحاد و یگانگت پیدا ہوجائے۔ مگر ہم مختلف آسمانی مذاہب کو باہم کیا ملاتے کہ آپس میں ہی تفریق اور تشدد کی آگ کو ہوا دے رہے ہیں۔ اور ریگ زار حجاز سے نکلے ہوئے صاف وشفاف چشمہ ہدایت کو گندلا کرنا ہی ہمارا شبانہ روز کا مشغلہ رہ گیا ہے۔ ہر روز ایک نیا مذہب، اور ہر آن ایک نئی بات۔ ابھی ایک فتنے سے مہلت بھی نہیں ملنے پائی کہ دوسری بلا سر پر آموجود ہوتی ہے، جن سے اسلام کی بنیاد متزلزل ہوگئی اور ملت بیضا کا شیرازہ بکھر گیا، نظام اسلام کا فرض ہے کہ اپنے گریباں میں منھ ڈال کر دیکھیں۔

انجام سے غافل نادانو! مانو کہ نہ مانو تم جانو
اک ہلکی حقیقت ہے کہ تمہیں اقبال سخنور جاتا ہے

مولود میں ماتم

بات آج کل کی نہیں دسیوں صدی پہلے کی ہے اور ذکر کسی خاص جماعت کا نہیں پوری کائنات کا ہے جب کہ اس عالم کی ریت ہی نرالی تھی ایسا نہیں کہ آفتاب نہ طلوع ہوتا تھا۔ آفتاب چمکتا ضرور تھا لیکن اس کی ایک ایک کرن دنیا والوں سے اپنی مجبور خدائی کی شکایت کرتی تھی۔ اس وقت کی راتیں بے نور نہ تھیں لیکن چادر شہاب ہر شب گھناؤنے تقدس اور مکروہ سجدوں سے آلودہ کی جاتی تھی، ہوا باغ و راغ میں مستانہ خرامی ضرور کرتی تھی لیکن اشرف المخلوقات سے خراج

الوہیت وصول کرنے کے لیے، اور ندیاں نالے ترنم ریز ضرور ہوتے تھے لیکن نذرانہ عقیدت قبول کرنے کے لیے۔ مختصر یہ کہ گل کدۂ عالم آج ہی کی طرح سرسبز و شاداب ضرور تھا لیکن صرف دیدہ ور نہ تھا جو کلیوں کی سرگوشیوں کو سن سکے، چشمے کا ترنم سمجھ سکے گلوں کا تبسم پڑھ سکے، چادر مہتاب کی دعوت نظر قبول کرے اور آفتاب کی کرنوں سے کھیل سکے، یا نسیم صبح کی مستانہ روی کی داد دے سکے، اور ساری کائنات ایک دیدہ ور کا سوگ منا رہی تھی۔ ایک نگاہ نکتہ رس کو ترس رہی تھی۔ ادھر سارے عالم کی خدائی تقسیم کرنے والا انسان خود اپنی بنی نوع کو امن نہ دے سکتا تھا، روح کو شانتی نہ عطا کرتا تھا، اور دن بدن قتل و غارت گری، فسق و فجور، ظلم و عصیاں بڑھتا ہی رہا زور پکڑتا ہی رہا، یونہی صدیاں گزر گئیں، نرگس اپنی بے نوری پر روتی رہی، پھول دامن پھاڑتا رہا، کلیاں کراہتی رہیں، ہوا چنگھاڑیں مارتی رہی، مظلوموں کے نالے بلند ہوتے رہے، بیواؤں کا درد جگر پھیلتا ہی رہا، یتیموں کے آنسو ریت میں جذب ہوتے رہے اور روح کی بے قراری بڑھتی رہی کہ ایک مقدس رات میں کائنات ایک نشاط انگیز انگڑائی لے کر بیدار ہوگئی اور جب صبح کی سپیدی نمودار ہوئی تو سورج انہیں ہنس رہا تھا اور صبح کی ہوا آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھی۔

خراباتیاں مے پرستی کنید
محمد بگوئید و مستی کنید

اور ایسا معلوم ہوا کہ جیسے کسی نے ترستی دنیا کے لاتعداد ناسوروں پر بیک جنبش نگہ مرہم سا رکھ دیا۔ نرگس کا رونا ختم گیا، پھول قہقہہ بھرنے لگا، کلی مسکرانے لگی، مظلوموں کے نالے کم ہوگئے اور روح کی بے قراری کو قرار آگیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن پوری چودہ صدیاں انسانیت کے سر پر سے گزر گئیں لیکن سال میں جب بھی ربیع الاول کا مہینہ آتا ہے ساری کائنات میں مسرت کی لہر دوڑ جاتی ہے، ستاروں کے مدھم چراغ روشن کردیئے جاتے ہیں، چاند مسکراتا ہے اور عالم بالا بقعہ نور بن جاتا ہے، بلبل پھول سے، قمر سرو سے، ابر قطروں سے، قطرے دریا سے، دریا جانور سے، جانور صحرا سے، صحرا پہاڑوں سے، پہاڑ سمندروں سے، سمندر ہواؤں سے اور ہوائیں انسانوں سے گلے مل کر اپنے نجات دہندہ باعث ایجاد عالم محمد رسول اللہ ﷺ کے میلاد

سعید کے مژدہ روح پرور سناتی ہے اور انسانوں کو تو مت پوچھو جلسے ہوتے ہیں، جلوس نکلتے ہیں اور مسلمان مختلف طریقوں سے اپنے اس قومی دن کی یادگار مناتے ہیں، گویا ساری خدائی مل کر یہ ثابت کر دیتی ہے۔

ایک چراغیست دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگرم انجمنے ساختہ اند

لیکن میں اپنے دل کی پریشانی کے المناکیوں کو کیا کہوں کہ یہ سب ہنگامہائے مسرت مجھے اور سوگوار کر دیتے ہیں اور اس ہنگام سعید کی یاد کی ایک ایک کھٹک اور تیز ہو جاتی ہے درد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور کراہیں بڑھ جاتی ہیں، نالے وحشت ناک ہو جاتے ہیں اور میں چاہنے لگتا ہوں کہ رب کائنات میرا درد دل تھوڑا تھوڑا دنیا کے سارے مسلمانوں کے دل میں ڈال دے اور پھر وہ سب مل کر میرے ساتھ چیخنے لگیں اور یہ ہنگامۂ آہ وفغاں اس وقت بند ہو جب کہ خواب غفلت کے متوالے انسانوں کی آنکھیں کھل جائیں، یا پھر یہ دنیا پارہ پارہ ہو جائے، کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ جب وہ نجات دہندہ کائنات میں جلوہ فرما ہوا تھا تو بے گناہ بچیوں کی زندہ درگوری سے انسانیت کا دامن داغدار تھا مگر اس دست مظلوم نواز نے اس مکروہ رسم کو قطعاً بند کر دیا اور اپنے ماننے والوں کے دل میں وہ سوز و گداز بھر دیا کہ ان کا آبلۂ دل ہر مظلوم کے درد پر ٹپک پڑتا تھا۔

ایک دفعہ بارگاہ نبوی میں لوگوں نے عاصم بن قیس سے زندہ درگور کی ہوئی بچیوں کا قصہ پوچھا وہ کہنے لگے، میں نے اپنی ایک بچی بھی زندہ نہ چھوڑی سب کو دفن کر دیا، لیکن ایک کی یاد اب تک میرے دل سے نہ گئی، وہ بچی جب میں سفر میں تھا تو پیدا ہوئی، اسے میری بی بی نے میرے خوف سے اپنی بہن کے پاس بھجوا دیا۔ واپسی پر میں نے حمل کے بارے میں پوچھا تو بہانہ بنا دیا کہ میرے بچہ پیدا ہوا تھا لیکن مر گیا۔ ایک دفعہ میں نے اپنی بیوی کے پاس انتہائی خوبصورت لڑکی دیکھی جسے میری بیوی سنوار رہی تھی، میں نے اس کے بارے میں پوچھا وہ رونے لگی اور کہا کہ تمہاری ہی بچی ہے، میں نے تو اس دن کچھ نہ کہا لیکن ایک دن مہلت پا کر اس لڑکی کو اٹھا لے گیا، ایک گڑھا کھود کر بچی کو اس میں ڈال دیا اوپر سے مٹی چھوڑنے لگا وہ اپنی زبان

سے کہہ رہی تھی۔ ابا جان تمہیں خدا کی قسم بتاؤ تو میرے ساتھ یہ کیا کر رہے ہو، کیا تم مجھے مٹی میں ڈھک دو گے، کیا مجھے تنہا چھوڑ کر چلے جاؤ گے اور میں مٹی ڈالتا رہا یہاں تک کہ اسی کی آواز موقوف ہوگئی۔ اس وقت مجلس کا یہ عالم تھا کہ ساون بھادوں آنکھوں سے برس رہا تھا اور رسول اللہ ﷺ فرمارہے تھے کہ

"ان ھذہ لقسوۃ من لا یرحم لا یرحم".

یہ تو بڑی سنگ دلی ہے جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا، کتنا سوز و گداز پیدا کر دیا تھا نبی مکرم نے اپنے ماننے والوں میں، لیکن آج آپ کے ہی ماننے والوں میں وہ مکروہ رسم چولا بدل کر پھر زندہ ہورہی ہے۔ ڈیڑھ سال کا ذکر ہے، ایک شخص کی یتیم بچی کو میعادی بخار ہوا اس کے چچا اور چچی جن کے تربیت میں وہ تھی اور جو اس کے مجازی باپ تھے اس کی تیمارداری اور علاج کیا کرتے۔ اسے گھر کے غیر محفوظ حصہ میں ڈال دیا اور خود عیش کی میٹھی نیند میں غرق ہوگئے، رات میں گیدڑ آیا جس نے مجبور اور لاچار بچی کو کاٹنا اور بھنبھوڑنا شروع کیا، جب اس کی چیخیں بلند ہوئیں تو یہ لوگ بیدار ہو کر اس گیدڑ کو ہانک آئے اور بس، یہاں تک کہ پھر دوسری رات وہی گیدڑ آیا اور اس نے پھر نوچنا شروع کیا، تو چتا رہا اور اس بے گناہ کی جان قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ (واقعہ اس وقت کا ہے جب والد مکرم تلشی پور گونڈہ میں تھے) یہ ہیں رحمت للعلمین کے رحیم امت کے کارنامے، اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو بھی اپنے آس پاس سیکڑوں ماں باپ ایسے ہی ملیں گے جو رات دن معنوی اولاد کشی میں مصروف ہیں۔

یونہی رسول اللہ ﷺ نے جب اپنی نورانی تعلیم پھیلانی شروع کی تو سارا عرب شراب میں غرق اور بدمست تھا لیکن تھوڑے ہی دنوں کے بعد ایسی کایا پلٹ ہوگئی کہ ایک دن جب مدینہ میں منادیٔ رسول یہ آواز دیتا ہے لقد حرمت الخمر "لوگو! شراب حرام کردی گئی۔ تو اسی دم ہاتھوں میں اٹھے ہوئے جام توڑ دیے گئے، لب سے لگے ہوئے پیالے پٹک دیے گئے اور شراب کا چلتا ہوا دور ختم کیا، اور اس دن اس کثرت سے شراب کے مٹکے توڑے گئے کہ خیال ہوتا شاید آج مدینہ میں شراب کی ہی بارش ہوئی ہے۔ مگر آج وہ مسلمان جن کی صدیاں اسلام کی

آغوش میں گزر گئی ہیں، اور جن کی رگوں میں مسلمان ماں باپ کا خون دوڑ رہا ہے وہ آج اس دھڑلے سے شراب اور منشیات استعمال کرتے ہیں گویا اسلام نے اس کا حکم دے دیا ہے۔ معاذ اللہ ایک قصبہ کی آبادی تقریباً ۲۰ ہزار مسلمانوں پر مشتمل ہے جہاں ہر سال لاکھوں کا شراب کا ٹھیکہ ہوتا ہے جس سے پیاسے مسلمان سیراب ہوتے ہیں تو دوسری جگہ کے بارے میں سننے میں آیا ہے کہ وہاں کے زاہدان مرتاض ماہ صیام میں اس آتشی سیال سے روزہ افطار کرتے ہیں۔ بعض جگہوں کے بارے میں خبر ہے کہ وہاں عورتیں جب تک تاڑی نوشی نہ کرلیں دن کے کام کا خمار نہیں اترتا اور اگر تلاش کی جائے تو پورے ہندوستان کے ہر شہر قصبے اور دیہات میں ان گنت مسلمان ایسے ملیں گے جو بڑی بے تکلفی سے روز منھ کا مزہ بدلتے ہیں۔

اسی طرح مصلح اعظم ﷺ نے لعنت زنا سے عالم انسانیت کو کما ینبغی پاک کر دیا تھا اور اعتراف جرم کا جذبہ اتنا زیادہ اجاگر کر دیا تھا کہ اگر کبھی کبھار کسی سے یہ جرم سرزد ہو گیا تو اس نے اپنی ذات کو اسلامی قانون، احتساب کے سامنے پیش کر دیا۔

یارسول اللہ انی زنیت

حضور میں مجرم ہوں مجھ پر اسلامی قانون نافذ فرمایئے، حضور نے منھ پھیر لیا، تو دوسری طرف جا کر یہی کہا اور اس وقت تک کہتے رہے جب تک کہ رجم کے لیے ہاتھ میں پتھر نہ اٹھا لیے گئے۔ آج افسوس کہ صبح و شام قرآن عظیم کی تلاوت کرنے والے ساری رنگینئ حیات کا نشیمن بالا خانوں اور اسی ننگ انسانیت فعل کو سمجھتے ہیں اور جب اس آفتاب ہدایت نے جزیرۂ عرب کو اپنی نورانی کرنوں سے منور کیا تھا۔ جنگ جو عرب صلح و اتفاق کی دولت سے مالا مال ہو گئے تھے اور جن کو کسی کی سخت بات سننا ناگوار تھی بے حد نرم دل ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ ربیعہ اسلمی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں بات چیت ہونے لگی، کوئی سخت کلمہ حضرت ابوبکر کی زبان سے نکل گیا اور ربیعہ اسلمی کو ناگوار گزرا۔ حضرت ابوبکر فرمانے لگے تم مجھے بھی اس قسم کا کلمہ کہو تاکہ بدلہ پورا ہو جائے، حضرت ربیعہ نے انکار کیا تو حضرت ابوبکر رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں شکایت لے گئے کہ ربیعہ میری سخت کلامی کا بدلہ مجھ سے نہیں لیتے،

آپ ان سے بدلہ لینے کے لیے کہہ دیجیے، حضور نے معاملہ دریافت کرنے کے بعد فرمایا: اگر ربیعہ بدلہ نہیں لیتے تو انہوں نے تمہاری زیادتی معاف کردی۔ لیکن افسوس ہے کہ آج ایک مسلمان بھائی کا بنا دوسرے کو گوارا نہیں ہے۔ اور ایک کو کھاتے پیتے دوسرا نہیں دیکھ سکتا اور ہر معاملہ میں ہر شخص اپنے کو حق پر ہی سمجھتا ہے۔ چاہے کتنا ہی ظلم کر رہا ہو۔

الغرض! کہاں تک ایک ایک زخم کا ماتم کیا جائے، ملت اسلامیہ کا پورا جسم ایسے بے شمار زخموں سے پامال ہو گیا ہے اور بڑا الم تو یہ ہے کہ اس کا یہ حال اپنوں نے کیا ہے اسلام کو یہ دھچکا مسلمانوں کی طرف سے پہونچا ہے۔

ہر کس از دست غیر نالہ کند　　　　سعدی از دست خویشتن فریاد

ایسے وقت میں میں یہ سوچتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے جلسے اور جلوس کرنے والا مسلمان، حضور کی بڑائی کا دنیا کے سامنے گن گانے والا مسلمان۔ کاش کہ اس کا دل بھی اس کی زبان کی طرح مسلمان ہوتا، یہ جن کی زبانیں محمد رسول اللہ کی عفت و پارسائی کی توصیف میں نہیں تھکتیں خود بھی پارسا ہوئے، سرور عالم کی امانت و دیانت کا طویل خطبہ پڑھنے والے خود بھی امین و پارسا ہوتے جو نبی عربی کی خوش معاملگی و وعدہ وفائی کے سامنے ساری دنیا کو چیلنج کرتے ہیں خود بھی ان کے نقش قدم پر چلتے، جو رحمۃ للعلمین کی خوش کلامی و نرمی، رحمت و رافت کا بڑا بڑا قصیدہ پڑھتے ہیں یک شمہ خوش کلام و نرم دل اور رحیم ہو جاتے۔ مختصر یہ کہ جو اسلام کے ایک گلدستہ کی صورت، ایک حسین کھلونے کی طرح دور سے ہی تعریف کرتے ہیں اور پاس جاتے ڈرتے ہیں کہ رنگ و نور کا مرقع جمیل ہاتھ لگاتے ہی کہیں پگھل نہ جائے۔ اسلام کو اپنی زندگی میں برتتے۔

نماز کیا ہے؟

ایک سنجیدہ تقریر کا خلاصہ

اللہ تعالیٰ نے ہماری دنیاوی واخروی صلاح وفلاح کے لیے جو عبادتیں فرض کی ہیں ان میں سب سے زیادہ اہمیت نماز کو حاصل ہے، اسی لیے قرآن مجید اس کا تذکرہ بار بار کررہا ہے اور پڑھنے کی تلقین کررہا ہے۔ درحقیقت نماز ایک ایسی بلند وبالا عبادت ہے جس کے مرتبہ کو کوئی عبادت خواہ فرض ہی کیوں نہ ہو نہیں پہونچ سکتی۔ نماز کی ادائے گی بندے اور خدا کے درمیان رشتہ عبدیت کو استحکام بخشتی ہے اور بندے کو دینی دنیاوی دونوں نعمتوں سے مالا مال کرتی ہے۔

افسوس صد افسوس! آج کا مسلمان مذہب وملت سے اتنا بیزار اور دور ہو چکا ہے کہ مسجدیں ویران نظر آتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اوقات نماز میں مسجدیں نمازیوں سے کھچا کھچ بھری رہتی تھیں۔ بدقسمتی سے اس زمانہ میں تو یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ نماز کی ادائے گی صرف بڈھے، لاچار، کمزور، غریب ونادار یا صرف مولویوں ملاؤں کے ذمہ ہے۔ مسلمانو! یادرکھو مسلمان ہونے کے ناتے قانون خداوندی کے پابند رہو، ورنہ احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی کر کے کبھی بھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

معنی نماز: لفظ نماز فارسی ہے اس کے معنی خدا کی عبادت کرنے کے ہیں۔ لیکن عربی اور قرآنی لفظ ''صلوۃ'' ہے جو چند معنوں پر مشتمل ہے۔

(۱) کسی ٹیڑھی لکڑی کو گرم کر کے سیدھا کرنا۔ (۲) تعلق اور ربط پیدا کرنا۔ (۳) تعظیم وادب اور دعا کرنا۔ (۴) عاجزی ومسکنت۔ (۵) رحمت۔

چوں کہ نماز انسان کی تمام کجیاں، اخلاقی رذائل، روحانی کثافت اور دیگر عملی وعلمی

کجیوں، کمزوریوں کو دور کر کے اسے منشائے فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل بنا دیتی ہے۔ اسی لیے نماز کو صلوۃ کہتے ہیں یعنی جب مسلمان نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو دنیاوی مشاغل سے دستبردار ہو کر ذوق و شوق کے ساتھ نماز پڑھتا ہے۔ اگر خداوندی کرتا ہے۔ اس کے مفہوم کو سمجھتا ہے۔ اس پر عمل پیرا ہوتا ہے، خداوند قدوس کی عظمت و جلال پر غور کرتا ہے۔ اور اپنی عبودیت کا شاندار مظاہرہ کرتا ہے تو اس کے دل کی کجی دور ہو جاتی ہے۔ اگر خدا کی حرارت سے دل میں سوز و گداز پید ہو جاتا ہے۔ عشق الٰہی کی آگ غیر اللہ کے خس و خاشاک کو جلا کر نیست و نابود کر دیتی ہے۔ نمازی کا خبیث و سرکش نفس راہ راست پر آ جاتا ہے اور نمازی کے اندر بدی سے بچنے اور نیکی قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنی تمام برائیوں، ظلم و ستم، نخوت و غرور، شر و فساد، کذب و نفاق اور بد عہدی و بے وفائی وغیرہ سے پاک ہو جاتا ہے، نماز کو صلوۃ اس لیے کہتے ہیں کہ نماز سے بندے اور مالک کے درمیان ایسا خاص تعلق اور رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جو کسی دوسری عبادت سے نہیں پیدا نہیں ہوتا۔ دنیا کا قانون ہے: ہر محکوم اپنے حاکم کا تابع و فرماں بردار ہوتا ہے تو ان کے درمیان ایک خاص رابطہ پیدا ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے حاکم اپنے محکوم پر احسانات کرتا ہے پھر حاکم حقیقی جس سے ہمارا تعلق نماز کے ذریعہ قائم ہوتا ہے اس سے ہماری فرماں برداری کا ثبوت ملتا ہے تو اللہ کس قدر ہم پر احسانات فرمائے گا لیکن یہ تعلق اس وقت پیدا ہوتا ہے جب نماز نماز کے طریقہ سے ادا کی جائے۔

نماز حقیقت میں شہنشاہ حقیقی کے دربار کی حاضری، اس کی تمجید و تقدیس، تسبیح و تہلیل، دعا اور اس کے تقرب کا ایک انوکھا ذریعہ ہے۔ نماز میں خداوند قدوس کی عظمت و جلال، ربوبیت و معبودیت کا اقرار اور اپنی عاجزی و بے چارگی کا بندہ اظہار کرتا ہے اور اپنی حاجات و تمناؤں کو مخصوص طریقے سے عرض کرتا ہے، اگر نماز کے ارکان و شرائط پر غور کریں تو خود بخود واضح ہو جائے گا کہ دعا تعظیم، ادب و اخلاص، اللہ کے جلال و ہیبت اور بندے کے اظہار عجز و انکساری جیسی شان نماز میں پائی جاتی ہے۔ جو دیگر طریق عبادت میں نہیں پائی جاتی ہے۔ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے وہ اللہ کی حمد و ثنا ہوتی ہے یا بندے کی عاجزی و انکساری ہوتی ہے۔ بندہ جب رات

دن میں پانچ وقت پاک وصاف ہوکر بارگاہ احدیت میں باادب ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے آقا کی رفعت وبلندی اور اپنی بے چارگی ولا چاری کا تصور اپنے دل میں قائم کر لیتا ہے، اس کا مفہوم صرف اور صرف یہی ہوتا ہے کہ بندہ سراسر مجرم وگنہگار ہے، وہ معافی جرائم کے واسطے آقا کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوا ہے اور اس کے کرم کا امیدوار ہے، ہاتھ باندھنے کے بعد مالک ومولیٰ کی حمد وثنا اور پاکی بیان کرتا ہے تاکہ اس کا مالک خوش ہوجائے، اس کے بعد بندہ اپنے گناہوں سے شرمسار ہوکر مالک کے سامنے جھک جاتا ہے اور آقا کی بزرگی کا اقرار کرتا ہے، پھر مجرمانہ صورت میں دوبارہ کھڑا ہوجاتا ہے اور کھڑے ہوتے ہی ہیبت حق سے مرعوب ہوکر سجدہ میں گر جاتا ہے اور اپنے مالک کی رفعت وبلندی کا شاندار الفاظ میں اظہار کرتا ہے۔

نماز باعث لطافت روح ہے: روح ایک لطیف وپاکیزہ شے ہے اس میں کدورت پیدا ہونے سے مقصد حیات فوت ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ خدا کے ذکر سے غافل ہونے سے روح کثیف ہوجاتی ہے۔ جب اللہ نے روح کو قالب میں ڈالا تو اس کی کثافت سے مامون ومحفوظ رکھنے کے لیے کچھ نگراں بھی مقرر فرمائے ہیں اور وہ نگراں ارکان اسلام نماز، روزہ ،حج، زکوٰۃ وغیرہ ہیں یہ نگراں روح کے اندر گندگی نہیں پیدا ہونے دیتے نیز اس کو اس کے فرائض سے بھی غافل نہیں ہونے دیتے، چناں چہ نماز بھی ایک نگراں ہے جو روح کو خدا سے غافل اور سست نہیں ہونے دیتی بلکہ تازگی اور سرور بخشتی ہے اور سرکش نفس کو ابھرنے سے دبائی رہتی ہے۔

نماز مساوات اسلامی کا سبق ہے: نماز مساوات اور بھائی چارگی کا ایک لازوال طریقہ ہے اور ہم فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا بے مثال طریقہ کسی مذہب نے آج تک نہیں پیش کیا۔ نماز باجماعت میں غلام، آقا، ادنیٰ واعلیٰ ایک ہی صف میں دوش بدوش کھڑے نظر آتے ہیں۔ امیر وغریب شیخ وسید، مغل وپٹھان کسی کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

نماز اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے: نماز اتحاد میل جول اور آپس کی تنظیم کا ایک واحد ذریعہ

ہے۔ نمازی جب پانچ وقت مسجدوں میں جاتے ہیں تو ایک دوسرے کے دکھ درد اور حالات سے واقف ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے ہیں۔ سلام وکلام ہوتا ہے، اہل محلہ کی حاضری غیر حاضری سے جان کاری ہوتی ہے۔ اس طرح سے باہمی ہمدردی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ مگر نماز جو اتحاد باہمی کا ذریعہ ہے اس کی آڑ میں کچھ لوگ حصول زر کے لیے تبلیغی مسائل کو ذریعہ معاش بنا کر نمازیوں کو حسین فریب دیتے ہیں، مساجد کو سیاسی اکھاڑہ بناتے ہیں۔ اور کفر وشرک کے بے معنی ولغو فتوے جاری کر کے قوم میں اختلاف وانتشار اور نفرت وعداوت کی خلیج پیدا کرتے ہیں۔

نماز ورزش جسمانی ہے: نماز کے تمام ارکان قیام وقعدہ، رکوع وسجود کے اندر روحانی فوائد کے علاوہ جسمانی فائدے بھی ہیں۔ جن سے اعصاب اور دل ودماغ میں چستی وچالاکی پیدا ہوتی ہے۔ انسان اپنی صحت وتوانائی کے لیے ورزش کے واسطے ایک وقت مقرر کرتا ہے۔ اور اس ورزش کے اصول پر کاربند بھی ہوتا ہے لیکن نماز ایک ایسی شے ہے جس سے بیک وقت دو دو فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ خداوند قدوس کی عبادت اور اعصاب کی توانائی کے لیے ورزش بھی ہو جاتی ہے اور یہ صف کی سیدھائی ایک ساتھ رکوع وسجود قیام وقعدہ کرنے سے فوجی پریڈ بھی ہو جاتی ہے۔

نماز روز جزا کی یاد دہانی ہے: نماز کے اندر ایک پہلو یہ بھی پوشیدہ ہے کہ نمازی کو اس سے یوم حساب اور جزا وسزا کی متواتر یاد دہانی ہوتی رہتی ہے اور وہ دن میں پانچ مرتبہ اپنے افعال واعمال کا محاسبہ کرتا ہے۔ وہ جب یوم الدین کے مالک پر غور کرتا ہے تو میدان قیامت کا نقشہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھر جاتا ہے کہ بندگان الٰہی اپنے معبود کی بارگاہ عالی میں حاضر ہیں اور اللہ جل جلالہ وعم نوالہ سے جھک کر معافی چاہنے والے ہیں، کوئی سجدہ میں گر کر اپنے پالنہار سے امن چاہتا ہے، گویا سزا وجزا کے آخری فیصلے سنائے جاتے ہیں، اور اس کے اعمال کی جیتی جاگتی تصویر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے اور اپنے اعمال قبیحہ کو دیکھ کر لرزہ براندام ہو جاتا ہے۔

نماز سکون قلب کا ذریعہ ہے: اس دنیاوی زندگی میں انسان اپنی ساری جدوجہد سکون

قلب کے لیے صرف کرتا ہے، اس لیے کہ اطمینان قلب ہی حقیقی راحت ہے، مگر آج دنیا میں اطمینان قلب خواہ امیر ہو یا غریب کسی کو میسر نہیں، سکون قلب صرف ذکر الٰہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ خداوند قدوس خود ارشاد فرماتا ہے۔ تمہیں اطمینان قلب ذکر خدا سے حاصل ہوگا۔ اور ذکر خدا کا سب سے بہتر ذریعہ نماز ہے، چناں چہ معلوم ہوا کہ نماز اطمینان قلب کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔

حکمت نماز با جماعت: یوں تو خداوند قدوس نے جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کی تاکید فرمائی لیکن ہمارا اجتماعی طور پر نماز کا ادا کرنا حکم خداوندی کے علاوہ ظاہری طور پر بھی بہت سی حکمتیں رکھتا ہے چند ملاحظہ ہوں۔

(۱) مذہب اسلام کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ مسلمان آپس میں ایک جسم اور ایک جان ہوکر زندگی بسر کریں، کیوں کہ اسی اجتماع واتحاد سے قوت وغلبہ حاصل ہوگا۔ اس بات کا روز مرہ مشاہدہ ہے کہ جس نے بھی اسلام کے سبق کو اپنایا، ترقی وکامرانی، فتح ونصرت نے اس کا قدم چوما۔ اجتماعی زندگی گزارنے کا مطلب حیات اور انفرادی معیشت کا مفہوم موت ہے۔ دیکھیے جب تک جسم اور روح کے درمیان اتحاد رہتا ہے اس وقت تک لوگ اسے زندہ سے تعبیر کرتے ہیں اور جسم سے روح برگشتہ ہوکر جدا ہوجاتی ہے، موت واقع ہوجاتی ہے حالاں کہ دوران حیات میں انسان کو جیسے دو ہاتھ، دو کان، دو آنکھ، دو پیر وغیرہ تھے بعینہ ویسے ہی مرنے کے بعد بھی رہتے ہیں، کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا۔ لیکن جسم وروح کی نا اتفاقی کی وجہ سے موت کا وقوع ہوتا ہے۔ معلوم ہوا کہ جس قوم میں اجتماعی زندگی گزارنے کی صلاحیت نہ ہو وہ مردوں سے بھی بدتر ہے۔

(۲) جماعت واجتماع سے آپس میں محبت والفت بڑھتی ہے۔ جب مسلمان مسجدوں میں فریضۂ الٰہی کی ادائے گی کے لیے جاتے ہیں تو ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی ہے، ایک دوسرے کی خیریت سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اگر کوئی حادثہ کا شکار یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوگیا ہے اور مسجد میں حاضر نہیں ہوسکا تو لوگ عیادت کے لیے جاتے ہیں، یا غربت وافلاس کی وجہ سے جو کوئی دوسری صورت حال پیدا ہوگئی ہے تو اہل استطاعت اس کی امداد واعانت کرتے

ہیں۔

(۳) جس طرح فوجی قواعد کی مشق اور احکام کمانڈر کی تعمیل ایک وقت میں سیکڑوں فوجیوں کو یکساں طور پر حرکت دینے کی عادت فوجی اور اجتماعی زندگی کے لیے ضروری ہے اس طرح قومی زندگی کی اہمیت اور فوجی قواعد کی مشق ایک مسلمان کے لیے بھی ضروری ولابدی ہے جو حالت نماز میں چوبیس گھنٹے کے اندر پانچ مرتبہ ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے کمانڈر کے احکام کی تعمیل یعنی امام کی اقتدا کرتا ہے۔

(۴) جماعت کے ساتھ فریضۂ خداوندی کی ادائے گی میں ایک باوقار اسلامی شان پائی جاتی ہے کہ سب کے سب عوام وخواص، بڈھے اور جوان، امیر وغریب، شاہ وگدا، اونچ نیچ، شریف ورذیل وغیرہ ایک جگہ جمع ہوکر اس عبادت کو جو اسلام کا بہت ہی اہم شعار ہے اجتماعیت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وغیرہم

فضائل وتاکید نماز: اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنی شدت کے ساتھ نماز کی تاکید فرمائی ہے کسی دوسری عبادت میں نہیں فرمائی۔ حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ خداوند قدوس نے کلام مجید میں نماز سے متعلق جابجا نصیحت کی ہے، کہیں مدحیہ الفاظ کے ساتھ کہیں ترغیب دیتے ہوئے اور کہیں ڈرانے دھمکانے کے طور پر تذکرہ فرمایا ہے۔ تقریباً کلام پاک میں سات سو مقامات پر صراحۃً اور اشارۃً نماز کی اہمیت اور فرضیت کا ذکر ہے۔ کیوں نہ ہو کہ نماز دین کا ستون ہے، جب ستون ہی گر جائے تو دین کی قدر ومنزلت کیسے قائم رہ سکتی ہے، ظاہر ہے اس وقت تک عمارت قابل رہائش اور عمارت رہ سکتی ہے جب تک اس کے ستون وکھمبے چھتوں سے لگے ہوئے ہوں یا اور مضبوط ہوں۔ لیکن جب ستون گر جائیں یا کمزور ہو جائیں تو عمارت کیسے قائم رہ سکتی ہے اور کیسے کوئی اس میں رہائش پذیر ہوسکتا ہے۔ بہر حال مختصر طور پر نماز کے فضائل اور نماز کی تاکید پر آیات قرآنی اور فرمودات نبوی ﷺ ملاحظہ کیے جائیں۔

آیات

(۱) ﴿وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَارْكَعُوا مَعَ الرَّاكِعِينَ﴾

[البقرہ:۴۳]

اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔

(۲) ﴿الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ أُولَـٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا﴾ [الانفال:۴]

وہ جو نماز قائم رکھیں اور ہمارے دیئے سے کچھ ہماری راہ میں خرچ کریں وہی سچے مسلمان ہیں۔

(۳) ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُواْ وَعَمِلُواْ الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُواْ الصَّلَاةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [بقرہ ۲۷۷]

بے شک وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوۃ دی ان کا نیک اجر ان کے رب کے پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو نہ کچھ غم۔

(۴) ﴿وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّئَاتِ﴾ [الهود:۱۱۴]

اور نماز قائم رکھو دن کے دونوں کناروں اور کچھ رات کے حصے میں بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں۔

(۵) ﴿حَافِظُواْ عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلَاةِ الْوُسْطَى وَقُومُواْ لِلّهِ قَانِتِينَ﴾

[بقرہ:۲۳۸]

نگہبانی کرو سب نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے حضور ادب سے۔

(۶) ﴿فَاصْبِرْ عَلَى مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ﴾ [ق:۳۹،۴۰]

تو ان کی باتوں پر صبر کرو اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو سورج چمکنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات گئے اس کی تسبیح کرو اور نمازوں کے بعد۔

(۷) ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ

تَقُوْمُ وَمِنَ الَّیْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ﴾ [الطور: ۴۸، ۴۹]

اور اے محبوب تم اپنے رب کے حکم پر ٹھہرے رہو کہ بے شک تم ہماری نگہداشت میں ہو اور اپنے رب کی تعریف کرتے ہوئے اس کی پاکی بولو جب تم کھڑے ہو اور کچھ رات میں اس کی پاکی بولو اور تاروں کو پیٹھ دیتے۔

[ترجمہ از کنز الایمان فی ترجمۃ القرآن لامام احمد رضا بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ]

احادیث

(۱) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ فرماتے ہیں: ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا اسلام میں سب سے محبوب شے اللہ کے نزدیک کیا ہے، فرمایا وقت پر نماز پڑھنا اور جس نے نماز چھوڑ دی اس کا کوئی دین نہیں، نماز دین کا ستون ہے۔ [الترغیب والترہیب للمنذری ۱/۲۸۵]

(۲) حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے جو نماز صبح کے لیے طالب ثواب ہو کر حاضر ہوا گویا اس نے تمام رات قیام کیا اور جو نماز عشا کے لیے حاضر ہوا گویا اس نے آدھی رات قیام کیا۔ [الصحیح لمسلم ۱/۲۳۲]

(۳) حضرت جندب القسری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور ارشاد فرماتے تھے: جو صبح کی نماز پڑھتا ہے وہ شام تک اللہ کے ذمہ میں ہے۔ دوسری روایت میں ہے تو اللہ کا ذمہ نہ توڑو جو اللہ کا ذمہ توڑے گا اسے اللہ اوندھا کر کے دوزخ میں ڈال دے گا۔ [مشکاۃ شریف: ۶۲، مجلس برکات]

(۴) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور نے فرمایا: نمازیں کفارہ ہیں، ان گناہوں کی جو ان کے درمیان ہوں بشرطے کہ گناہ کبیرہ سے احتراز کیا جائے۔

(۵) حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور نے فرمایا: جس نے چالیس نماز فجر و عشا با جماعت پڑھی اس کو اللہ تعالیٰ دو براتیں عطا فرمائے گا، ایک آگ سے

دوسری نفاق سے۔

(۶) حضرت معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہتے ہیں: میں نے حضور ﷺ سے عرض کیا: وہ عمل بتلایئے جو مجھے جنت میں لے جائے اور دوزخ سے بچائے۔ فرمایا: اللہ کی عبادت کر اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کر اور نماز قائم کر اور زکوۃ دے اور رمضان کا روزہ رکھ بیت اللہ کا حج کر اور اس حدیث میں یہ بھی ہے کہ اسلام کا ستون نماز ہے۔

(۷) ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے حضور نے فرمایا: جو طہارت کر کے اپنے گھر سے فرض نماز کے لیے نکلا اس کا اجر ایسا ہے جیسا حج کرنے والے محرم کا، اور جو چاشت کے لیے اس کا اجر عمرہ کرنے والے کے مثل ہے۔ اور ایک نماز سے دوسری نماز تک کہ دونوں کے درمیان کوئی لغویات نہ ہو، علیین میں لکھی ہوتی ہیں یعنی درجہ قبولیت کو پہونچتی ہیں۔

آخری بات

ہر شخص اپنے فائدے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہے۔ نماز بھی ایک بہت ہی سودمند اور نفع بخش شے ہے۔ یہ چند فوائد جو عقل انسانی کے پیش نظر تھے بیان کیے گئے اور جانے کتنے فوائد ہوں گے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے علم میں ہیں خدا ہمیں اور آپ کو توفیق دے کہ معبود حقیقی کی بارگاہ میں ایک خاص انداز (نماز) سے سجدہ ریز ہو کر دینی و دنیاوی سعادتوں سے مالا مال ہوں۔ آمین بجاہ حبیبہ الکریم۔

روزہ

مسلمانوں کا ایک مہینہ: اہل اسلام پر سال میں ایک ایسا دور بھی آتا ہے جب وہ اپنے معمولات زندگی میں بقیہ دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اس پورے مہینہ کا نام ہی ماہ صیام رکھ دیا ہے یعنی وہ اتنی مدت تک کے لیے دنیا سے رک گئے ہیں۔ اب نہ تو وہ عام لوگوں کی طرح آزادی سے کھا پی سکتے ہیں اور نہ شہوت نفسانی کے فطری تقاضے کو آزادی سے پورا

کر سکتے ہیں۔ ان کی زبان بھی بے جا گفتگو سے رکی ہوگی اور ان کے ہاتھوں کو بھی ہر قسم کی بے معنی جدال سے رکنا پڑے گا۔ اور کسی نے اگر خواہ مخواہ انہیں دنیائے فانی کی طرف کھینچنا ہی چاہا تو کائنات کی ہنگامہ آرائی سے انہیں یہ کہہ کر دامن بچالینا چاہئے انی امرء صائم مجھے تو معاف ہی رکھو اس لیے کہ میں روزہ دار آدمی ہوں۔ اور یہ دنیا سے رکنا اس لیے ہوتا ہے کہ عالم قدس کی طرف پوری قوت سے دوڑیں اور کھانے سے شکم کو اسی لیے روکتے ہیں تا کہ دل کو نور عرفاں سے بھر دیں۔ وہ اپنے ہاتھوں کو دنیا سے اس لیے روکتے ہیں تا کہ روحانیت کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیں اور زبان کو بے معنی گفتگو سے اس لیے روکتے ہیں تا کہ کما حقہ ذکر الٰہی کر سکیں۔ چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ کل تک جن لوگوں کے کام ودہن نعمتوں کی لطف اندوزیوں سے بہرہ ور تھے آج وہ صرف خدا کے لیے شام تک بھوکے رہتے ہیں۔ بہت سی وہ مسجدیں جن کے صحن سال بھر کسی موحد کے سجدے سے خالی رہے آج رکوع وسجود، قیام وقعود، ذکر وفکر، تکبیر وتہلیل سے معمور ہیں۔ اور جن خدا خانوں کے بام ودر، محراب ومنبر مدہم چراغ کی روشنی کو ترس گئے تھے آج وہ روشنی سے جگمگا اٹھے۔ دن میں شکر گزاری کے سجدے ہیں تو رات میں نیاز مندانہ قیام۔ پھر کتنے لوگ ایسے ہیں جو مسجدوں کو اپنا نشیمن بنالیتے ہیں تا کہ ساری کائنات سے فارغ ہو کر صرف خدا کی عبادت کریں، اور کتنے ایسے ہیں جو گھر پر ہی ذکر وفکر، تقدیس وتحمید میں مصروف رہتے ہیں۔ بہر حال جہاں تک دنیا سے بچنے اور روحانیت کی سرحد میں قدم رکھنے کا تعلق ہے ہر ایک اسی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے کہ قبائح سے بچے اور حسنات اختیار کرے۔ بھلائیوں کا اکتساب کرے اور برائیوں سے دور رہے۔

ہاں یہ صحیح ہے کہ جمہور مسلمین کے علی الرغم کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں (خدا کرے وہ کچھ ہی ہوں) جو اس وقت بھی دن میں مصروف اکل وشرب رہ کر خدائی قانون کا مذاق اڑاتے ہیں، اور کتنے ایسے ہیں جو شب میں ذکر الٰہی کے بجائے سنیما ہالوں اور پارکوں کی شام وسحر کا لطف اٹھاتے ہیں تا کہ خدا اور مسلمانوں کی خوب خوب مخالفت ہو سکے، اور کتنوں کو ہوٹلوں اور عشرت کدوں کی عصیاں بدوش رعنائیاں مسجد کا معتکف بنانے کی جگہ میکدوں اور بالا خانوں کا مجاور

بنادیتی ہیں۔ مگر جہاں تک اس اسلامی نظام کا تعلق ہے جو بلاتفریق ہر کلمہ پڑھنے والے پر جاری ہوتا ہے وہ یہی بتاتا ہے کہ شمع توحید کے فدائیوں کو اس مہینہ میں مادیت سے دور اور روحانیت میں جذب ہو جانا چاہیے۔

روزہ فرض کیوں ہے: یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ خاص اس مہینہ میں مسلمانوں پر احکام وفرائض کا یہ بار گراں کیوں؟ روزہ کا بار عظیم، پھر اس کے لیے اس مہینہ کی خصوصیت کس لیے؟ اور اسی مہینہ میں دیگر اعمال کی بھی موزونیت کیسی؟ مگر تھوڑے ہی غور سے یہ عقدہ بھی حل ہو سکتا ہے، کیوں کہ دنیا کا ہر وہ مذہب جو روحانی ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اگر تحقیق کی جائے تو مشکل ہی سے کسی ایسے مذہب کا نام لیا جا سکتا ہے جس میں روزہ کو مذہبی رسم نہ سمجھا گیا ہو۔ یہودیوں میں عاشورہ کا روزہ، ہندوؤں میں یکادشی اور برت جوگیوں کا چلہ چینیوں کا کئی کئی ہفتہ کا روزہ، پارسی پیشواؤں کا پنج سالہ روزہ، عیسائیوں کا چہل یومی روزہ، سب روزے ہی کی تو مختلف شکلیں ہیں جو رنگ ونسل کے امتیازات سے پیدا ہو گئی ہیں اور جن کو ہر قوم اور ہر ملت میں عبادت ہی مانا گیا ہے، تو اسلام نے بھی روزہ کو مذہبی حیثیت سے باقی رکھا۔ مگر یہ گزشتہ مذاہب کی تقلید محض نہ تھی، کیوں کہ اور مذاہب نے روزہ کا روحانیت اور عبادت سے جو تعلق بھی ثابت کیا ہو مگر قرآن یہ فرماتا ہے روزہ باعث تقویٰ ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرہ:]

اے مسلمانو! تم پر روزہ فرض کیا گیا، جیسا کہ تم سے پہلے امتوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم متقی و پرہیزگار بنو۔

جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ خود اسلام کے پاس روزہ کی معقولیت کے وہ قوی وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس نے گزشتہ مذاہب کی اس رسم کو مناسب ترمیم کے بعد باقی رکھا، باقی رہا یہ سوال کہ پرہیزگاری اور روزہ میں کونسا تعلق ہے، یہ ادنیٰ تامل سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ۔

روزہ سے تکسیر بہیمیت اور تائید روح حاصل ہوتی ہے

ہم دیکھتے ہیں کہ جہاں کے لوگ جتنی زیادہ شکم پُری کرتے اور معاشرت میں تکلفات بڑھاتے ہیں اتنا ہی زیادہ وہ شہوانی خواہشوں میں گرفتار اور فسق و فجور میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اور جہاں کی معیشت جس حد تک تنگ ہوتی ہے اور لوگ فاقہ کش ہوتے ہیں وہاں بے حیائی اور فاشی کا اتنا ہی کم مظاہرہ ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معصیت کی کمی میں شکم کے خالی ہونے کو کتنا دخل ہے، یوں ہی ہر شخص اپنی روزمرہ کی زندگی میں مشاہدہ کر سکتا ہے کہ جب اس کا شکم پُر رہتا ہے تو نفسانی خواہشات کتنی ابھرتی ہیں اور جب وہ بھوکا رہتا ہے تو اس کے دل میں کس قسم کے خیالات ہوتے ہیں۔ بے حیائیوں کا کس قدر سدباب ہوتا ہے، اور خیر کی قوتیں کتنا بر سر عمل ہوتی ہیں جس سے بہیمی قوتوں کے کمزور کرنے میں بھوک کی اہم طاقت کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے: کہ سال بھر آزاد نہ خورد و نوش سے اگر نفس امارہ سرکش ہو گیا تو تم اسے بھوک اور پیاس کی شدت سے رام کرو کہ یہ مریض نفس کا پرہیز کی شکل میں علاج ہے اور اگر نعمت الٰہی سے سال بھر لطف اندوزیوں کے بعد بھی شکر گزار ہی رہے ہو تب بھی تم کو روزہ رکھنا ضروری ہے، اس لیے کہ اس کا کمزور ہونا ہی اچھا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اشارہ فرمایا:

جب قوت بہیمیہ احکام ملکیہ کے ظہور سے مانع تھی تو اس کا مطیع و منقاد کرنا بھی ضروری ہوا اور قوت بہیمی کی شدت کا سبب جب کھانا پینا اور لذات شہوت میں انہماک ہے تو سارے انسانوں نے اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہ پایا کہ انہیں اسباب کو کمزور کریں جن سے قوت بہیمی قوی ہوتی ہے، یعنی کھانے پینے، لذات شہوانیہ کی کثرت کو قلت سے بدل دیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں ملکوتی اثرات پیدا کرنے والی ساری جماعتیں اختلاف مذاہب اور تضاد اوطان کے باوجود انہیں اسباب کی تقلیل کو شدت بہیمیت کا علاج بتاتی ہے۔ اور انبیا علیہم السلام کی حیات طیبہ میں بھی روزے کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ نوح علیہ السلام ہمیشہ روزہ

رکھتے تھے، داؤد علیہ السلام ایک دن افطار کرتے اور ایک دن روزہ رکھتے تھے، عیسیٰ علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دو دن افطار کرتے، خود حضرت محمد رسول اللہ ﷺ روزہ رکھنے پر آتے تو افطار نہ کرتے، اور افطار کرتے تو معلوم ہوتا کہ روزہ رکھیں گے ہی نہیں اور رمضان کے سوا پورے مہینہ کبھی روزہ نہ رکھتے۔ [استفادہ از حجۃ اللہ البالغہ ۲/۱۲۵، مطبع دار احیاء العلوم بیروت]

روزہ اخلاق فاضلہ کا تعوق ہے: علم النفس کے ماہرین کا خیال ہے کہ "العادۃ ام الاخلاق" عادت اخلاق کا سرچشمہ ہے۔ یا کہیں کہا جاتا ہے کہ "العادۃ طبیعۃ ثانیۃ" یعنی عادت طبیعت ثانیہ ہے۔ جس کا مطلب یہی ہوا کہ اخلاق فاضلہ اور اخلاق خبیثہ دونوں کا قریبی تعلق عادت سے ہے۔ عادت ہی ایک ایسی قوت ہے جو آدمی کو متقی پرہیز گار اور نیک بخت بناتی ہے، اور عادت ہی ہے جو دوسرے کو خبیث النفس مجرم اور بد بخت بناتی ہے۔ پھر انہیں ماہرین کا خیال یہ بھی ہے کہ عادت کو جہاں انسان کے بگاڑنے میں اتنا دخل ہے وہاں بری عادت بدلی بھی جا سکتی ہے۔ اس لیے قرآن کا حکم ہے کہ اگر تم نے سال بھر کی آزادی میں جائز معمولات میں بھی کوئی بداعتدالی کی عادت بد ڈال لی ہے، تو ایک مہینہ تو خالص روحانی دنیا میں رہ کر اس بری عادت کو نیک عادت سے بدل ڈالو تاکہ تمہاری غلطیوں کی تلافی ہو سکے۔ اور اگر تم نے پورے سال اپنی عادت نیک ہی رکھی جب بھی تم کو اس روحانی مشق کی ضرورت ہے تاکہ نیکیوں کی عادت میں پختگی آجائے اور اس مشق تعود سے ہمیشہ کے لیے تم میں ضبط نفس کی ایک ایسی اہم قوت پیدا ہو جائے جس سے بوقت ضرورت تم اپنے جائز معمولات میں بھی ترمیم کر سکو اور جسم کی سب سے اہم خواہش بھوک پر بھی تم قابو پا سکو، اور نفس کے سب سے قوی تقاضے (جذبۂ شہوت) کو بھی مطیع بنا سکو۔ ساتھ ہی اخلاق فاضلہ کے صدور پر تم ایسا ہی مجبور ہو جاؤ جیسا کہ عادت سے مجبور انسان بری عادت کی برائیوں پر آگاہ ہو کر چھوڑنے کی کوشش کے باوجود نہیں چھوڑ سکتا۔ غالبًا یہی نکتہ ہے جس پر مطلع ہو کر صوفیائے کرام نے باطنی صفائی کے لیے یہی ظاہری مجاہدہ اور چلہ کشی کا مضبوط نظام مقرر فرمایا ہے تاکہ بری خصلتوں کو نیک عادت سے بدلا جا سکے اور آئندہ کے لیے بھی خبیث عادتوں کا سدباب ہو سکے۔

روزہ پاک جذبات کی مشق ہے: جدید ماہرین علم النفس کا فلسفہ جذبات اور کیفیات نفس کے بارے میں یہ ہے کہ جس جذبہ یا کیفیت کو پیدا کرنا چاہیں تو اپنے اعضاء جوارح پر اسی قسم کے تغیرات پیدا کرلیں۔ مثلاً جذبۂ غضب طاری کرنے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اپنے چہرے کے اعصاب میں تناؤ پیدا کرلیں، ماتھے پر شکن ڈال لیں اور اسی قسم کے اہتمام تغیرات جو حالت غضب میں پیدا ہوتے ہیں اپنے اوپر طاری کرلیں تو دل میں بھی کیفیت غضب پیدا ہو جاتی ہے بغیر اس کے کہ کوئی مؤثر خارجی پایا جائے۔ اسی طرح جذبۂ غم پیدا کرنے کے لیے انہیں حالات کا اپنے اعضا پر طاری کر لینا کافی ہے جو حالت غم میں پائی جاتی ہیں۔ چناں چہ اس قسم کا تجربہ رات ودن ہوتا رہتا ہے کہ ایک شخص مصنوعی غصہ کرتے کرتے حقیقت میں غضب ناک ہو جاتا ہے اور ایک شخص تھوڑی دیر تک اپنے جوارح پر اداسی کی کیفیت طاری کر لیتا ہے تو اپنے دل میں بھی اداسی محسوس کرتا ہے۔ غالباً اسی لیے قرآن حکیم کہتا ہے کہ تم اپنے جوارح پر قدوسیت کے آثار طاری کرو تاکہ تمہارا دل مقدس ہو جائے اور تم اپنے اعضا کو لذائذ دنیوی سے روک رکھو تاکہ تمہارا نفس ناپاک جذبات سے رک جائے۔ اگر تمہیں اپنے دل کو مقدس جذبات سے لبریز رکھنا ہے تو ظاہری جوارح پر بھی روزہ رکھ کر وہی کیفیت طاری کرو جو دل کی پاک جذبات جاگزیں ہونے کے وقت ہوتی ہے تاکہ تم کو دل کی پاکی حاصل ہو جو بارگاہ الٰہی میں بہت مقبول ہے۔ اسی لیے ان لوگوں کو جو روزہ کی طاقت نہیں رکھتے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ روزہ داروں کا سامنہ بنائے رہیں تاکہ روزہ سے جو مقصد ہے (دل کی پاکی) وہ کسی حد تک حاصل ہو جائے۔ اور ان لوگوں کے لیے جو روزہ رکھ کر بھی وہ کیفیات طاری نہیں کرتے یہ حکم ہوا کہ جو لوگ روزہ رکھ کر بھی جھوٹ قول وفعل پر عمل کریں۔ اللہ کو ان کی بھوک اور پیاس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ روزہ سے جو غرض تھی وہ حاصل ہی نہیں ہوئی، گویا جس طرح ایک طرف روزے سے بہیمی قوتوں کی دسیسہ کاریوں کا علاج اور روح کی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ دوسری طرف اسی طرح روزہ انسان کو اخلاق فاضلہ کا خوگر بنانے کا ذریعہ بھی ہے، اور جدید روشنی میں نفس پر براہ راست اثر ڈالنے کا قریبی طریقہ بھی۔

خلاصۂ کلام: روزے کے یہ فوائد ہیں جن سے اس کی اہمیت اور اصلاح روح سے اس کے تعلق پر روشنی پڑتی ہے اور اسی قسم کے اور بہت سے فوائد ہیں جو روزے سے حاصل ہوتے ہیں، کیوں کہ قرآن نے روزہ کو تقویٰ کا سبب بتایا ہے۔ اور تقویٰ اس کیفیت نفس کا نام ہے جس کے حصول کے بعد نفس کو گناہوں سے جھجک اور نیکیوں سے رغبت معلوم ہوتی ہے۔ تو روزہ کو دل کی ہر قسم کی پاکی کا سبب بنایا جاسکتا ہے۔ اس لیے اسلام نے بھی روزہ کو قانونی حیثیت سے مسلمانوں پر فرض کیا تاکہ مسلمانوں کو تقویٰ اور وہ بیش بہا فوائد حاصل ہوں جن کا سرچشمہ روزہ ہے۔

وقت کا تعین:

اس اہم عبادت کے لیے قدرت نے جو وقت مقرر فرمایا ہے، اسلام کہتا ہے مذہبی نقطۂ نظر سے اس کے علاوہ کوئی وقت موزوں ہو نہیں سکتا۔ اس لیے کہ تقدیر الٰہی میں رمضان ہی ایسا مہینہ تھا جو ہر قسم کی بھلائیوں اور برکتوں کے لیے خاص تھا۔ چناں چہ نظام مذہب کے اہم واقعات یا بلفظ دیگر تبلیغ مذاہب کی تاسیس اور نزول وحی کی ابتدا اسی مقدس مہینے سے شروع ہوتی ہے۔ ابوداؤد، احمد، طبرانی کی ایک حدیث ہے کہ حضور اکرم نور مجسم ﷺ نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے باختلاف روایت پہلی یا تیسری رمضان کو اترے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کی نعمت سے چھٹی رمضان المبارک کو نوازا گیا۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل ۱۳ (تیرہ) رمضان کو عنایت کی گئی، اور جناب سرور انبیا ﷺ کے لیے قرآن کا نور ملا اعلیٰ سے چوبیسویں رمضان کو چمکا۔ اسی طرح اسلام کی تاریخ میں رمضان شریف کو جو بلند مقام عنایت ہوا اس کا اعتراف خود قرآن نے کیا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ﴾ [البقرہ: ۱۸۵]

یہ رمضان کا مہینہ وہ مہتم بالشان مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے

ہدایت اور کھلی نشانی ہے۔

اور غالباً قرآن کا نزول ہی اتنی بڑی نعمت ہے جس کے صدقے میں اللہ نے ابدالاباد تک کے لیے رمضان میں اپنی بے پایاں نعمتوں کے خزانے کھول دیئے اور زمین سے لے کر آسمان تک ایک ایسی فضا پیدا کر دی جو نزول قرآن کے مناسب و موزوں ہے۔

رمضان کے فضائل: جیسا کہ احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب رمضان کا ہلال افق عالم پر چمکتا ہے تو قدرت کی طرف سے خدا کے مجرموں کا ٹھکانا دوزخ کے دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں، اور پرستاران الٰہی کا مسکن جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک پکارنے والا آواز سے پکارتا ہے کہ اے طلب کنندگان خیر کے مقدس گروہ آؤ۔ اور اے طاغوتی طاقتوں کے غلام سرکشو! اب تو گناہوں سے باز آؤ۔ کہ آج کل خدا کے دوزخ سے آزاد کردہ بہت سے بندے ہیں۔ اور یہ سلسلہ پورے مہینے بھر ہر شب جاری رہتا ہے۔ اور اس ماہ کا ہلال طلوع ہوتے ہی شیطانوں کو مقید کر دیا جاتا ہے تاکہ ان کی ریشہ دوانیوں سے اہل اسلام محفوظ ہو جائیں۔

لیلۃ القدر: اسی مقدس مہینہ میں ایک ایسی مقدس رات بھی ہے جب اہل عالم کے لیے عالم نور کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور رحمت الٰہیہ باشندگان کائنات کی طرف متوجہ ہو جاتی ہے جس کی بزرگی ہزاروں رات کی بزرگی سے بھی بزرگ تر ہے۔ اور جس میں سال بھر کے لیے سارے احکام کا نفاذ ہو جاتا ہے۔ وفیھا یفرق کل امر حکیم. اسی رات میں کائنات کے سارے احکام نافذ کیے جاتے ہیں۔ اس رات میں نفاذ امر کے وہی معنی ہیں جس کو حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان فرمایا کہ جو کچھ بھی سال بھر اچھا یا برا، رزق اور موت سے ہونے والا ہوتا ہے وہ اسی رات کو لوح محفوظ سے نوٹ کر لیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس تفصیل سے احکام نافذ کر دیئے جاتے ہیں کہ فلاں فلاں اس سال جو کریں گے، اور فلاں فلاں کا نکاح اور فلاں فلاں کی موت واقع ہوگی وغیرہ ذلک۔ چوں کہ اس رات میں قضا و قدرت کی طرف سے سال بھر کے لیے نظام عالم کے احکام نافذ ہوتے ہیں غالباً اسی لیے رسول عربی

فداہ ابی وامی ﷺ نے اس رات میں عبادت الٰہی اور شب بیداری کی خاص تاکید فرمائی۔ اور چوں کہ اس کا اغلبی وقت رمضان المبارک کا اخیر عشرہ ہے اس لیے حضور ﷺ نے پورے عشرہ میں اعتکاف کا حکم دیا تا کہ لیلۃ القدر جب بھی ہو اور قضا و قدر کے فرشتوں کو آئندہ سال کے نظام کی فہرست ملے تو وہ تمہیں اس حال میں پائیں کہ تم اس حاکم اعلیٰ کے ساتھ وفاداری کا پورا پورا مظاہرہ کر رہے ہو۔ اس طریقہ سے اس قانون الٰہیہ کا خیر مقدم بھی ہوگا اور تمہاری یہ طاعت گزاری تمہارے لیے رحم کی درخواست بھی بن جائے گی۔

روزہ، رمضان المبارک کے انعاموں کا شکریہ ہے: اسلام کہتا ہے کہ جب یہ مہینہ نظام ملت میں ایسی اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت قرآن مجید اور اس منبع احسان و عرفان کے دوسرے چشمے (صحف مذاہب) اسی مہینے میں نازل ہوئے۔ اور دور زمانہ کی ایک گراں قدر رات اسی ماہ مبارک میں ہے جو ہزاروں مہینوں سے بہتر اور نزول قرآن کی سعادتوں سے منور ہے، پھر سال بھر کے نظام کائنات کا ہنگام تنقید بھی ہے اور بہت سے دوسرے انعامات الٰہیہ جن سے سارا مہینہ ایک مقدس فضا سے معمور رہتا ہے۔ تو اہل اسلام کا بھی فرض ہے کہ وہ اس مہینہ میں اللہ رب العزت کے ان گوناگوں انعامات کا شکر ادا کریں، اور وہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ ہم مادی دنیا سے الگ ہو کر روحانیت میں جذب ہو جائیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کو بھول کر اسی کے گن گائیں جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا جب ان پر توریت نازل ہو رہی تھی کہ چالیس دن تک روزہ رکھا اور عبادت کی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا جب کہ ان پر اللہ کی کتاب انجیل اتری کہ چالیس شبانہ روز بھوک اور عبادت میں بسر کیے۔ یا جیسا کہ خود داعیٔ اسلام علیہ الصلوۃ والسلام نے کیا۔ جب کہ ناموس الٰہی حرا کے دہانے سے طلوع ہوا کہ ایک مدت تحنث واعتکاف میں بسر کی، اسی طرح مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ دن میں شکر گزاری کے روزے رکھیں، رات کو شکریہ کی نمازوں میں پورا قرآن تلاوت اور عشرۂ اواخر اعتکاف و تحنث میں گزاریں۔

﴿لعلکم تتقون. ولعلکم تشکرون﴾

تا کہ مسلمان متقی اور شکر گزار ہو جائیں۔ خود قرآن کے انداز بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ روزہ جو ساری بھلائیوں کا سرچشمہ ہے اس کے لیے موزوں وقت رمضان ہی ہے، کیوں کہ وہ کہتا ہے کہ رمضان ہی میں قرآن نازل ہوا تو جو بھی تم میں سے اس مہینے کو پائے روزہ رکھے۔ یہ رمضان المبارک میں روزہ کے تعین کا سبب نزول قرآن کو بتانا ہی ظاہر کرتا ہے کہ اس سے نعمت الٰہی (نزول قرآن) پر شکر کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔ پھر آگے تو یہ بھی کہا گیا ہے کہ

﴿ولعلکم تشکرون﴾

تا کہ تم شکریہ ادا کرو، اور حق یہ ہے کہ ایک بندہ کا شکریہ اور وہ بھی اپنے رب کی بارگاہ میں اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دل کو متقی بنائے، کیوں کہ خالق کی بارگاہ میں نیک دل ہی مقبول ہے، اور اپنے سارے نظام زندگی کو ایک روحانی نظام حیات سے بدل دے، اس لیے کہ خالق کی بارگاہ میں جسم کی توانائی سے زیادہ روح کی توانائی پسند ہے۔ لہٰذا روزہ رکھ کر مسلمان گو جسم کو کمزور کرتے ہیں مگر روح کی توانائی میں اضافہ ہوتا ہے اور شہوت نفسانی کو روک کر گو نفس امارہ کا خون کرتے ہیں مگر نفس مطمعنہ کی بالیدگی میں اضافہ ہوتا ہے۔

حقیقی روزہ: روزہ باعث تقویٰ ہے روزہ انعامات الٰہیہ کا شکریہ ہے، روزہ اور بھی دوسری بہت سی برکتوں کا منبع ہے۔ مگر جس طرح ہر کام صحیح معنوں میں اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس سے متعلق تمام احکام کی پابندی کی جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ بھی حقیقی معنوں میں جب ہی مفید ہوگا جب اس سے متعلق ساری ہدایتوں پر عمل کر لیا جائے۔

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ روزہ سے جسم کی اصلاح سے زیادہ روح کی اصلاح ہوتی ہے، اس لیے اس کے ساتھ خاص اس قسم کے احکام بھی ہیں جو زیادہ تر اخلاق اور نظام روح سے متعلق ہیں۔ چناں چہ حدیثوں میں متعدد جگہ اس قسم کی ہدایتیں ملتی ہیں جن سے اکل و شرب کی پابندی اور شہوت نفسانی پر قیود کے ساتھ کچھ دوسری باتوں کی تاکید ظاہر ہوتی ہے، جیسے ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے۔

''جو شخص روزہ رکھے تو اس کو یہ چاہیے کہ وہ نہ تو فحش باتوں میں مصروف رہے، نہ ہزل

اور بیکار گفتگو میں مبتلا ہو، اور اگر اسے کوئی گالی دے یا مارے تو اس کے سارے ظلموں کے بدلے میں صرف یہ کہہ دے کہ میں تو روزہ دار ہوں"۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: جو روزہ رکھ کر بھی افترا و بہتان تراشی سے نہ بچے اللہ کو اس کی بھوک اور پیاس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسی طرح امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم ۳۶۲/۱ مطبع دار التقوی میں تحریر فرمایا ہے کہ روزہ کی تین قسمیں ہیں۔ ایک تو عوام کا روزہ ہے، دوسرے خواص کا، تیسرے اخص الخواص کا۔ عوام کا روزہ تو وہی کھانے پینے اور جماع سے رکنا ہے۔ خواص کا روزہ یہ ہے کہ ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان اور تمام اعضا کو گناہ سے روکے، اور اخص الخواص کا روزہ یہ ہے کہ اس کے لیے چھ چیزیں بہت ضروری ہیں۔

(۱) آنکھ کو ہر ایسی چیز کی دید سے روکے رکھنا جس سے اللہ کی یاد سے دل غافل ہو۔

(۲) زبان کو جھوٹ اور چغل خوری اور غیبت وغیرہ سے روکنا۔

(۳) ہر بری بات کے سننے سے کان کو محفوظ رکھنا۔

(۴) باقی اعضا کو گناہوں سے بچالینا اور شکم کو حرام رزق سے بچانا۔

(۵) کھانے پینے میں کمی کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ صبح سے شام تک تو کھانے سے باز رہے مگر جب منہ کھلا تو وہ تین دن یا کم از کم دن میں نہ کھانے کی کسر پوری کر لی۔ کیوں کہ اس طرح تو اللہ کی عطا کردہ عنایتوں اور اجازتوں سے آپ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

(۶) افطار کے بعد خوف ورجا کی حالت طاری ہونا کیوں، کہ معلوم نہیں کہ روزہ خدا کے نزدیک مقبول ہوا یا نہیں۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزے میں جہاں کھانے پینے اور جماع سے روکا گیا ہے اسی کے ساتھ کچھ ایسی چیزوں سے بھی روکا گیا ہے جن کا تعلق براہ راست روح اور اخلاق سے ہے، اور روزے کی تکمیل وتاسیس میں ان کو اتنا دخل ہے کہ کہ بعض فقہا نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی چغل خوری سے نہ بچے تو اس کا روزہ ایسا ہی جاتا رہتا ہے جیسا کہ کھانے پینے سے، اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اکل وشرب اور جماع کا روزہ فقہی حیثیت سے پورا ضرور ہوتا ہے مگر بارگاہ

الٰہی میں مقبول ہو یہ ضرور مظنۂ شک ہے اگر ان کے ساتھ مثلاً وہ احکام نہ شامل کیے گئے جو اوپر مذکور ہوئے۔ جو حج جدال آرائیوں سے بھرا ہو، جو نماز خشوع اور خضوع سے خالی ہو، جو زکوۃ کسب حلال سے نہ ہو، وہ اگر بارگاہ الٰہی میں مقبولیت سے محروم رہے تو پھر اس روزہ کا کیا حشر ہوگا جس میں شکم پر پابندی ہو مگر نگاہیں آزاد ہوں۔ زبان ہر قسم کی کذب بافیوں میں معروف اور کان ہر قسم کی باتیں سننے کے لیے آمادہ ہوں، دن بھر کا خالی شکم جب پر ہوتا ہو تو حرام کھانوں سے۔ بھلا صرف شکم کا روزہ کیا کام دے گا جب پورا جسم روزہ دار نہیں۔

روزہ اور موجودہ مسلمان: روزہ جن ظاہری اور معنوی پابندیوں کا نام ہے وہ حسب استطاعت اوپر مذکور ہوئیں، یہ ۲ ہجری میں مسلمانوں پر فرض ہوا۔ اس وقت سے لے کے آج تک اہل اسلام کا اس پر جو طریق رہا وہ محتاج بیان نہیں اور ایک طویل داستان ہے، مگر موجودہ مسلمان نے اپنے عمل سے ثابت کیا ہے وہ یقیناً باعث عبرت ہے۔ ان لوگوں کا تو ذکر ہی کیا جن کا تعلق اسلام سے صرف اتنا ہے کہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں اور ان کا نام مسلمانوں جیسا ہے، اسلامی خاندان میں پیدا ہوئے ہیں اور بس، کیوں کہ ان کے نزدیک تو روزہ فاقہ کشوں کا کام ہے، غیر مہذب عربوں کو اس کی ضرورت تھی اور اس وقت بھی نیچے طبقے کے لوگ اس کے اہل ہیں۔ ہاں وہ لوگ جن کو اسلام نہیں مسلمانوں کا کچھ لحاظ ہے جب وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو ضرور ان کے منھ خشک رہتے ہیں۔ مگر گھر میں وہ خوب کھاتے ہیں، گویا روزہ اللہ کا نہیں مسلمانوں کا کوئی حق ہے، اور رمضان کا مہینہ گھر میں نہیں باہر آتا ہے۔ اور لوگ جو اتنے چالاک نہیں ہیں وہ بھوکے پیاسے تو ضرور رہتے ہیں مگر (حدیث کے الفاظ میں) ان کو بھوک اور پیاس کے سوا اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ پھر ان پابندیوں کا کیا ذکر جو تراویح اور اعتکاف وغیرہ کی شکل میں عائد ہوتی ہیں۔ یہ ہے مسلمانوں کی موجودہ اکثریت کا نقشہ۔ سوال یہ ہے کہ یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے باعث شرم ہے کہ نہیں؟ اور کیا کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کے قوانین ایسے ہیں کہ ان پر مسلمانوں کی اکثریت عامل نہیں۔ آہ کہ ہم اسلام کو عروج کیا دیتے کہ آج ہمارے سبب سے وہ بدنام ہو رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار. وما علینا الا البلاغ.

عید

عید کے معنی لغت میں ''یوم مسرت'' کے ہیں اور دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس کی مسرت وخوشی کا کوئی دن نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر مذہب میں متعدد عیدوں کا وجود ملتا ہے۔ مثلاً ''شعانین'' عیدالفطر، عیداضحیٰ، عیدالفصح، عیدالغطاس، عیدالمیلاد، عیدتولد، عیدقیامت، عیدصعود وغیرہ، مگر یہ فخر صرف اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اور مذہب کے برخلاف عید کو بھی غیر مفید لہو ولعب سے پاک کر کے ایک خالص مذہبی رسم اور اس مقدس رسم کی حکیمانہ توجیہ کر کے اس کو نظام ملت کی ایک زریں کڑی بنادیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی عید میں جسم عبیروگلال کی رنگینیوں سے تو خالی رہتا ہے مگر دل ذکرالٰہی کی افسانیوں سے گلستاں بن جاتا ہے اور ساتھ ہی جسم کی بھی جائز حد تک آرائش ہوتی ہے۔ اسلامی عید بتان ماہوش اور شراب ناب کے جواز کے لیے اپنے اندر کوئی وجہ نہیں رکھتی۔ مگر بادۂ الست کی مجلس طرب اور محبوب حقیقی کے ذکر وفکر کی محفل آراستہ ہوجاتی ہے۔

حکمت عید: ہم نے اوپر کہا کہ اسلام نے عید کی ایک حکیمانہ توجیہ کی جس کی طرف اشارہ کیا:

﴿لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ [البقرہ: ۱۸۵]

تاکہ تم اللہ کی ہدایت پر اس کی بڑائی بیان کرو اور اس کا شکریہ ادا کرو۔

گویا دوگانۂ عید ہدایت الٰہی پر اس کی بڑائی کی یاد اور روز عید عطائے ربانی اظہار مسرت کا مبارک وقت ہے۔ مفسرین کے بیان کے مطابق یہ بڑائی کی بول تو وہی تکبیریں ہیں جن کو نماز عید میں اور نماز کے باہر ہر مصلی بڑے ذوق وشوق سے پڑھتا ہے۔ لیکن وہ ہدایت تو کوئی بڑی ہی شاندار ہدایت ہوگی جس پر ادائے شکریہ اور اظہار مسرت کا حکم دیا جاتا ہے۔ ہاں! اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ ہر زمانے میں سنت الٰہیہ یہی رہی ہے کہ رب العزت زمین کی خلافت اور قوموں کی امامت نیز احکام الٰہی کے قیام تاسیس کے لیے کسی نہ کسی قوم کو چن لیتا ہے اور زمین

کی حکومت، قوموں کی امامت اور مذہبی رہبری وسیادت اسی کے سپرد ہوتی ہے۔ چناں چہ ایک زمانہ تک بنی اسرائیل کو امتوں کی سربراہ کاری سپرد رہی، ان کا قبلہ بیت المقدس قبلہ اقوام رہا اور ان میں جلیل القدر پیغمبروں، عظیم الشان رہنماؤں کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسا پرجلال نبی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا مجسم جمال اور مسیحا نفس پیغمبر انہیں میں بھیجا گیا اور فضائے تاریخ میں ان کی عظمت وشان کا غلغلہ بلند ہوتا رہا جس کا ذکر قرآن نے بھی کیا ہے "اے اسرائیل کی اولاد ذرا تم اپنے ان ایام کو تو یاد کرو جب ہم نے تم کو ساری دنیا کے لوگوں پر فضیلت دی تھی اور تم پر اپنی بیش بہا نعمتوں کے خزانے کھول دیے تھے اور یہی وہ فضیلتیں تھیں جن کی بنا پر بنی اسرائیل کا سر فخر وغرور سے بلند ہوگیا اور وہ اپنے سوا دوسری قوموں کو ذلیل نظروں سے دیکھتے تھے۔ مگر ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ جس ذات نے ان کو یہ شرف وبزرگی عطا کی وہ اس کو ان سے چھین بھی سکتی ہے۔ اور اس نے یہ بزرگی ازل سے ایک ایسی قوم کے لیے مخصوص کر دی تھی جسے خود بھی وہ "امت وسط" کے لقب سے یاد کرتی ہے، چناں چہ بنی اسرائیل کو جب خود فریبیوں نے اپاہج بنا کر رکھ دیا تو عرب سے وہ نیر اعظم طلوع ہوا جس نے اپنی عالمگیر روشنی سے سارے عالم کو منور کر دیا اور قدرت نے یہ امامت کبریٰ بنی اسرائیل سے لے کر اسے دی۔ رمضان کی ایک مقدس رات میں قرآن نازل ہوا جس کے ذریعہ اعلان کر دیا گیا ہے کہ اس قرآن کے بعد اب کسی دوسری کتاب کی ضرورت نہیں، اور قبلۂ عرب کے ہوتے ہوئے دوسرے قبلوں کی طرف سر جھکانے کی ضرورت نہیں۔ امام عالم محمد رسول اللہ ﷺ کے ہوتے ہوئے انسان کو دوسروں کی سیادت سے بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ خلافت ارض کا وہ طرۂ امتیاز جو مدت سے بنی اسرائیل کے لیے سرمایۂ ناز تھا اب بنو اسمٰعیل اس نعمت الٰہی کے مورد ہیں اور انہیں کے وسیلہ سے دنیا کا ہر وہ انسان جو اسلامی برادری میں شامل ہو اس میں شریک ہے۔

یہ نعمت الٰہی کا وہ بیش قدر عطیہ تھا اور ہدایت ربانی کی وہ شاہراہ مقصود جس نے اہل اسلام کا سر افتخار ومسرت سے اتنا بلند کر دیا کہ بجا طور پر دیگر اقوام انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔ پس اس نعمت الٰہی کی عطا پر ضرور تھا کہ اظہار شکر کا کوئی نہ کوئی دن مقرر کیا جائے۔ بانی اسلام ﷺ

نے لوگوں سے پوچھا کہ جاہلیت میں بھی تم کسی دن عید مناتے تھے؟ لوگوں نے عرض کیا جی ہاں! مہرگان اور نیروز پارسیوں کی دو عیدیں، ارشاد ہوا کہ اب جب قدرت نے تمہیں اظہار مسرت کا اتنا بڑا موقع دیا تو دوسروں کے جشن مسرت میں تمہیں خوشی تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم خود شوال کی پہلی تاریخ کو عید منایا کرو۔ مگر چوں کہ دیگر اقوام کی طرح ناؤ نوش کی بالکل اجازت نہیں۔ بلکہ بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز کے ساتھ حضور ضروری ہے، کیوں کہ یہ عید عنایت الٰہی کا شکریہ ہے، اس لیے نافرمانی نہیں بلکہ فرماں برداری کی جائے، تم اس دن اچھا کپڑا پہنو۔ اچھا کھانا کھاؤ، لوگوں سے اچھی طرح ملو، اور اللہ کی عبادت اچھی طرح بجالاؤ، یہی تمہارا جشن مسرت اور یہی تمہاری عید ہے، اس لیے کہ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لیے مسرت اور کیا ہوگی کہ اطمینان کا آب ودانہ نصیب ہو، مقدس محفل احباب ہو اور خداوند کریم کی پاک درگاہ میں انتہائی تقرب اور حضوری اور یہ سب تمہیں عید کے دن حاصل ہے۔

عہد نبوی کی عید: چناں چہ عہد رسالت میں انہیں تعلیمات پر عمل ہوتا تھا، خود جناب رسالت مآب ﷺ و دیگر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم عید کی صبح غسل فرماتے، اچھے کپڑے پہنتے، مسجد میں جانے سے پہلے کچھ میٹھا کھاتے اور مسکینوں کو صدقۂ فطر دیتے، پھر تکبیریں کہتے عیدگاہ جاتے، وہاں نماز ہوتی اور بعد نماز نبی کریم ﷺ خطبہ دیتے جس میں مسلمانوں کو احکام شرع کی تعلیم دیتے اور دوسرے راستے سے تکبیر کہتے ہوئے واپس ہوتے، یہ ایک مختصر خاکہ ہے عہد نبوت کے جشن مسرت کا۔

موجودہ عید: مگر آج ہماری زندہ دلیوں نے اسلام کے اس سادہ نقش میں خوب خوب رنگ آمیزی کی ہے اور ہم نے اپنی طرف سے بہت سے اضافے کیے ہیں۔ مثلاً روز روز کے رندان قدح خوار کا کیا ذکر، وہ زاہدان خشک بھی جو سنیما کی لطف اندوزیوں سے اکثر دور رہتے ہیں اس دن عید کی خوشی میں کوئی نہ کوئی نیا کھیل ضرور دیکھتے ہیں، بہت سی محافل احباب میں اسی قسم کی دوسری دل چسپیوں کا پروگرام ہوتا ہے۔ اور ہر شخص علی قدر مراتب نزہت گاہوں، بالاخانوں، میکدوں کی دل چسپ تفریحوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ گویا اس طرح لوگوں نے انعامات الٰہیا

پر اظہار مسرت کا ایک انوکھا طریقہ سوچا ہے کہ اس دن بھی خصوصیت سے وہی افعال کرتے ہیں جن سے خدا کا غضب ٹھنڈا ہونے کے بجائے اور بھڑکے۔ پھر یہیں سے بس نہیں ہمیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلم قوم کی اکثریت یہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتی کہ آخر یہ بے معنی سوانگ کیوں رچایا جاتا ہے جب کہ وہ سب کچھ رہا نہیں جس کی بنا پر عید مسرت کا دن تھا، تمہارے یہ زرق و برق لباس، مسرور چہرہ، احباب کے ساتھ رعنائی گفتار، اظہار مسرت اور گل گشت چمن اس وقت موزوں تھے جب تم قوموں کے سردار تھے مگر آج جب کہ تمہاری عظمت رفتہ تمہاری نوحہ گر ہے تمہارا یہ فعل کہاں تک مستحسن ہے۔ تمہیں بتاؤ اس برباد شدہ قافلہ کے لیے مسرتوں کا کون سا وقت ہے جس کا متاع ایمان برباد ہو چکا ہو اور اب جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ اس برباد شدہ انجمن کے لیے خوشی کا کونسا موقع ہے اور اب جس کی ساری گرمی محفل تاراج ہو گئی ہو اور اب سوختہ شمع، خاکستر پروانہ اور بے کیفی اور اداسی کے سوا کچھ نہ رہ گیا ہو، اس اجڑے چمن کے عندلیبان فغان سنج کے لیے نوا سنجی کا کون سا وقت ہے جس کی ساری رونق بہار باد خزاں کی نذر ہو گئی ہو اور اب زرد پتوں یا ننگے درختوں اور جھاڑ جھنکھاڑ کے سوا کچھ نہ باقی ہو، پھر اس قوم کے لیے عید کیا معنی رکھتی ہے جس کی عظمت رفتہ کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہو اور اس کے عروج وزوال کی المناک تاریخ ایک عالم کے لیے درس عبرت ہو آہ! ہم کو عید کا دن اس لیے ملا تھا:

﴿تَامُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ [آل عمران: ۱۱۰]

تم نیکیوں کا حکم دینے والے اور برائیوں سے روکنے والے ہو۔

مگر آج ہمارے اعمال خود ہم پر خندہ زن ہیں پھر ہم کسی کی رہنمائی کیا کریں گے بقول شخصے۔

رہنمائے غیر ہوتے تھے ہمارے نقش پا
رہنمائی کیسی اب خود ہی مٹے جاتے ہیں ہم

ہمارے لیے عید کیا اور عید کی مسرت کیا۔ عید ہمارے لیے کبھی پیغام مسرت لاتی تھی۔ مگر اب تو ہمارے مندمل شدہ زخم اور ہرے ہو جاتے ہیں اور ہلال عید ہمارے لیے نشتر غم بن

جاتا ہے۔

مگر ہلال عید تو ہمیشہ یوں ہی طلوع ہوا کرے گا اور عید اپنے اندر مسرتوں کا پیغام ہمیشہ لائے گی، کیوں کہ یہ اسلام کا ایک جشن مسرت ہے اور جب تک اسلام بلند رہے گا یہ جشن بھی ہر سال آئے گا۔ پھر ہم کو کیا کرنا چاہیے۔ کیا اس دن دل فریب کپڑوں کی جگہ لباس غم نہیں، محفل مسرت کی جگہ بزم عزا مرتب کریں اور ترانۂ عید گانے کے بجائے عظمت رفتہ کی مرثیہ خوانی کریں؟

نہیں! کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ عید کو محرم بنادو۔ مگر اتنا تو ہو کہ عید کی مصنوعی خوشی کو حقیقی مسرت سے بدلنے کی کوشش کی جائے اور وہ اسباب مہیا کئے جائیں جن سے عید حقیقی معنوں میں عید ہو جائے، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب پھر اہل اسلام کی مذہبی قوتیں برسرعمل ہوں، اور مسلمان ننگ اسلام ہونے کے بجائے باعث افتخار عالم ہوں، اور اپنی قوت عمل سے پھر ایک دفعہ ثابت کردیں کہ اسلام ہی وہ نظام عمل ہے جس سے ساری کائنات فلاح و آسائش میں ہوسکتی ہے، اور غفلت شعاریوں کا بادل چھٹ جائے تو اسلام ہی سب کے لیے مشعل ہدایت ہے۔ اسلام ہی امن اور سلامتی کا پیغام بر ہے۔ اسلام صرف خوشنما لفظ نہیں اس کے اندر ایسا نظام عمل ہے جس میں زندگی کے ہر شعبہ کے لیے تعلیم وہدایت ہے۔

عہد نبوی کا ایک واقعہ: حضور ﷺ عید کی نماز کے لیے تشریف لے جارہے تھے، راستہ میں بچوں کا اژدھام نظر آیا کہ مسرور بچے وفور مسرت میں کھیل کود رہے تھے۔ ان میں ایک بچہ نہایت غم گین اور روتا ہوا نظر آیا۔ حضور یہ دیکھ کر بے قرار ہو گئے، قریب جا کر دریافت فرمایا کہ ہمارے بچے اس خوشی کے دن بھی تم غم گین ہو اور رو رہے ہو، کیا وجہ ہے؟ اس نے حضور کو عام انسان سمجھ کر کہا جاؤ اپنا راستہ لو، میرے غم سے تمہیں کیا واسطہ، میرا باپ تو فلاں لڑائی میں نبی کریم ﷺ کے سامنے شہید ہو گیا۔ میری ماں نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا، ان دونوں نے مل کر میرا مال کھالیا، اور میرے سوتیلے باپ نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ اب نہ تو میرے رہنے کے لیے کوئی ٹھکانا ہے نہ پہننے کے لیے کوئی کپڑا، نہ کھانے پینے کا کوئی سامان ہے کہ اپنے شکم کی

آگ کو تو ٹھنڈا کروں، اور آج جب میں ان باپ والے بچوں کو شاداں وفرحان دیکھتا ہوں اور ان پر بہترین کپڑے ہیں تو میرا غم تازہ ہوجاتا ہے۔ یہی میرے رونے کا سبب ہے، اس دردناک داستان کو سن کر رحمت عالم نے اس کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، اب رونا موقوف کرو، کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ میں تمہارا باپ ہوں، عائشہ تمہاری ماں، فاطمہ تمہاری بہن اور علی تمہارے چچا اور حسن وحسین تمہارے بھائی ہوں۔ اس خستہ دل بچہ کو جب یہ معلوم ہو کہ یہ تو خود رسالت مآب ہیں تو خوش ہو کر عرض کیا: یارسول اللہ بھلا آپ کے دامن کا سایہ ملے اور میں راضی نہ ہوں فوراً آپ اس کو اپنے گھر لائے اور اچھے کپڑے پہنا کے اس کو کھانا کھلایا۔ اب جو وہ حضور کے گھر سے نکلا تو نہایت خوش تھا، ان بچوں میں جا کے مل گیا۔ بچوں نے پوچھا تم ابھی رو رہے تھے، کیسے اس قدر جلد خوش ہوگئے۔ لڑکے نے کہا پہلے میں یتیم تھا اور اب رسول اللہ ﷺ کا کنبہ میرا رشتہ دار ہوگیا۔ حضور نے مجھ کو کھانا کھلایا اور اچھے کپڑے پہنائے یہ سن کر لڑکوں نے کہا کاش ہمارے باپ بھی اسی غزوہ میں مارے جاتے۔ وہ بچہ حضور کے پاس ہی رہا اور جب حضور کا وصال ہوا تو روتا تھا اور کہتا تھا کہ اب میں یتیم ہوگیا۔ یہ دیکھ کر حضرت ابوبکر نے اپنی سرپرستی میں لے لیا۔

[القلیوبی ۱۸/ رضا اکیڈمی بمبئی]

موافقات عمر!

اس میں شک نہیں کہ قرآن کلام الٰہی ہے، لیکن ساتھ ساتھ وہ فطرت انسانی کے راز ہائے سربستہ کا بھی عقدہ کشا ہے۔ بنی آدم کے لیے شاہراہ عمل اور طریقہ زندگی بھی متعین کرنے والا ہے، اس لیے فی الحقیقت اس کی باتوں کا طبائع انسانی کے موافق ہونا بھی ضروری ہے۔

چناں چہ اسلام میں سعادت اور شقاوت کا مدار اس پر بھی ہے کہ کس آدمی کی طبیعت کہاں تک قرآنی صداقتوں کے ہم آہنگ ہے۔ دراصل وہ شخص بہت ہی بڑا انسان ہے جس کے خیالات اور جس کی افتاد مزاجی نزول قرآن سے قبل بھی قرآن کے مطابق ہو۔

اس سلسلہ میں امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک امتیازی خصوصیت حاصل ہے کہ ان کے بہت سے خیالات بلکہ عبارتیں قرآن کے موافق ہیں۔ امام جلال الدین سیوطی علیہ الرحمہ نے جلالین اور تاریخ الخلفا (مترجم ۲۰۰ اسلامک پبلیشر دہلی) میں تصریح کی کہ ایک یہودی اور منافق میں جھگڑا ہوا، فیصلہ کے لیے یہودی نے حضور ﷺ کا انتخاب کیا اور منافق اس بات پر مصر تھا کہ کعب بن اشرف کو فیصل مقرر کیا جائے، کچھ تو یہودی کے اصرار اور رسوائی کے خوف سے منافق بھی آخر کار راضی ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں مقدمہ پیش ہوا، آپ نے جانبین کے دلائل سن کر یہودی کے حق میں فیصلہ دیا، منافق کو تسکین نہیں ہوئی اور ضد کر کے عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں گیا تا کہ کافروں کے ساتھ ان کی سختی سے ناجائز فائدہ اٹھائے، یہودی نے صورت معاملہ بیان کی اور یہ کہا کہ یہ حضور ﷺ کے فیصلہ کے بعد اب آپ سے فیصلہ کرانے آیا ہے، کیا یہی بات ہے؟ حضرت عمر نے پوچھا، جی ہاں منافق نے جواب دیا، اچھا تم دونوں یہیں کھڑے رہو میں فیصلہ کرتا ہوں، یہ کہہ کر اندر گئے اور ہاتھ میں تلوار لے کر باہر نکلے اور قبل اس کے کہ ان دونوں کی سمجھ میں صورت حال آئے آپ نے منافق کا سر اڑا دیا اور

فرمایا جو خدا اور رسول کے فیصلہ پر راضی نہ ہو اس کا فیصلہ میں یونہی کرتا ہوں مقتول تو وہیں ٹھنڈا ہو گیا اور یہودی بھاگ کر حضور کی خدمت میں حاضر ہوا، پورا ماجرا کہہ سنایا، آپ نے فرمایا: مجھے یہ امید نہ تھی کہ عمر ایک مسلمان کے قتل پر یوں جرأت کریں گے خود مقتول کے وارثوں نے بھی بڑا غوغا کیا۔ حضرت عمر سے اس بارے میں حضور نے سوال کیا تو عرض کی: ﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لاَ یُؤْمِنُونَ حَتَّیٰ یُحَکِّمُوکَ فِیمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لاَ یَجِدُواْ فِیۤ أَنفُسِهِمْ حَرَجاً مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُواْ تَسْلِیماً﴾۔ [النساء:۶۵]

فوراً سدرۃ المنتہی سے جبریل امین اترے، یارسول اللہ: رب العالمین بھی یہی فرما کر عمر کی تصدیق کرتا ہے اور نہیں الفاظ کے ساتھ جو عمر کی زبان سے ادا ہوئے حضور نے حضرت عمر کو بری کر دیا اور منافق کے خون کو ادا فرما دیا۔

حضور کی عادت کریمہ یہ تھی کہ بعد نماز عصر ازواج طاہرات کے پاس جاتے، ایک دفعہ کسی بیوی کے پاس آپ دیر تک تشریف فرما رہے جب واپس کسی دوسری بیوی کے پاس گئے تو انہوں نے کہا کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آتی ہے، آپ نے فرمایا: میں نے تو فلاں کے پاس شہد پیا ہے تو ہو سکتا ہے شہد کی مکھی نے مغافیر کا رس چوس لیا ہو، آپ نے ان کی خوشنودی کے لیے کہا اچھا اب میں شہد نہیں کھاؤں گا پر تم اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا تا کہ جس بیوی نے مجھے شہد کھلائی یا اس کا دل چھوٹا نہ ہو، پھر انہوں نے سرکار کا یہ راز دوسری بیوی سے بھی کہہ دیا جس سے سرکار کو سخت اذیت ہوئی اور آپ نے ایک قسم کھائی کہ کسی بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا، آپ نے ایک بالاخانہ پر قیام فرمایا، ادھر پورے مدینہ میں یہ خبر اڑ گئی کہ حضور نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی جس کے نتیجہ میں ازواج تو انتہائی کربنا کی میں تھیں صحابہ بھی مسجد میں سوگوارانہ جمع ہیں، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب اس واقعہ کی خبر ہوئی تو سخت پریشان ہوئے اور اپنی بیٹی حضرت حفصہ زوجہ رسول اللہ کے پاس گئے اور پوچھا کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو طلاق دے دی ہے، مجھے اس کا پتہ نہیں، حضرت حفصہ نے اشکبار نگاہ کے ساتھ غم آلود آواز میں کہا۔ اچھا رسالت مآب کہاں ہیں؟ بالاخانہ پر ہیں اور کسی سے ملنے کی اجازت نہیں ہے، یہ سن کر آپ اوپر گئے اور

دروازہ پر رہنے والے خادم سے بلند آواز میں کہا حضور سے کہو کہ عمر باریاب ہونا چاہتا ہے، خادم اندر گیا پھر باہر آیا اور کہا: میں نے آپ کی درخواست حضور میں گزار دی مگر رسول اللہ خموش رہے، حضرت عمر لوٹ آئے تھوڑی دیر عام صحابہ میں بیٹھے رہے پھر بے صبری سے اٹھے اور اجازت چاہی اب بھی اجازت نہ ملی، پھر واپس لوٹے تیسری بار جا کر بھی واپس لوٹ رہے تھے کہ خادم مژدۂ اجازت لے آیا۔ خدمت میں پہنچ کر عرض کی: حضور آپ نے عورتوں کو طلاق دے دی آپ نے فرمایا: نہیں حضرت عمر نے کہنا شروع کیا حضور ذرا دیکھئے تو ہم اہل قریش عورتوں پر حاوی تھے، اب جو ہم مدینہ آئے تو یہاں مردوں پر عورتوں کو غالب پایا، پھر طرفہ یہ کہ ہماری بیوی نے بھی وہی وطیرہ سیکھنا شروع کر دیا، میں ایک روز جو اپنی بیوی پر برافروختہ ہوا تو اس نے مجھے جواب دیا، مجھے اور زیادہ کھلا، یہ دیکھ کر میری بیوی کہنے لگی تمہیں یہی بڑا شاق گزرا۔

حالاں کہ ازواج مطہرات تو رسول اللہ کی بات دھراتی ہیں۔ میں نے کہا جو ایسا کرتی ہے ہلاک ہوگئی، کیا انہیں خدا کی پرواہ نہیں کہ خدا کا غضب حضور کی ناراضگی کی وجہ سے ہر آن ان پر ٹوٹ سکتا ہے، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا پڑے۔ حضرت عمر نے پھر کہنا شروع حضور میں نے تو سب سے کہہ دیا ہے: عسیٰ ربه ان طلقکن ان یبدله ازواجا خیر امنکن.

اور سرکار آپ تو ان کی پرواہ کچھ نہ کریں اگر آپ نے ان کو اپنے سے جدا کر بھی دیا تو خدا اور اس کے ملائکہ اور مسلمان آپ کے ساتھ ہیں، حضور پھر مسکرا پڑے، مطلع رسالت سے غم کی بدلی کا چھٹنا تھا کہ تبسم پنہاں کے سائے میں وحی الٰہی کا نزول ہوا:

﴿وَإِن تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ عَسَىٰ رَبُّهُ إِن طَلَّقَكُنَّ أَن يُبْدِلَهُ أَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنكُنَّ﴾

[التحریم: ۴]

حضرت عمر کہتے ہیں کہ مجھے امید قوی تھی کہ خدائے کریم میرے قول کی تصدیق ضرور اتارے گا یونہی قرآن کریم کی تقریباً تیس آیتوں میں حضرت عمر نے وحی الٰہی کی موافقت میں وہی الفاظ فطرۃً نزول قرآن سے قبل ہی کہے۔

حضرت علی کا فیصلہ

اور

امام حسن کا مشورہ

یوں تو عدالت کا فیصلہ چار و ناچار ہر شخص کو تسلیم کرنا ہی پڑتا ہے، لیکن حکم و فیصلہ کی معراج یہ ہے کہ جس کے خلاف فیصلہ کیا گیا ہو وہ بھی ایک دفعہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے کہ حق ہی ہے جو فیصلہ حاکم نے کیا ہے۔ اسلام کا دامن تو اس قسم کے عظیم و جلیل قاضیوں کے وجود سے بھرا رہا ہے، مگر اس سلسلہ میں حضرت علی کو جو شہرت اور نکتہ فہمی، اصابت رائے دقیقہ سنجی کو جو قبول عام قدرت نے عطا فرمایا ہے شاید ہی کسی کو ملا ہو، چناں چہ آپ کی اس خصوصیت کی بنا پر آپ کی پاک زندگی میں ہی آپ کو مفرح الکرب کا لقب عام صحابہ کرام نے دیا تھا۔ اور آپ کی عدم موجودگی میں جب بھی کوئی مشکل قوم کے سامنے آتی تو لوگ کہتے: قضية لا ابا حسن لها مشکل کٹھن آپڑی لیکن اس کے حل کرنے والے ابوالحسن موجود نہیں، اور ہوتے ہوتے یہ جملہ ضرب المثل بن گیا اور ہر اس موقع پر بولا جاتا جب کوئی مشکل میں کبھی الجھ جائے۔

آپ کی اس معاملہ فہمی اور دقیقہ رسی سے خوش ہو کر ایک دفعہ عمر فاروق نے ارشاد فرمایا: لولا علی لهلک عمر، اگر آج علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو گئے تھے۔

ایک دفعہ آپ کی بارگاہ میں دو شخص لڑتے ہوئے آئے، معاملہ یہ تھا کہ دو شخص ایک جگہ بیٹھ کھا رہے تھے، ایک کی تین روٹیاں تھیں اور دوسرے کی پانچ، ایک تیسرا شخص آ گیا اور ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہو گیا، چلتے وقت اس نے آٹھ روپے دونوں کو دے دیا کہ تم دونوں اپنے کھانے کا بدلہ لے لو۔ تین روٹیوں والے کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ مجھ کو صرف تین روپے دے رہا ہے

جب کہ میں اس سے پانچ روپے مانگ رہا ہوں، کیوں کہ ان آٹھ روپیوں میں تو ہم دونوں شریک ہیں حضرت علی نے فرمایا: اگر تمہارا ساتھی اپنی خوشی سے تمہیں تین روپے دے رہا ہے تو لے لو آخر اس کی روٹیاں تم سے زائد تھیں مدعی نے کہا کہ اگر آپ انصاف کی رو سے سمجھا دیں تب میں مان لوں گا۔ آپ نے فرمایا: کہ انصاف کی رو سے تمہارا صرف ایک روپیہ ہے، حیرت سے اس نے دریافت کیا وہ کیسے، آپ نے فرمایا کہ تمہاری تین روٹیاں تمہارے ساتھ کی پانچ کل کھانے والے تین! یہ معلوم نہیں کہ کس نے کتنا کھایا، اس لیے ہم مان لیتے ہیں کہ سب نے برابر کھایا، آٹھ روٹیوں کو تین آدمی پر برابر تقسیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ہر روٹی کے تین ٹکڑے کریں اس طرح کل ٹکڑے چوبیس ہوئے، تمہاری تین روٹیوں کے ۹ ٹکڑے اور ہر ایک نے آٹھ آٹھ ٹکڑے کھائے، تم نے اپنے آٹھ ٹکڑے کھائے صرف ایک ٹکڑا تمہارا تیسرے شخص نے کھایا اور سات ٹکڑے تمہارے ساتھی کے اور انہیں آٹھ ٹکڑوں کے بدلے آٹھ روپے دیئے پس تمہیں بتاؤ کہ تمہارا حصہ کتنا ہے۔ [تاریخ الخلفا مترجم ۲۶۷، اسلامک پبلیشر دہلی]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ہے جس میں آپ کے صاحبزادے حضرت امام حسن کی ذہانت اور عقل کا پتہ چلتا ہے۔ ایک دفعہ خلافت کی پولیس ایک ایسے شخص کو گرفتار کر کے لائی جس کے ہاتھ میں خون آلود چھری تھی اور اس کے سامنے ایک نعش تڑپ رہی تھی، شہادت گزر گئی بلکہ خود مجرم نے اقبال جرم کر لیا اور حضرت علی نے قصاص میں اس کو قتل کرنے حکم بھی دے دیا، اتنے میں ایک دوسرا شخص ہانپتا کانپتا آیا اور اس نے بیان دینا شروع کیا کہ مبینہ قتل کا مجرم میں ہوں میں نے مقتول کو روپیہ پیسہ کے لیے قتل کیا ہے اور میں قتل کے بعد جامہ تلاشی لے ہی رہا تھا کہ کسی کے قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی اور میں چھپ گیا، لیکن اب جو اس کو اس جرم میں بے گناہ قتل ہوتے دیکھ رہا ہوں تو میرا نفس مجھے اقبال جرم پر مجبور کر رہا ہے۔ پھر اول الذکر نے اپنا واقعہ اس طرح بیان کرنا شروع کیا کہ میں نے جائے وقوعہ سے کچھ ہی دور پر بکری ذبح کی تھی میں اسے صاف کر ہی رہا تھا کہ مجھے پیشاب کی حاجت محسوس ہوئی اور میں اسی عالم میں ادھر چلا آیا، اسی دوران مجھے ایک چیخ سنائی دی میں فارغ ہو کر ادھر آیا ابھی کھڑا ہوا حیرت سے نعش کو دیکھ ہی رہا تھا کہ

پولیس آگئی جن حالات میں میری گرفتاری ہوئی تھی سوائے اقبال جرم اور چارۂ کار ہی کیا تھا حضرت علی نے اسے چھوڑ دیا اور اصل مجرم کے بارے میں امام حسن سے پوچھا، تمہاری کیا رائے ہے، آپ نے عرض کی: حضرت اس نے ایک آدمی کی جان ماری تو ایک بے گناہ کی جان بچائی بھی ہے۔ اور حکم الٰہی ہے جس نے ایک جان بچائی اس نے سب کو بچالیا، مولائے کائنات نے اسے بھی چھوڑ دیا اور مقتول کا خون بہا بیت المال سے ادا کر دیا۔

[سچی حکایات حصہ ۲/ ۲۸۷، بحوالہ الطلاقات الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیۃ ۵۶]

خلافت

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عقائد کی روشنی میں

آج کل یکے بعد دیگرے دو ناپکار کتابیں شائع ہوئیں "معاویہ بن یزید" اور "اموی دور خلافت" اس کے جواب میں سوائے اس کے کیا ہوسکتا ہے کہ اس کے لیے خدا سے ہدایت کی دعا کی جائے اور حکومت سے پرزور مطالبہ کیا جائے کہ خلافت معاویہ ویزید کے ساتھ ساتھ یہ روسیاہ کتاب بھی قانوناً ممنوع قرار دی جائے۔

محمود احمد عباسی کی ہمت پیرانہ کی (بقول ان کے سعادت مند بھتیجے کے) واقعی داد نہیں دی جاسکتی کہ انہوں نے کس چابک دستی سے اتحاد بین المسلمین کی جدوجہد کی ہے، اور بزعم خویش عام مورخین اسلام کے غلو وتعصب کا پردہ چاک کرنے کی کامیاب کوشش میں خود تقدیس اسلام کی پاک چادر پارہ پارہ کرنی چاہی ہے، اور حمایت یزید کے جوش میں خلافت امویہ کا وہ تاریک پس منظر تصنیف فرمایا ہے جس میں حضور مولائے کائنات رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کو بالکل مجروح کرڈالا۔

چناں چہ آپ نے شاہ ولی اللہ صاحب اور ابن تیمیہ کی عبارتوں کے ساتھ کچھ اپنی باتیں ملا کر یہ کہہ دیا کہ حضرت مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت قائم ہی نہیں ہوئی۔ ان کی خلافت تو معاذ اللہ سبائیوں کی ساختہ وپرداختہ تھی، ان کی بیعت پر تو اہل حل وعقد جمع بھی نہ ہوئے۔ خلافت وامامت بالخصوص مولائے کائنات رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مسئلہ خلافت اسلام کی ابتدائی صدیوں سے اہل سنت وجماعت کے نزدیک ایک طے شدہ عقیدہ بنا ہوا ہے، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ مولائے کائنات کی خلافت کی دو حیثیتیں ہیں: تاریخی، کلامی، یعنی ایک تو اس کی تاریخی حیثیت، اس کے بارے میں تاریخی روایتیں کیا ہیں، طبری میں کیا ہے۔ ابن اثیر نے

کیا لکھا ہے، مسعودی کی روایتوں میں کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ دوسرے عقیدے کی یعنی مولی کی خلافت کے بارے میں تمام اہل سنت و جماعت کا ایک متفقہ عقیدہ بھی ہے کہ اگر بالفرض دنیا سے تاریخ کی تمام کتابیں ناپید بھی ہو جائیں۔ اور ہمارے پاس خلافت شیر خدا کے بارے میں علم کا کوئی دوسرا ذریعہ نہ رہ جائے تو صرف عقائد و کلام کی ہی کتابوں سے ہمارا یہ یقین مستحکم عقیدہ رہے گا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت حق ہے، کیوں کہ ائمہ اہل سنت میں اس بارے میں دو رائیں ہیں ہی نہیں اور عقائد کی ساری کتابیں اس باب میں متفق اللسان ہیں، اپنے اس مضمون میں ہم صرف اسی حیثیت سے نصوص پیش کریں گے کہ خلافت علی کے بارے میں اہل سنت و جماعت کا عقیدہ کیا ہے اور عباسی صاحب اس سے پھر کر مسلمانوں کو کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔ آیندہ اگر وقت نے ساتھ دیا تو اس کی تاریخی حیثیت سے بحث کی جائے گی پھر ایک مستقل مضمون میں یہ ظاہر کرنے کی کوشش ہوگی کہ ازالۃ الخفا و منہاج السنۃ کی جو عبارتیں عباسی صاحب نے نقل کی ہیں ان میں کچھ تدلیس ہے۔ فہم مطلب میں کوتاہی ہوگئی اور وہ عبارتیں قابل استناد بھی ہیں یا نہیں۔

خلافت کن کن طریقوں سے ثابت ہوتی ہے

(المقصد الثالث فیما ثبت بہ الامامۃ) انما تثبت بالنص من الرسول ومن الامام السابق بالاجماع، وتثبت ببیعۃ اھل الحل والعقد عند اھل السنۃ والجماعۃ. [شرح مواقف ۳۸۳/۸، دار الکتب العلمیۃ]

رسول اللہ ﷺ یا امام سابق کی نص اور بیان کر دینے سے کہ میرے بعد فلاں خلیفہ ہوگا امامت ثابت ہو جاتی ہے اور اہل حل و عقد کی بیعت سے۔

"الامامۃ تنعقد من وجھین احدھما باختیار اھل الحل والعقد والثانی بعھد الامام من قبل."

[الاحکام السلطانیہ لابی الحسن علی بن محمد الماوردی ۱۵، المکتبۃ العصریۃ بیروت]

امامت منعقد ہونے کے دو طریقے ہیں اہل حل وعقد کا بیعت کر لینا اور گزشتہ امام کی وصیت کا موجود ہونا۔

وتنعقد الخلافة بوجوه، بيعة اهل الحل والعقد من العلماء و الرؤسا وامرا الاجناد ممن يكون له راى ونصيحة للمسلمين كما انعقدت خلافة ابي بكر رضى الله تعالىٰ عنه، وبان يوصى الخليفة الناس به كما انعقدت خليفة عمر رضى الله تعالىٰ عنه، او يجعل شورى بين قوم كما كان عند انعقاد خلافة عثمان بل على رضى الله تعالىٰ عنه أيضاً او استيلاء رجل جامع للشروط على الناس وتسلطه عليهم. [حجۃ اللہ البالغہ ۲/۳۹۸/دار احیاء العلوم بیروت]

خلافت چند طریقوں سے قائم ہوتی ہے، اہل حل وعقد، علما ورؤسا اور سرداران فوج میں جو لوگ صاحب رائے اور مسلمانوں کے خیر خواہ ہوں۔ ان کی بیعت جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت منعقد ہوئی اور اس طرح کہ خلیفہ لوگوں کو کسی کے بارے میں وصیت کر جائے جیسے حضرت عمر کی خلافت، یا کسی قوم میں مجلس شوریٰ کے ذریعہ ہو جیسے حضرت عثمان بلکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی خلافت، یا کوئی ایسا آدمی جو خلافت کے شرائط پر پورا اترتا ہو خود بخود لوگوں پر غالب آجائے۔

مذکورہ بالا کتابوں میں اول الذکر خالص عقائد کی کتاب ہے اور بقیہ دونوں کتابیں مسائل شرعیہ اور سیاست دونوں کی جامع، شاہ صاحب نے انعقاد خلافت کی صرف ایک شق استیلا کا اضافہ کیا ہے ورنہ انہیں دو وجہوں کو پھیلا کر بیان کر دیا ہے، مثلاً علامہ ماوردی اور صاحب شرح مواقف نے جس چیز کو بیعۃ اہل الحل والعقد سے بیان کیا ہے اسی کو شاہ صاحب نے دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ بیعت اہل حل وعقد اور شوریٰ قوم۔

خلاصہ یہ کہ نصب امام کے دو بنیادی طریقے ہیں: رسول یا امام سابق کی کسی شخص کے بارے میں نص یا اہل حل وعقد کا اجماع۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ حضور مولائے کائنات رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت وخلافت کا ثبوت ان دونوں طریقوں سے کسی طریق پر ہے یا نہیں۔ اس کے

لیے ہم بلا تبصرہ مختلف عقائد وکلام۔ نیز ائمہ اعلام کی کتابوں سے تصریحات نقل کرتے ہیں۔

شیر خدا کی امامت پر اہل حل وعقد کا اجماع ہے

ولما استشهد اتفق الناس بيعة على رضى الله تعالىٰ عنه. [شرح مواقف ۸/۳۹۲]

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تو لوگ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت پر جمع ہو گئے۔

﴿افضل البشر بعد نبينا ابو بكر الصديق ثم عمر الفاروق ثم عثمان ذوالنورين ثم على المرتضى وخلافتهم على هذا الترتيب.﴾

[عقائد نسفی ۱۴۶، ۱۴۷]

تمام لوگوں میں انبیا کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں پھر عمر فاروق اس کے بعد حضرت عثمان غنی تب حضرت علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا مرتبہ ہے اور خلافت بھی اس ترتیب پر ہے۔

ثم استشهد وترك الامر مهملاً فأجمع كبار المهاجرين والأنصار على علي والتمسوا منه قبول الخلافة وبايعوه لما كان أفضل أهل عصره اولٰهم بالخلافة وما وقع من الماخالفات والمحاربات لم يكن من نزاع فى خلافته بل عن خطأ فى الاجتهاد. [شرح عقائد ص ۱۴۸]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہو گئے اور خلافت کے بارے میں انہوں نے کوئی تصریح نہ فرمائی تو کبار مہاجرین وانصار نے جمع ہو کر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے گزارش کی اور آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، کیوں کہ اپنے زمانہ میں وہ سب سے افضل اور خلافت کے اہل تھے اور ان لوگوں میں باہم جو جنگیں اور مخالفتیں ہوئیں وہ خلافت کے بارے میں نہ تھیں، وہ تو اجتہادی غلطی تھی۔

واما خلافة علی رضی اللہ تعالیٰ عنه فكانت عن اتفاق الجماعة واجماع الصحابة لما روی أبو عبدالله بن بطة عن محمد بن الحنفية قال: كنت مع علی ابن ابی طالب رضی الله تعالیٰ عنه و كان عثمان بن عفان محصوراً، فاتاه رجل فقال: ان امیر المومنین مقتول الساعة قال فقام علی رضی الله تعالیٰ عنه فاخذت بوسطة تخوفاً علیه فقال: خل لا ام لک قال: فاتی علی الدار قد قتل عثمان رضی الله تعالیٰ عنه فاتی داره ودخلها فاغلق بابه فاتاه الناس فضربوا علیه الباب فدخلوا علیه، فقالوا: ان عثمان قد قتل، ولابد للناس من خليفة ولانعلم احدا احق بها منک، فقال لهم علی لاترید وانی فانی لکم وزیر خیر من امیر، قالوا والله لانعلم احداً احق بها منک، قال رضی الله تعالیٰ عنه فانابیهم وعلی فان بیعتی لاتکون سراً ولکن اخرج الی المسجد فمنشاء ان یبایعنی قال: فخرج رضی اللہ عنہ الی المسجد فبایعه الناس فکان اماماً حقاً الی ان قتل خلاف ماقالت الخوارج انه لم یکن اماماً قط تبألهم

[غنیۃ الطالبین ۱/۷۷، اصح المطابع بمبئی]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت صحابۂ کرام کے اجماع سے ثابت ہے کہ عبداللہ بن بطہ نے محمد بن حنفیہ سے روایت کی کہ میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ بیٹھا تھا اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ محصور تھے، ایک آدمی نے آ کر کہا حضور عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابھی ابھی شہید کر دیے گئے، حضرت علی نے کھڑے ہونے کا ارادہ کیا تو میں نے ان کی کمر تھام لی کہ لوگ کہیں ان کو بھی تکلیف نہ پہونچائیں، آپ نے فرمایا: تیری ماں نہ رہے مجھے چھوڑ، پھر اٹھ کر مقتل حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر تشریف لائے اور پھر اپنے گھر جا کر دروازہ بند کر لیا۔ لوگ آئے اور کہا حضرت عثمان شہید کر دیے گئے اور خلیفہ کا ہونا ضروری ہے اور آپ سے زیادہ اس کا کوئی اہل نہیں، اس لیے آپ بیعت کے لیے ہاتھ بڑھائیے آپ نے کہا: میں تمہارے بہ نسبت امیر کے وزیر اچھا رہوں گا، اس لیے مجھے معذور رکھو، جب لوگ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو

آپ نے فرمایا: میری بیعت علی الاعلان ہوگی پس آپ مسجد میں تشریف لائے اور لوگوں نے آپ کی بیعت کی، اس لیے آپ امام برحق ہوئے اور وقت شہادت تک امام برحق رہے، خوارج ان کے لیے بربادی ہو یہ کہتے ہیں کہ آپ کبھی خلیفہ تھے ہی نہیں۔

مذکورہ بالا عبارت میں اگر یہ دیکھا جائے کہ اس روایت کی تاریخی حیثیت اتنی مضبوط ہے کہ خود حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس پر اتنا اعتماد ہے کہ یہ روایت اپنی کتاب میں تخریج فرمائی اور اسی بنیاد پر کہ مولا کی خلافت کے برحق ہونے کا فیصلہ فرمایا۔ اس سے قطع نظر ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کان اماماً حقاً فرمایا، مزید ارشاد فرماتے ہیں:

ان علیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کان علی الحق فی قتالھم، لانہ کان یعتقد صحۃ امامتہ علی ما بیننا من اتفاق اھل الحل والعقد من الصحابۃ علی امامتہ وخلافتہ.

[غنیۃ الطالبین ۱/۷۷، اصح المطابع بمبئی]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے مقابل سے قتال میں حق پر تھے کیوں کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت علی کی خلافت کے حق ہونے کا اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ ہم نے بتایا کہ صحابہ میں اہل حل وعقد آپ کی خلافت پر متفق تھے۔

فالنبوۃ انقضت بوفاۃ النبی ﷺ والخلافۃ التی لا سیف فیھا مقتل عثمان والخلافۃ بشھادۃ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وخلع الحسن.

[حجۃ اللہ البالغہ ۲/۵۷۷]

نبوت حضور کے وصال سے ختم ہوگئی اور وہ خلافت جس میں تلوار نہ چلی شہادت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور خلافت کا خاتمہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت اور امام حسن کے خلافت چھوڑ دینے سے ہوا۔

قابل غور بات یہ امر ہے کہ اگر عباسی صاحب کا بیان صحیح ہے کہ ازالۃ الخفا میں شاہ صاحب نے فرمایا کہ خلافت حضرت علی کے لیے قائم نہ ہوئی تو حجۃ البالغہ میں جگہ جگہ ان کی

خلافت کا اثبات کس طرح فرمار ہے ہیں۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجیست

واما فی زمن علی رضی الله تعالیٰ عنه ومن نازعه فقد قطع الشرع ﷺ طول کم الخلافة بقوله علیه السلام واذا بویع للخلیفتین فاقتلوا الأخر منهما، العجب کل العجب من حق واحد کیف ینقسم ضربین، والخلافة یستجیم بنقسم ولابعرض یتفرق ولابجوهر بحد فکیف یوهب ویباع فیه حدیث هازم اول حکومة تجری فی المعاربین علی ومعاویة فیحکم الله لعلی بالحق والباقون تحت المشیئة وقول المشرع ﷺ لعمار تقتلک فیئة الباغیه فلاینبغی للامام ان یکون باغیاً والامامة لاتلیق لشخصین الربوبیة للاثنین.

[سر العالمین للغزالی ص ۱۱،۱۲]

حضرت علی اوران کے مخالفین کے زمانہ میں تو رسول اللہ ﷺ نے یہ کہہ کر خلافت کی امید دوسرے لوگوں کے لیے منقطع کر دی کہ جب دو خلیفہ کے لیے بیعت کی جائے تو بعد والے کو قتل کر ڈالو اور یہ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہی حق دو آدمیوں میں کس طرح تقسیم کیا جائے خلافت نہ تو جسم ہے کہ بٹے نہ عرض کہ متفرق ہو، نہ جوہر کہ اس کی حد بندی ہو، تو اسے کس طرح بیچا جائے گا اور کس طرح ہبہ کیا جائے گا، اور اس باب میں ایک حدیث قطع نزاع ہے سب سے پہلا فیصلہ جو قیامت کے دن ہوگا حضرت علی و معاویہ رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین میں ہوگا تو خدا حضرت علی کے حق میں فیصلہ کرے گا اور بقیہ تحت مشیت الٰہی ہوں گے، نیز رسول اللہ ﷺ کا قول ہے عمار تجھے باغی گروہ قتل کرے گا، تو امام باغی نہیں ہوسکتا پس امامت دو آدمیوں کے لیے نہیں ہوسکتی جس طرح ربوبیت دو کے لیے نہیں۔

اس عبارت میں کس وضاحت سے امام غزالی فرماتے ہیں: بیعت اولیٰ حضرت علی کی تھی اور وہی حق ہے، اس کے بعد دوسرے کی بیعت کا امکان ہی ختم ہے جیسا کہ حکم رسول ہے، یونہی حدیث رسول ہے کہ حضرت عمار کو باغی گروہ قتل کرے گا (باغی کے جو معنی بھی ہوں) پس

جن لوگوں نے حضرت عمار کو قتل کیا، کیا امام حق ہوں گے؟

والذی یدل علی امامة علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتفاق اهل الحل والعقد علی امامته. [اصول معالم الدین للرازی ص ۱۷۹]

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت کی حقانیت پر اہل حل وعقد کا اتفاق دلالت کرتا ہے۔

والخلاف العاشر فی زمان علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بعد الاتفاق علیه وعقد البیعة له فاوله: خروج طلحة والزبیر الی مکة ثم حمل عائشة الی البصرة ثم نصب القتال معه ویعرف ذلک بحرب الجمل والحق انهما رجعا وتابا اذ ذکرهما امراً فتذکراه. پھر چند سطر بعد بقاء الخلافة الی وقت الوفاة مشهور. [الملل والنحل ۱/۳۴۔دار ومکتبۃ الہلال بیروت]

دسواں اختلاف حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت میں ان پر اتفاق کے بعد ہوا تو حضرت طلحہ وزبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم مکہ گئے۔حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو لیا بصرہ پہونچے اور حضرت علی کے ساتھ جنگ کی جس کو جنگ جمل کہتے ہیں، لیکن صحیح یہ ہے کہ ان دونوں حضرات نے رجوع کیا، ان لوگوں کو یہ بات یاد دلائی گئی تو نصیحت قبول کرلی، امور مولا کی خلافت ان کے وفات کے وقت تک رہی، یہ ایک امر مشہور ہے۔

پس ان تصریحات کی روشنی میں ایک لحظہ کے لیے بھی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اہل سنت وجماعت میں امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہ کی خلافت کے بارے میں کوئی ادنیٰ شبہ بھی کیا جاسکتا ہے، اور جو شخص خلافت علی کے بارے میں یہ باور کرانا چاہے، اس کا تعلق مذہب حق اہل سنت وجماعت سے بھی ہوسکتا ہے؟ ہاں اس سواد اعظم کا تیرہ صد سالہ عقیدہ تباہ کردیا جائے اور پھر نئے سرے سے کوئی شریعت گڑھی جائے تو اور بات ہے۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہان حرم بے توفیق

فلسفہ شہادت

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

(۱)

فرض کرو کہ ایک دانش مند آدمی کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گیا جس کے لیے حکیم نے داروئے تند و تلخ تجویز کی، دوا کی تلخی سے مریض کا دم گھٹتا ہے اور وہ دوا کا پیالہ بار بار لبوں تک لے جا کر اضطراراً ہٹا لیتا ہے اور ایک دفعہ نفرت سے دوا کی طرف سے منہ بھی پھیر لیتا ہے لیکن اسے دوا پلانے کے لیے کسی سختی کی ضرورت نہیں، ہوشیار مریض کے سامنے صرف مرض کی ہلاکت خیزی اور دوا کی تاثیر نیز اس کے فوائد بیان کر دینے کافی ہیں اور وہ دوا پینے لگے گا۔ دوسرا مریض ایک ضدی بچہ ہے جو میٹھی سے میٹھی دوا کو بھی اپنی ضد سے پینا نہیں چاہتا، لیکن وہی دوا کا پیالہ لے کر جب اس کی ماں سامنے آتی ہے اور چمکار کر پیار بھرے انداز میں دوا کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگا دیتی ہے تو وہ چپ چاپ دوا پینے لگتا ہے کیوں کہ اسے ماں سے بے حد محبت ہے اور وہ اس کی بات ٹال نہیں سکتا، لیکن اکثر کوئی شریر بچہ ہو جسے ماں کی محبت بھی رام نہ کر سکے تو اس کے لیے باپ کی تہدید آمیز نگاہیں اور تادیب بھرا ہاتھ ہی چاہیے تاکہ وہ دوا پی لے اور مرض کی ہلاکت سے نجات پائے۔

اب فرض کرو کہ ایک ایسا آدمی ہے جسے نہ تو ماں کی محبت درست کر سکے، نہ باپ کی تادیب سدھار سکے، نہ کسی خیر خواہ کی افہام و تفہیم سے ہی وہ دوا کا پیالہ منہ سے لگا سکے تو اس کے لیے ایک آخری اور نفسیاتی علاج درکار ہوگا، مریض بار بار دوا کا پیالہ پھینکتا ہے اور تیماردار بار بار پلانا چاہتا ہے، اس جدوجہد میں بیمار ہاتھ پیر بھی چلانے لگتا ہے جس سے تیماردار کو سخت چوٹ آتی ہے، لیکن تیماردار دھن کا پکا اپنے زخموں سے بے نیاز دوا کا پیالہ ہاتھ میں لیے مریض کے ہونٹوں سے لگانے کی کوشش کر رہا ہے، تب تیماردار کا خون آلود چہرہ دیکھ کر مریض کی انکاری قوت ارادی

ختم ہو جاتی ہے اور قوت مدافعت کے باوجود وا پنے لگتا ہے۔

(۲)

انسانی سوسائٹی کا مزاج بھی کچھ انہیں عناصر سے ترکیب پاتا ہے، اس میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جنہیں روحانی اور اخلاقی عوارض سے نجات دلانے کے لیے صرف افہام و تفہیم کافی ہوتی ہے اور ان کے سامنے راہ حق واضح ہو جاتی ہے، اور کتنے ایسے ہوتے ہیں جن کی نیک قوتوں کو ابھارنے کے لیے افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ محبت کا سہارا بھی لینا پڑتا ہے۔ اور کتنے شریر انسانوں کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے کے لیے تلوار بھی ہاتھ میں لی جاتی ہے۔ اور کتنوں کا غرور توڑنے کے لیے آخری اور سب سے مؤثر نفسیاتی علاج جان کی قربانی بھی ناگزیر ہو جاتی ہے، اسی لیے ہادیان مذاہب کا قافلۂ رشد و ہدایت بھی افہام و تفہیم کی شاہ راہ سے چل کر طاقت و محبت کا سہارا لیتا ہوا جانبازی کی منزل مقصود پر پہونچتا ہے تب مخاطب پر اتنا گہرا نفسیاتی اثر ہوتا ہے کہ مخاطب صفوں سے ٹوٹ کر حق کے ساتھ آ ملتے ہیں اور سفاک قوم کو یہ اندوہ ناک احساس ہوتا ہے کہ حق کی راہ میں جان دینے والوں کی شکست نہ ہوئی بلکہ دراصل ہم ہی ہار گئے۔

اور یہی جان کی قربانی ہے جسے اسلام اس کی بے پناہ طاقت اور لازوال تاثیری قوت کی بنا پر شہادت کے مبارک نام سے یاد کرتا ہے، اور یہی شہادت ہے جو ہر سچے مسلمان کی تمناؤں کی جیت اور جہان آرزو ہے جس کی سچی تڑپ ہی ہر مسلمان کو سہارا دیتی ہے اور جس کا ساغر لالہ رنگ ہر مومن آب حیات کی سی خوشگواری کے ساتھ پیتا ہے۔

شہادت آخری منزل ہے انسانی سعادت کی
وہ خوش قسمت ہیں مل جائے جنہیں دولت شہادت کی
شہادت پاتے ہی ہستی زندۂ جاوید ہوتی ہے
یہ رنگیں شام صبح عید کی تمہید ہوتی ہے

پس شہادت دراصل تبلیغ و ہدایت کے ایک نفسیاتی طریقے کا نام ہے جس میں آدمی ایک سچے نصب العین کو سنوارنے کے لیے اپنے خون کے قطروں سے آخری مہر تصدیق ثبت

کرتا ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مخالف قوتوں کا زور گھٹ جاتا ہے، بلکہ تحریک میں بھی نئے سرے سے جان آجاتی ہے اور عرصۂ دراز تک کے لیے باطل کی دسیسہ کاریوں سے حق مامون و محفوظ ہوجاتا ہے بلکہ باطل اپنی موت آپ مرجاتا ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

بظاہر یہ بات الٹی معلوم ہوتی ہے کہ ایک شخص جو کسی نصب العین کی حمایت میں جان دیتا ہے اس میں یہ قوت کہاں سے آجاتی ہے جو مخالف فوجوں کی تلواریں سخت دشمن کو بھی حق کی حمایت پر آمادہ کردیتی ہے، لیکن اک ذرا غور وفکر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ شہید کے لہو کی بوند تلوار کو کند نہیں کرتی اس ہاتھ کو ہی شل کردیتی ہے جو تلوار کو حرکت دیتا ہے، نیزہ کی انیاں تو برقرار رہتی ہیں لیکن اس دل کا حوصلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے جو نیزہ چلانے پر ضرور مجبور ہوجاتا ہے کہ مرنے والے کے لب پر آخری وقت بھی فاتحانہ مسکراہٹ آخر کیوں تھی، کیا واقعی اس نصب العین میں اتنا دم ہے کہ انسان پر موت کی تلخیاں تک جو شگوار ہوجاتی ہے ع

جان کیا جسم سے نکلی کوئی ارماں نکلا

یا بالفاظ دیگر تبلیغ کے دوسرے ذرائع مخاطب کے دماغ کو اپیل کرتے ہیں تو شہید کا لہو براہ راست قاتل کے دل کو جھنجھوڑ ڈالتا ہے اور اس کے نفسیات میں ایک طوفان انقلاب برپا کردیتا ہے، ورنہ مسلمان کا خون (جو خدا کی بارگاہ میں سارے عالم کی قیمت سے بھی بھاری ہے) یوں بہانے کا حکم خود خدا نہ فرماتا، ہاں جب اس کی کمند براہ راست دل پر پڑتی ہے (جو سارے عالم میں عرش الٰہی اور بیت الرحمٰن ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے) تو اس قطرۂ خون کی پوری قیمت مل جاتی ہے اور خون شہیداں کی یہی نفسیاتی اثر انگیزی ہے جو شاعروں کی زبان میں حسن عالمگیر و رعنائی دلنواز بن جاتی ہے۔

شہادت حسن عالم گیر ہے مردان غازی کا مسلمانوں کے خوں میں ہے سلیقہ دلنوازی کا

(۳)

مسافر کربلا شہید محترم امام مظلوم کا ایک تو وہ مادی سفر تھا جو مدینہ کی جاں نواز گلیوں سے

شروع ہوکر فرات کے کنارے آپ کے تشنہ کام قتل بظاہر ناکامی پر ختم ہوا، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کے جلو میں تبلیغ وہدایت کا ایک مبارک اور مسعود کارواں بھی تو تھا جو باطل کے خلاف آپ کی افہام وتفہیم سے شروع ہوکر فرات کے کنارے آپ کی شہادت خونی پر ختم ہوا اور کامیاب ختم ہوا۔

چناں چہ جب آپ نے مقام بیضہ پر اپنا تاریخی خطبہ دیا کہ

اے لوگو! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی ایسے حاکم دیکھے جو ظلم کرتا ہے، خدا کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے، عہد الٰہی کو شکست کرتا ہے، سنت نبوی کی مخالفت کرتا ہے، اور خدا کے بندوں پر بھی گناہ سرکشی سے حکومت کرتا ہے اور دیکھنے پر بھی نہ تو اپنے فعل سے اس کی مخالفت کرتا ہے نہ اپنے قول سے تو خدا ایسے آدمی کو اچھا ٹھکانہ نہ دے گا، دیکھو یہ لوگ شیطان کے پیرو بن گئے رحمٰن سے سرکش ہوئے، فساد ظاہر ہے، حدود الٰہی معطل ہیں، مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے، ان کی سرکشی کو حق وعدل سے بدل دینے کا میں حق دار ہوں [تاریخ الطبری ۲۱۵/۶]

یا ایک خطبہ میں آپ نے فرمایا:

افسوس! دیکھتے نہیں کہ حق پس پشت ڈال دیا گیا، باطل پر اعلانیہ عمل کیا جارہا ہے، لیکن کوئی ہے جو اس کا ہاتھ پکڑے، وقت آگیا ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقائے الٰہی کی خواہش کرے لیکن میں شہادت کی موت چاہتا ہوں، ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود جرم ہے۔ ایضاً

تو ان خطبات میں آپ نے وقت کے سب سے بڑے مجرم یزید اور عظیم گناہ شہنشاہیت کے خلاف حق کو افہام وتفہیم کے ذریعہ مخالفین کو منوانے کی جدوجہد فرمارہے تھے اور رشد وہدایت کے سلسلہ میں لوگوں کے دماغ کو اپیل کررہے تھے، اور جب آپ نے میدان جنگ میں دشمنوں کی صفوں کے سامنے دل ہلادینے والا ایک خطبہ دیا۔

لوگو! میرا حسب ونسب یاد کرو، سوچو کہ میں کون ہوں، پھر اپنے گریباں میں منہ ڈالو اور اپنے ضمیر کا محاسبہ کرو، خوب غور کرو کیا تمہارے لیے میرا قتل کرنا اور میری حرمت کا رشتہ توڑنا روا ہے، کیا میں تمہارے نبی کی لڑکی کا بیٹا، ان کے عم زاد کا بیٹا نہیں ہوں، کیا سید الشہداء حمزہ میرے

باپ کے چچا نہیں تھے، کیا ذوالجناحین جعفر طیار میرے چچا نہ تھے، کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کا یہ مشہور قول نہیں سنا کہ آپ میرے اور میرے بھائی کے حق میں فرماتے: ھذان سیدا شباب اھل الجنة اگر میرا یہ بیان سچا ہے تو بتلاؤ کیا تمہیں برہنہ تلواروں سے میرا استقبال کرنا چاہیے، تمہیں یاد نہ ہو تو جابر بن عبداللہ، ابو سعید خدری، سہل بن سعد ساعدی، زید بن ارقم، مالک بن انس سے پوچھو، وہ میری تصدیق کریں گے، کیا یہ بات بھی میرا خون بہانے سے نہیں روک سکتی واللہ اس وقت روئے زمین پر میرے علاوہ کسی نبی کی بیٹی کا لڑکا موجود نہیں۔

تو آپ نے رسول اللہ ﷺ کی بے پناہ محبت کا سہارا لے کر یقین کے دل کو حق کی طرف متوجہ کرنا چاہا، اور ایک ایک مقتدر اسلامی ہستیوں کا نام لے لے کر محبت کی دبی ہوئی چنگاری کو اکسانا چاہا، یونہی خداوند قدوس کے قہر و غضب اور غیر متناہی طاقت سے ایک ایک کو ڈرایا، لیکن تبلیغ کی ان تمام درمیانی راہوں سے کما حقہ فائدہ نہ ہوسکا، کبھی تو آپ کو موت کی دھمکی دی جاتی کبھی کہا جاتا کہ اپنے کو ہمارے حوالے کردو، حد ہوگئی پانی روک لیا گیا، ایک ایک دانہ پر کڑا پہرہ لگا دیا گیا، اور ازلی بدبخت تلواریں سونت سونت کر آگے بڑھنے لگے لیکن شہادت کی تمہید شروع ہی ہوئی تھی کہ کایا پلٹنا شروع ہوگئی، چناں چہ جب آپ نے اتمام حجت کرلیا اور اونٹنی کو بٹھا کر اس کی کونچیں بندھوا دیں اور شامی افواج کی سرکش آندھی اور کڑکتی بجلیوں کے سامنے ایک شان جاں نثاری اور استغنا کے ساتھ کھڑے ہوگئے تو حر بن یزید گھوڑے کو ایڑ لگا کر دشمن کی فوج سے نکلے اور امام حسین کی خدمت میں پہونچ کر کہا: یا ابن رسول اللہ، میں وہی بدبخت ہوں جس نے آپ کو لوٹنے سے روکا اور راستہ بھر آپ کا پیچھا کیا اور اس جگہ اترنے پر مجبور کیا، میں اپنے قصور پر نادم ہوں اور یہ دیکھ کر کہ لوگ آپ کا خون بہانے کے لیے تیار ہیں توبہ کے لیے آیا ہوں، میں آپ کے قدموں پر قربان ہونا چاہتا ہوں، کیا آپ کے خیال میں میری توبہ کے لیے یہ کافی ہے، آپ نے شفقت سے فرمایا: خدا تیری توبہ قبول کرے اور تو حر ہے جیسا کہ تیری ماں نے تجھے آزاد جنا، چناں چہ دنیا نے بھی یہ نظارہ دیکھا کہ امام عالی مقام پر جان نچھاور کرنے والوں کی پہلی صف میں حر کا ٹکڑے ٹکڑے کیا ہوا جسم بھی تڑپ رہا ہے اور آپ کی شہادت عظمیٰ کی

تکمیل ہوتے ہوتے تو ایک طوفان انقلاب اٹھ کھڑا ہوا، زمین خون کے آنسو روئی، آسمان سے آگ برسی اور کل تک امام کی بات سننے کے لیے روادار نہ تھے بلکہ آپ کے خلاف شامیوں کی طرف سے تلوار کھینچ کر آتے تھے انہیں میں یزید کے ظالمانہ تسلط کے خلاف بغاوت کے شعلے اٹھنے لگے، مدینہ میں سارے انسانوں میں آگ لگ گئی، مکہ میں میدان جنگ قائم ہو گیا اور کوفہ میں ایک ایک یزیدی تلاشی کر کے قتل کیا گیا اور تھوڑا زمانہ بھی گزرنے نہ پایا تھا کہ ابن زیاد کا سر کوفہ کی دارالامارت میں مختار ثقفی کے سامنے رکھا تھا اور بعد میں آنے والوں نے بنو امیہ کی ہڈیاں قبروں سے نکلوا کر پامال کیں۔ [تاریخ الطبری ۲۲۸/۶ ملخصا دار الفکر بیروت]

خلاصہ کلام یہ کہ آپ کی شہادت نے وہ کام کیا جو افہام و تفہیم، طاقت و محبت کے مظاہرہ سے نہ ہوا تھا، جب تک آپ سمجھاتے رہے یزید کی ناجائز حکومت اور اس کی برائیاں لوگ نہ سمجھ سکے لیکن جیسے ہی آپ شہید ہوئے سب کی سمجھ میں آ گیا، اس سے شہادت کی اہمیت اور اس کی عالی مقامی کا اندازہ ہوتا ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے شہدا کو ایک امتیازی درجہ دیا۔

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِن لَّا تَشْعُرُونَ﴾ [البقرہ: ۱۵۴]

شہیدان ملت کو مردہ مت کہو وہ مر کر زندہ جاوید ہو گئے یہ اور بات ہے کہ تم سمجھ نہ سکو۔

اور پیغمبر اسلام ﷺ نے خود شہادت کی تمنا فرمائی:

والذی نفسی بیدہ لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل ثم احیی ثم اقتل . [مشکاۃ کتاب الجہاد ۳۲۹/]

خالق کائنات کی قسم میری تمنا تو یہ ہے کہ راہ خدا میں بار بار مارا جاؤں اور ہر بار مجھے زندگی ملے اور پھر شہید کیا جاؤں۔

ہزار جان فدائے دلے کہ من از شوق   بخاک و خوں پتم و گوئی از برائے من است

کربلا کی ضرورت

انسانوں کی دوستی خواہ دوسرے انسان سے ہو یا کسی دستور سے اس کا عام مذاق کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جب ہمارے یہاں آؤ گے تو کیا لاؤ گے اور جب ہم تمہارے یہاں جائیں گے تو کیا کھلاؤ گے، ہر چیز کی دوستی میں پہلے اپنا فائدہ تصور کیا جاتا ہے، بلکہ اپنا فائدہ ہی دیکھا جاتا ہے دوستی دوسروں کو فائدہ پہنچانے یا دستور کو باقی اور زندہ رکھنے کے لیے نہیں کی جاتی۔

حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ سے کسی نے عرض کی حضور آج کل دوست نہیں ملتے، آپ نے فرمایا: کہ یا اس لیے دوست نہیں ملتے کہ وہ تمہاری حمایت اور غم خواری کریں، یا اس لیے نہیں ملتے کہ تم ان کی حمایت اور غم خواری؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جنید بغدادی علیہ الرحمہ کو بھی وقت کے اس عام مذاق سے شکایت تھی۔ آج اسلام سے دوستی کرنے والے اور دستور اسلام کی حمایت کا دم بھرنے والوں کی اسلام دوستی کی عام روش بھی ایسی ہی ہے، اور یہی جذبہ ہے جو مسلمانوں کے منہ سے اس قسم کی آواز نکلواتا ہے، اگر مسلمان خدا کی برگزیدہ اور محبوب مخلوق ہے، اگر اسلام اللہ رب العزت کا پسندیدہ مذہب ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان دنیا کے مصیبت زدوں میں سب سے زیادہ مظلوم اور درماندہ ہے جب کہ کفر و طغیان کے ہر گھر میں عشرت کی شمعیں روشن ہیں اور نشۂ عیش کے پیمانہ سے ظلم کی شاخیں لچک رہی ہیں۔

مذکورہ بالا جملوں سے خود غرضی کی بو صاف محسوس کی جا سکتی ہے حالاں کہ جس طرح اسلام دوستی سے ہر مسلمان اپنا ذاتی فائدہ سوچتا ہے اسلام دوستی کا ایک بلند مقصد یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسلام ایک حقیقت ابدی ہے، اسلام خالص سچائی ہے، اسلام انسان کی فطری حالت ہے، اور فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی شہادت دی جائے۔ سچائی کو اجاگر کرنا ہی سب سے اہم مقصد حیات ہے، اور حقیقت کے چہرے سے نقاب اٹھا دینا ہی سب سے بڑی عبادت ہے، اس لیے اسلام کی صداقت کی بنا پر اس کا جاری و نافذ کرنا ہی اس کی دوستی کا سب سے بڑا مقصد ہے

اور قرآن عظیم نے بھی ہر اسلام دوست کا یہی امتیازی کارنامہ بتایا ہے۔

اے مسلمانو! تمہارا یہی امتیازی نشان ہے کہ تم اسلام کے قیام ونفاذ کی کوشش میں ہر دم لگے رہتے ہو اور حق یہ ہے کہ جس دن مسلمان نے اسلام کو اس نظریہ کے ساتھ اپنایا تو دنیا کے مصائب کے بارے میں اس کا انداز فکر بدل جائے گا، عمل کی راہیں متغیر ہو جائیں گی، اور اس کی ہر حرکت وسکون میں ایک تازی روح دوڑ جائے گی، اور وہ سچ مچ اس راز کو پالے گا کہ زخم کھا کر رونا بھی ٹھیک ہے لیکن مسکرانے میں کچھ اور لذت ہے، گالی کا جواب گالی سے دیا جاتا ہے، لیکن دعا دینے کی چاشنی کا کیا کہنا، اور وہ یہ سمجھ جائے گا کہ مال جمع کرنا اور اس سے کسی کے احسان کا بدلہ چکانا بلا شبہ اچھا کام ہے، لیکن بلا غرض دے کر سائل کے لیے دعائے خیر کرنے میں جو کیف ہے وہ دعا لینے میں کہاں، حتی کہ وہ نقد جان دے کر بھی سوچے گا کہ چلو منافع ہی رہا ہے۔

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی\
قلندر مایۂ ہستی لٹا کر رقص کرتا ہے

کیوں کہ یہ حقیقت اس کے سامنے آجائے گی کہ جب بھی انسان نے کوئی خودساختہ مادی انقلاب لانا چاہا، کسی ایک مملکت کا نقشہ بدلنا چاہا، تلواریں میان سے نکل آئیں، نیزوں کی انیاں چمکنے لگیں، اور قسم قسم کے بموں سے دھرتی کا کلیجہ پاش پاش ہونے لگا، اور نقشے پر نئی لکیر کھینچنے سے پہلے سرحد پر خون کے سمندر سے حد بندی کرنی پڑتی ہے، بالفاظ دیگر مادی آزادی کا سورج اپنے ستاروں کے خونی سمندر سے ہی سر ابھار کر مسکراتا ہے۔ اور شہنشاہ حریت اپنے پجاریوں کی لاش پر اپنا تخت عظمت بچھاتا ہے، پھر جب دنیا کے مادی انقلابوں کا یہ حال ہے، فانی دستور کی دوستی اتنی قربانی چاہتی ہے، تو اسلام جو ہستی کے داغدار چہروں کو صاف کرنا چاہتا ہے، حیات کی برہم زلفوں کو سلجھانا چاہتا ہے، راہ عمل کے ہر ہر پیچ وخم اور ہستی کے ہر موڑ پر مینارۂ نور روشن کرنا چاہتا ہے، بالفاظ دیگر اسلام ایک نیا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے، ایک حیات بخش انقلاب لانا چاہتا ہے، زندگی کی فطری قدروں کو ابھارنا چاہتا ہے، اور ایک محکم اور بے مثال زندگی کا پروگرام نافذ کرنا چاہتا ہے۔ (جو ہر ہر قدم پر انسانی اقدار سے متصادم ہوتا ہے) پس

اسلام کا حمایتی اور اس کا دوست بھی جب اسلام دوستی کے اس بلند مقصد کے ماتحت اس کے نفاذ وقیام کا علم لے کر اٹھے گا تو کیا حوادث کا سامنا نہ کرنا پڑے گا، تلواروں کی بجلیاں نہ کوندیں گی کہ برچھیوں کے ستارے نہ چمکیں گے، حوادث کی موجیں نہ بلند ہوں گی کہ بغاوت کی آندھیاں نہ آئیں گی۔ اور حق تو یہ ہے کہ پرستاران اسلام کے خلاف طوفان کا زیادہ امکان اور حوادث کا زیادہ خطرہ ہے، کیوں کہ دنیا کا ہر نظام اپنے ماحول کے ساتھ سازگاری کر سکتا ہے، اردگرد سے صلح کر سکتا ہے، لیکن اسلام میں زمانہ کے ساتھ سازگاری کا کوئی سوال ہی نہیں، اسلام کی راہ میں جد وجہد جاری رکھو، تا آں کہ اسلامی دستور کی سیادت سب کو مسلم ہو جائے۔

حدیث بے خبراں ہے تو بازمانہ بساز
زمانہ با تو نہ سازد تو بازمانہ ستیز

اسلام ماحول کا پابند نہیں، یہ اپنا ماحول خود پیدا کرتا ہے، خواہ اس کی قیمت کچھ ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

بنالیتا ہے اکثر خون دل سے ایک چمن پیدا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

اور اسلام کا جو جتنا حامی ہوگا وہ اتنا ہی مبتلائے مصائب ہوگا، اسے ہر فرسودہ نظام سے ٹکر لینی ہوگی، مخالف تھپیڑوں سے الجھنا ہوگا، اور ہر سیلاب مصائب کو خوش آمدید کہنا ہوگا۔ ارشاد نبوی ہے: ہادیوں کا سب سے مکرم گروہ، انبیا سب سے زیادہ مبتلائے مصائب، پھر اسی تناسب سے جو جتنا بڑا حمایتی ہوگا اسی مقدار سے مبتلائے آلام ہوگا۔ اور خود اسلام نے بھی جا بجا اپنے پرستاروں، دوستوں اور حمایتیوں نیز محبت کا دم بھرنے والوں سے اسی قسم کا مطالبہ کیا ہے اور انتباہ بھی دیا ہے۔ ایمان والے صرف یہ سمجھتے ہیں کہ صرف کلمہ پڑھ لینے سے ان کی نجات ہو جائے گی اور وہ آزمائے نہ جائیں گے، ہم ضرور ان کو خوب بھوک اور مال کے نقصان نیز جانی اور اعزازی تکلیفوں کے ذریعہ آزمائیں گے اور یہ تو دستور رہا ہے۔

گزشتہ دین داروں کو بھی مرض فقیری اور دشمنوں کی عداوت نے ہر طرف سے گھیر رکھا

تھا اور وہ خوب خوب جھنجھوڑے گئے تھے، تم بھی انہیں منازل سے گزر کر جنت میں پہنچ سکتے ہو۔ پس یہ امر خوب روشن ہو گیا کہ اسلام لانے کے بعد یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ مصائب کا خاتمہ ہو گیا اور اب ہمیں دنیا میں ہی جنت دے دی گئی، بلکہ سمجھنا چاہئے کہ مزید شدائد و مخالفت کو آواز دے دی گئی اور گویا مصائب کو ایک طرح کا چیلنج کیا گیا۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

ہاں اسلام سے پہلے انسان بزدل تھا، مصائب سے مقابلہ کرنے کی اس میں تاب نہ تھی اور اب اسلام نے اسے جری اور طوفانوں سے کھیلنے کا عادی بنا دیا ہے، اور حوادث سے ہی دوچار ہونے میں اسے مزہ آتا ہے۔

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

جب ہم اسلام اور اس کے سچے حمایتیوں کے متذکرہ بالا موقف کا تصور کرتے ہیں تو ہمیں اسلام کی تاریخ کے اس خونی ورق پر کوئی اچنبھا نہیں ہوتا جس کی روشنائی کے لیے خاندان رسالت کا خون نچوڑا گیا۔ اور تحریر کے لیے کربلا کی زمین منتخب کی گئی۔

اللہ اللہ، صبح کربلا کا یہ ہوش ربا نظارہ جس کے گلے کو پیغمبر اسلام کے لب فرط محبت سے چومتے تھے اس کو زبان خنجر نہایت بے باکی سے چاٹے، جس لب کو محمد عربی بوسہ دیں عبداللہ ابن زیاد کی چھڑی کو اس کے ساتھ گستاخی کی جرأت ہو، جو رسول کے کاندھے پر سوار ہوں اور نبی رحمت اس ادائے دلبری کی داد دیں، نعم الراکب: بڑا پیارا سوار ہے، اسی جسم کو گھوڑے روندیں، تین شبانہ روز بے گور و کفن پڑا رہے، جن کی عصمت کے دروازے پر فرشتے اجازت لے کر قدم رکھیں، انہیں قیدی بنایا جائے، اتنا بڑا ظلم اتنا بڑا اتیاچار وقت کے سب سے مقدس انسان اور ایک سچے مسلمان بلکہ بانئ اسلام کے جگر گوشہ کے ساتھ جو تمام کرامتوں کا مستحق، تمام آسائشوں کی اصل اور جائز عیش و عشرت کے لائق ہر طرح ہو، لیکن اسلامی دوستی کہتی ہے ایسا ہونا ہی چاہیے اگر

وادی نینوا سے حضرت امام حسین کا قافلہ صحیح وسالم لوٹا آتا تو اسلامی دوستی کا کارواں لٹ جاتا، اگر امام مظلوم ۱۰ر محرم ۶۱ھ کی شام تک زندہ رہتے تو اسلام کی محبت مر جاتی اور خود شجر اسلام کی ڈالیاں سوکھ جاتیں، پتیاں جھڑ جاتیں اور پھول مسکرانا چھوڑ دیتے، اس لیے کربلا کا قائم ہونا ہی ضروری تھا۔

اور سچ تو یہ ہے کہ معرکہ کربلا کے ایک ایک واقعہ سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ امام حسین کی اسلامی دستور سے وفاداری کا مقصد دنیا میں اپنا ذاتی فائدہ نہ تھا بلکہ اسلام کا نفاذ اور اس کی حمایت ہی اسلامی دوستی کی اصلی غایت تھی، اس لیے تمام مصائب کو آپ نے خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔

چناں چہ جب آپ نے دیکھا کہ ایک زانی اور شرابی، حدود اللہ کو بری طرح تہس نہس کر رہا ہے، ساتھ ہی قیصر و کسریٰ کی ملعون و مکروہ آمریت کا مہلک انجکشن بھی برابر خلافت اسلامیہ کے جسم میں داخل کر رہا ہے، تو سب سے پہلے آپ ہیں جنھوں نے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور باوجودے کہ عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر تمام ہوا خواہوں نے آپ کو کوفہ جانے سے روکا اور طرح طرح کے اندیشے آپ کے سامنے رکھے، لیکن جس سردار اسلام کی اسلامی دوستی کا مقصد صرف حمایت اسلام ہو وہ خطرات کو خاطر میں کیسے لاتا، خصوصاً جب کہ وہ دیکھ رہا ہے کہ ظلم کی اس آندھی کے مقابلے میں تمام سر جھک گئے ہیں، اسلام کی اکثریت نے جبراً قہراً یا برضا و رغبت اپنی مہار ایک ظالم کو سونپ دی ہے، زبانوں نے آمنا صدقنا کہا اور ہاتھوں نے بیعت کی، جو بچ رہے ہیں خاموش ہیں، اور وقت کا انتظار کر رہے ہیں، اس حال میں ایک ٹمٹماتی ہوئی روشنی اہل کوفہ کی طرف سے نظر آئی اور آپ نے اعلان حق کا فیصلہ فرما لیا، کیوں کہ آپ یہ جانتے ہی تھے کہ جب کبھی حق کی حمایت کا نام لیا گیا ہے۔ بجلیاں کوندی ہیں، تارے ٹوٹے ہیں، طوفان آئے ہیں، آج بھی طوفانی طاقتیں میرے خلاف گھٹا بن کر اٹھیں گی اور بادل بن کر چھائیں گی اور مجھے زخم کھا کھا کر مسکرانا پڑے گا، اور یہ تو اس کوچے کا پرانا دستور ہے۔

عشرت قتل گہہ اہل تمنا مت پوچھ
عید نظارہ ہے تلوار کا عریاں ہونا

اور کربلا کے میدان میں وہی ہوا، آسمان نے آگ برسانی شروع کی، زمین لاوا اگلنے لگی، بھوک نے ارادے کو شکست دینی چاہی، پیاس نے ولولوں کو دبا دینا چاہا۔ اور بد بخت شامیوں کی فوج نے ہر طرف سے نرغہ کرلیا، تلواریں سونت لی گئیں اور ہر طرح سے کوشش کی گئی کسی طرح سے امام عالی مقام کے پائے ثبات میں لغزش آجائے مگر اس سارے طوفانوں میں کرب وبلا میں وہ صبر واستقامت کا پہاڑ اپنی جگہ مسکراتا رہا، زخم کھاتا رہا، ہنستا رہا تکلیف اٹھاتا رہا اور دعا دیتا رہا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

قاسم سا نوجوان بڑے بھائی کی یادگار سامنے ہی تلوار کھا کر عماہ آہ اے چچا جان کہتا ہوا گرتا ہے، آپ بالیں پر پہنچے تو بھتیجے نے آنکھ کھولی اور کہا چچا جان پانی، اس سے زیادہ جگر گداز سانحہ کیا ہوگا، دم توڑتے ہوئے بھتیجے کو پانی نہیں پلا سکتے۔ مگر کیا امام مظلوم نے فریاد کی؟ جرأت واستقلال دیکھو، فرمایا: جان برادر آب کوثر سے سیراب ہونا اور انہیں اس طرح اٹھالائے کہ سر کندھے پر اور پیر زمین پر گھسٹ رہے تھے۔

اس سے فرصت ملی کہ دوسرا قیامت خیز منظر سامنے تھا، چھ ماہ کی ننھی سی جان علی اصغر شدت پیاس سے زبان باہر نکالے ایڑیاں رگڑ رہے تھے، اس خیال سے کہ شاید اس بے گناہ کی بے کسی پر ظالموں کو رحم آجائے، یزیدی فوج کے سامنے لے گئے اور ان کی حالت زار کو دکھا کر پانی مانگا، جواب میں ایک سنسناتا ہوا تیر آیا بچے کے گلے کو پار کرتا ہوا امام کے بازو سے پیوست ہوگیا، اللہ اللہ رے مصائب جھیلنے کی جرأت، بے جان پھول واپس لا کر ماں کی گود میں ڈال دیا اور فرمایا: بانو! لو خدا نے ہماری یہ چھوٹی قربانی بھی قبول کرلی، اب علی اصغر کو کبھی پیاس نہ لگے گی، بھائی بھتیجوں اور بھانجوں کے زخم ہی کیا کم تھے کہ ایک مزید السناک داغ بھی اٹھانا پڑا، اٹھارہ برس کا کڑیل جوان بیٹا علی اکبر، ہزاروں دشمنوں سے الجھا ہوا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے کسی بد نصیب کی برچھی سینہ کے پار ہوجاتی ہے، آپ دوڑے اور مارتے کاٹتے جب بالیں پر پہنچے تو نعش

مبارک کے ٹکڑے اڑ چکے تھے، نعش کی طرف رخ کرکے فرمایا: جان پدر مجھ سے پہلے ہی رخصت ہو گئے اور آسمان کی طرف نگاہ کر کے عرض کی:

مولا تو میرے صبر وضبط کا انتہائی امتحان لے رہا ہے، لیکن میں تیرے رسول کا ہی نواسا ہوں، اس ابتلا میں انشاء اللہ میرے قدموں میں لغزش نہ ہوگی، میرے معبود تیری رحمت نے مجھے تاکا تو

ہزار جان فدائے دمے کہ من از شوق
بخاک وخون تپم و گوئی از برائے منست

اور خاک وخون میں تڑپنے کا وقت آ ہی گیا، جن تلواروں کی پیاس پورے خاندان رسالت کا خون چاٹ کر نہ بجھی تھی وہ اپنے آخری گھونٹ کے لیے اور بے قرار ہو گئیں اور جب آپ کی طرف کوئی ایسا بھی نہ رہ گیا کہ آپ کی طرف سے ایک پتھر بھی پھینک سکے تو بے قرار تلواریں مضطرب، نیزے سنسناتے تیر ہر طرف سے آپ ہی پر ٹوٹ پڑے آہ! کتنا دلدوز نظارہ تھا، آپ درمیان میں کھڑے تھے اور بدبختوں نے ہر طرف سے آپ کو نشانہ بنالیا تھا، اسی حال میں ایک تیر آپ کی پیشانی انور پر لگا، سارا جسم پہلے ہی لہو میں تربتر تھا آپ نے تیر پیشانی سے کھینچا تو خون کا فوارہ چھوٹ پڑا، اس عالم میں آپ کامل استقلال کے ساتھ چہرۂ انور پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور فرماتے: آج اسی سرخروئی کے ساتھ بارگاہ احدیت اور دربار رسالت میں حاضر ہوں گا اور اپنا حال دکھاؤں گا گویا۔

بجرم عشق تو ام می کشید غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

اس ساری روداد الم میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ امام مظلوم کی اسلام کے ساتھ کامل وفاداری اور ہر حال میں حق کی حمایت ہے، ساتھ ساتھ مصائب کی محیر العقول برداشت، ہر درد والم کا استقبال کرنا جیسے ان کو سب کچھ پہلے ہی سے معلوم تھا اور وہ اسی قربانی کے لیے تیار ہو کر ہی آئے تھے۔ اور اپنے مضمون میں ہم بھی واضح کرنا چاہتے تھے کہ اسلام تقدیر کے

نوشتوں کے بدلنے کا دعویدار نہیں، مصائب کے طوفان کا دھارا موڑ دینے کا مدعی کرنے کا ڈھنگ البتہ بتا دیتا ہے، اور آلام کے مقابلے کے لیے ایک عجیب نکتہ نگاہ ایک عجیب انداز مشرب ضرور عطا کرتا ہے۔

امام حسین کربلا میں

اس وحشت آباد ہستی میں، نور و ظلمت، حق و باطل، ظلم و مظلومیت، کا معرکہ بارہا بپا ہوا ہوگا، تلواریں میان سے نکلی ہوں گی، سرتن سے جدا ہوئے ہوں گے، اور بے گناہوں کے خون سے صفحہ ہستی لالہ زار بنا ہوگا۔ دنیا کی نگاہوں کے سامنے بے شمار مرتبہ صبر و رضا، تسلیم وجاں سپاری، ایثار و قربانی کے مناظر آئے ہوں گے، کسی بھائی نے اپنی بہن کے لیے جان دی ہوگی، کسی دوست نے اپنے دوست کے لیے خون بہایا ہوگا، کوئی بیوی اپنے شوہر کی چتا میں زندہ جل گئی ہوگی۔ یوں ہی لاکھوں دفعہ لوگ اونچے آدرش، بلند تعلیم اور سچے اصولوں کے لیے لڑے ہوں گے، مصیبتیں جھیلی ہوں گی، تکلیفیں اٹھائی ہوں گی، اور دکھ برداشت کیا ہوگا۔

لیکن دس محرم ۶۱ ھ کی صبح اپنی جلو میں جو قیامت صغریٰ لیے آئی ہے وہ قیامت تک یاد رہیں گے، اس دن کے آفتاب نے حق و باطل کا جو معرکہ دیکھا اپنی مثال آپ ہے، اور ظلم واستبداد کا جو ڈرامہ اس روز کھیلا گیا ہے وہ کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ صبر و رضا، تسلیم وجانسپاری کا جو وقیع مرقع اس وقت ظہور پذیر ہوا اس کی شہادت ذرہائے دشت اور شفق شام ہمیشہ دیتی رہے گی۔

چشم فلک کے لیے وہ نظارہ کتنا دل دوز ہوگا جب اس نے دیکھا ہوگا کہ آل عبا کا چمن دلنواز اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ ایک بے برگ و گیاہ میدان میں کھلا رہا ہے (جس کا ذرہ ذرہ کوہ آتش فشاں اور ٹکڑا ٹکڑا جہنم بداماں ہے) مختار دو عالم ﷺ کی عزت پاک سے بغاوت کی جرأت، قطرۂ آب، ذرہ دشت کرے، صحن عالم اور شامیانہ فلک کرے۔

ع انقلابات ہیں زمانے کے

دنیا نے کیسے دیکھا ہوگا یہ المناک نظارہ کہ ایک طرف کل بہتر نفوس جن میں غنچۂ نوشگفتہ بھی ہے اور لالہ نو بہار بھی ہے، پیر مضمحل بھی ہے اور مریض ناتواں بھی، ناموسہائے اسلام بھی ہیں اور باندی و غلام بھی۔

برخلاف اس کے دوسری طرف علی اختلاف الروایات ۴۰ ہزار یا ۲۰ ہزار کا جرار لشکر جس کی تلواریں بے نیام، ترکش تیر سے بھرے ہوئے اور جسم غرق آہن۔ ایک طرف خشک مشکیزے دوسری طرف ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ایک سمت ہونٹوں پر پپڑیاں اور زبانوں پر کانٹے دوسری طرف شراب ناب سے آسودہ کام ودہن۔ ایک طرف ننھے ننھے بچے بھوک سے بلکتے ہوئے، دوسری طرف جانور تلک آسودہ۔ ایک طرف امت کا مہربان رہنما، دوسری طرف نافرمان امت جو اس اہتمام سے صرف اسی لیے جمع ہوئی تھی کہ اپنے پیاسے رہنما کے حلق کو خود اسی کے خون سے سیراب کرے۔ نہتے مظلوموں کو شہادت کا جام دے اور بے کسوں کو اپنی بہیمیت کا مزہ چکھائے۔ اف دنیا نے کیسے دیکھا ہوگا یہ المناک نظارہ!

اس گھنگور گھٹا میں، ایسی پر شور آندھی میں، اور اس ظلم کے طوفان بلا میں، عترت نبوی نے جو شمع حیات روشن کی، جو مینارہ نور بلند کیا، اور حق کی جو تعلیم دی لوگ اسے بھولیں تو بھولیں لیکن محرم کا چاندیوں ہی یاد دلاتا رہے گا، کربلا کی مٹی ایسے ہی پکارتی رہے گی، اور خوں نابۂ فلک اسی طرح اعلان کرتا رہے گا۔

اظہار حق

تاج علی کے گوہر غلطاں، اور ریاض فاطمہ کے اس گل سر سبد نے اس حادثۂ الیمہ میں یوں تو ہر ہر قدم پر حق کی داد دی، لیکن اس کا اہم مظاہرہ اس وقت ہوا جب کہ یزید کا قاصد حاکم مدینہ کے پاس آیا، آپ کو اور دیگر اصحاب کو یزید پلید کی مکروہ بیعت کی طرف دعوت دی، آپ نے بنو امیہ کے لیے نیام تلواروں اور ان کے سورماؤں کے مضبوط بازوؤں سے بے نیاز ہو کر فرمایا:

اسپ تازی شدہ مجروح بزیر پالاں

طوق زریں ہمہ در گردن خری بینم

آج اس باندی زادہ کو اس کی جرأت ہوگئی ہے کہ عزت پاک مصطفےٰ ﷺ سے بیعت لے، میں اس کی بدکاریوں اور بداعمالیوں پر مطلع ہونے کے بعد بھی اس کی امامت تسلیم کرکے اپنے سر مواخذۂ آخرت نہیں لے سکتا۔

اور یاد کرو دوسری بار اس وقت جب میدان کربلا میں شیفتگان جور کی تلواریں بے نیام ہو چکی تھیں، بھالے آمازئے جارہے تھے اور تیر ترکش سے نکال لیے گئے تھے، انسانوں کا شیطانی لشکر حرکت میں آگیا تھا۔ اور ہر دو طرف سے صفیں آمنے سامنے آگئی تھیں، آپ نے شامیوں کے سامنے ایک خطبہ ارشاد فرمایا:

لوگو! تم میں فلاں فلاں صحابی موجود ہیں، تم ان سے پوچھ لو وہ اس امر کی شہادت دیں گے کہ میری ماں عالم کی عورتوں میں بلند، میرا باپ مردوں کے گروہ میں ممتاز، اور میرے نانا ساری کائنات کے سردار تھے، اور میں خود نہ صرف یزید بلکہ اور بہت سے مسلمانوں سے افضل اور سب سے زیادہ امامت کا حق دار اس کے باوجود تم مجھ سے یزید کی بیعت لینے پر تلے ہوئے ہو، میں تمہارے محشر کی بے کسی کے تصور سے المناک ہوں، میرا خون ناحق اپنی گردن پر نہ لو، یادرکھو حسین کا سر یزید کے ہاتھ پر رکھ سکتے ہو اس کا ہاتھ نہیں۔

سر داد نہ داد دست در دست یزید ☆ حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

معراج صبر

جو سمندر ایک مرتبہ حضرت نوح علیہ السلام کے لیے امڈا۔ جن سنگریزوں نے اصحاب فیل کو دھن کر بھس بنادیا، جس بادصرصر نے قوم صالح علیہ السلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور دست قدرت کی جن مخفی قوتوں نے بار بار انسانوں کی قسمتیں بدل دیں وہ بوسہ گاہ رسول کے لیے پھر ایک مرتبہ حرکت میں آسکتی تھیں امام عالی مقام کو زبان ہلانے کی دیر تھی، تاریخ شاہد ہے کہ جنوں کے گروہ نے آپ کے ساتھ مخالفین سے جنگ کی خواہش ظاہر کی، لیکن آپ نے یہی کہہ کر

روک دیا۔ ''ہم دشمنوں کو زیر کرنے نہیں آئے ہیں'' نگاہ کے سامنے چھوٹے چھوٹے بچے بھوک پیاس سے بلکتے تھے، جوان بھائی کا بازو کٹا، تیر سے جسم چھلنی کیا گیا، اور آپ کے سامنے ہی ان کو شہید بھی کیا گیا اور وہ یا اخا ادرکنی بھائی جان خبر لو کہہ کر ہمیشہ کے لیے خاموش بھی ہو گئے، سرو جوئبار سا جوان رعنا قاسم بڑے بھائی کی نشانی سامنے ہی ٹکڑے ٹکڑے اڑایا گیا اور گھوڑوں سے پامال کیا گیا، پیری کا سہارا جوان جہان بیٹا علی اکبر چاند سے سینے پر برچھی کھا کر ابا جان خبر لو! کہہ کر پکارتا ہے۔ جاتے ہیں اور اٹھا کر خیمے میں لاتے ہیں، ایک قیامت سر پر گزر جاتی ہے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، لیکن صبر و استقامت کا پہاڑ اپنی جگہ ہے کیا مجال کہ تارخ انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا دوسرا کلمہ بے صبری یا جزع فزع کا سن لے۔

حد ہو گئی چھ مہینے کی ننھی جان شدت تشنگی سے زبان باہر نکالے ہے، ماں مامتا کی ماری ماں کہتی ہے: صاحب عالم اگر ان شامیوں کے مجرم ہیں، تو ہم ہیں، اس ننھے نے تو ان کا کوئی قصور نہیں کیا ہے، چند قطرہ پانی کے لیے اس کی جان جا رہی ہے، اسے لے جا کر انہیں دکھائیے شاید ترس کھا کر کوئی پانی دے دے۔ میدان میں لے جا کر دشمنوں کو بچے کا حال دکھاتے ہیں اور پانی مانگتے ہیں، اتنے میں کسی شقی نے نشانہ لگا کر تیر چلایا جو بچے کے گلے میں ترازو ہو کر امام کے بازو میں پیوست ہو گیا، ننھا پرند گود ہی میں پھڑ پھڑا کر ٹھنڈا ہو گیا، ظالموں کی شقاوت نے یہ کیا، دیکھو امام حسین کا صبر کیا کرتا ہے، نعش ماں کی گود میں رکھ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں: ''بانو'' خدا نے یہ ہماری چھوٹی قربانی بھی قبول کر لی، کتنا شاندار مظاہرہ ہے یہ صبر۔

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست سر نہادم بدانچہ خاطر اوست

تسلیم ورضا

تسلیم و رضا کا اہم منظر وہ ہے جب امام مظلوم نے خود بنفس نفیس تلوار سنبھالی ہے اور حیدری دست و بازو کا ایک ذرا جلوہ دکھایا ہے، تھوڑی ہی دیر میں شامیوں میں الاماں کا شور بلند ہونے لگا، لیکن شمر ذی الجوشن نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ سنبھالنے کے انتہائی کمینہ پن سے کچھ

نوجیوں کو لے کر خیمۂ اقدس اور مستورات پاک کا قصد کیا، آپ نے فرمایا: ادھر آؤ تمہیں میرے سر کی ضرورت ہے، یہ کاٹ لو مستورات سے تعرض نہ کرو، تم میرے خون کے پیاسے ہو اور مجھے شوق شہادت ہی یہاں لایا ہے۔

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خوں خوار می رقصم

اور جب امام عالی مقام بے شمار زخموں سے چور ہو گئے اور چلنے کی سکت نہ رہ گئی تو آپ ایک جگہ کھڑے ہو گئے اور سیہ بختوں نے آپ پر ہر چہار طرف سے چاند ماری شروع کر دی، اسی عالم میں ایک تیر آپ کی اس متبرک پیشانی میں لگا جو مدتوں رسول عربی ﷺ کی بوسہ گاہ رہ چکی تھی، آپ نے تیر کھینچ لیا تو خون کا فوارہ چھوٹ نکلا، آپ خون سر اور داڑھی پر ملتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے میں آج اس شان سے خدا اور رسول کی بارگاہ میں جاؤں گا اور اپنا یہ زخمی بدن خون آلودہ کپڑا اور حلقوم بریدہ دکھلاؤں گا گویا۔

بجزم عشق توام می کشند وغوغائیست ☆ تو نیز بر سر بام آں کہ خوش تماشائیست

''دیں پناہی''

خدا کو ماننے کا مطلب اسلام کے نزدیک اس کی حکومت اور فرمانروائی تسلیم کرنا ہے، ساتھ ہی ساتھ خدا کی نیابت میں اس کے احکام اور فرامین کا نفاذ بھی اہل اسلام کی ایک اہم ذمہ داری ہے اور اسلام اگر تخت حکومت پر جلوہ گر ہوتا ہے تو اسی خیال کے تحت، اس لیے اگر کوئی ایسی حکومت مسلمانوں کا مطمح نظر ہو جائے جو الٰہی قانون اور پیمبری فرامین کے علی الرغم کام کرے تو گویا مسلمانوں نے لاالٰہ الا اللہ کی روح کو کچل کر رکھ دیا اور مسلمان ہو کر بھی اسلام کی پشت میں چھرا گھونپ دیا۔

یزید پلید کی حکومت ایک ایسی حکومت تھی جو سراسر روح اسلام کے منافی تھی اور جس نے اسلامی حکومت کے ادعا کے باوجود اسلام کو ذبح کرنے کی ٹھان لی تھی، مشاہدین کا بیان ہے

کہ ہمیں یزید کے دور استبداد میں یہ خطرہ ہو گیا تھا کہ ہمیں آسمانی پتھروں سے سنگسار نہ کیا جائے، لوگ اعلانیہ محرمات سے شادی کرتے تھے اور شراب پیتے، روزہ نماز چھوڑتے۔

پس امام حسین جن کے گھر سے اس پاک ندی (اسلام) کے چشمے پھوٹے اس نور مبین کی شعاعیں بلند ہوئیں، اگر اس وقت کی روش کے موافق یزید پلید کی بیعت کر لیتے اور اس کی غیر شرعی حکومت سے رضامندی ظاہر کر دیتے تو یہ اسلام کی مجروح نعش کو اسی گھر میں دفن کر دینے کی مرادف ہوتا، جہاں سے وہ عروج پزیر ہوا۔ اور دین کی قسمت پر بربادی کی آخری مہر ہو جاتی۔ اس لیے رسول اللہ کے جانشین نے پوری قوت سے وقت کی طاغوتی طاقت کا مقابلہ کیا اور اپنے اہل وعیال کے خون سے اس خزاں دیدہ گلشن کی آبیاری کی، اس شمع حیات کی لو بڑھائی اور اس سوکھے چشمے کو اتھاہ ساگر بنا دیا۔

شاہ است حسین بادشاہ است حسین دین است حسین دیں پناہ است حسین

''ہم کو کیا ملا''

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ

روئیں وہ جو قائل ہیں ممات شہدا کے
ہم زندۂ جاوید کا ماتم نہیں کرتے

لیکن اس حادثہ سبق آموز سے ہم نے صرف رونا سیکھا ہے جب کہ رہتی دنیا تک کے لیے سبط رسول اللہ نے مسلمانوں کو یہ سبق دیا تھا۔ اور اس ابدی حقیقت کو روشن کر دیا تھا کہ اسلام کبھی بھی قلت کی پرواہ نہیں کرتا اور کثرت اور حکومت اسے ذرہ بھر بھی ہراساں نہیں کر سکتیں۔

جوش ادنی غلامان علی مرتضیٰ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ

نیز کربلا کی زمین پر امام عالی مقام نے اپنے خون سے یہ کتبہ لکھ دیا، اسلام قربانی چاہتا ہے، مذہب کو جاں سپاری کی ضرورت ہوتی ہے، اصول کا قیام ایثار کی بنیاد پر ہوتا ہے، اور

جس طرح کنارۂ فلک خون آلود ہولیتا ہے تو آفتاب طلوع کرتا ہے خزاں باغ وراغ کو اچھی طرح لوٹ لیتی ہے، تو دایۂ بہارنئی حیات کا مژدہ لے کر آتی ہے، اسی طرح جب ایک ابراہیم آگ میں ڈالا جاتا ہے تو نمرود کے قصر الوہیت میں آگ لگتی ہے، ایک اسمٰعیل کے گردن پر چھری چلتی ہے تو کعبہ کی تعمیر ہوتی ہے، کسی دشت نینوا میں کوئی حسین مظلومیت کے ساتھ شہید ہوتا ہے تو اسلام کے جسم میں تازہ خون اور نئی زندگی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، یہاں ہر قربانی کے پیچھے، حیات، ہر ایثار کی اوٹ میں زندگی، ہر فنا مژدہ گوئے بقا، اور تخریب کی تہہ سے تعمیری نقوش ابھرتے ہیں۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے　　اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اسی طرح امام مظلوم نے اپنے عمل سے باطل کے خلاف جنگ، حمایت حق صبر ورضا، توصیہ صبر، حمایت اسلام کی ایک اعلیٰ مثال قائم کردی کہ حق کی حمایت عواقب وانجام سے بے پرواہ ہوکر کی جاتی ہے اور یہی ایک واضح فرق ہے، دین ودنیا سیاست ومذہب، عقل وعشق ۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق　　عقل تھی محو تماشائے لب بام ابھی

''سلام''

پس اے امام مظلوم کی روح خرسند تجھ پر ہزاروں سلام اللہ کا، اللہ کے رسول کا، اسلام کا، پوری ملت اسلامیہ کا، اور بے کسان ہند کا، خصوصاً تیرے بندۂ در عبدالمنان کا، کہ تیرے خون آلود فرق مبارک پر اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا تاج رہا۔

اے قوم مسلم کے شہید مظلوم، خدا کی کروڑوں رحمتیں نازل ہوں تیری پاک تربت پر کہ فتح اسلام کا سہرا تیرے ہی گلوئے بریدہ میں زیب دیتا ہے۔

اے سبط رسول کے جسد صد چاک　　بے شمار درود ہوں
کہ عبائے عظمت وامامت　　تیرے نانا پر اور تجھ پر

تقدس وبزرگی تیرے پارہ پارہ ہونے والے جسم کے لائق تھی۔

بے شمار سلام بے حد درود اور لاتعداد رحمتیں

انوکھی لڑائی

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم

اما بعد

ماکان الله لیذر المومنین علی ماانتم علیه حتی یمیز الخبیث من الطیب

حضرات! دنیا میں بے شمار لڑائیاں اور خوں ریزیاں ہوئیں، دینی بھی اور دنیاوی بھی، مذہبی بھی اور سیاسی بھی، معاشرتی بھی اور معاشی بھی، قوموں کا مقابلہ دوسری اقوام سے ہوا، ایک طبقہ دوسرے سے ٹکرایا تہذیبیں باہم دست وگریباں ہوئیں۔

لیکن آج سے تقریباً چودہ سال قبل ریگزار نینوا میں حق وباطل کا جو عظیم ہنگامہ رستا خیز اور معرکہ نور وظلمت بپا ہوا، دنیا کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کی واحد جنگ ہے جو اپنے کردار، موضوع، اور مقصد کے لحاظ سے بالکل منفرد اور یگانہ ہے۔ اور جس کا بجا طور پر دنیا کی، انوکھی لڑائی، کہا جاسکتا ہے، لڑائی اس لیے کہ جس طرح دنیا کی تمام جنگوں میں فوجیں صف آرا ہوتی ہیں، نقشۂ جنگ ترتیب دیا جاتا ہے، میمنہ، میسرہ، صاعقہ اور قلب ہوتے ہیں، خون کی ندیاں بہتی ہیں۔ جاں بازیوں کے جوہر دکھائے جاتے ہیں، فتح وکامرانی کے شادیانے بجتے ہیں، شکست وریخت، تباہی وبربادی کے المناک مناظر پیش نظر ہوتے ہیں، اسی طرح یہ جنگ بھی اپنے تمام ہول ناک نتائج اپنے دامن میں لیے ہوئے نمودار ہوئی۔

یہ اور بات ہے کہ اس جنگ میں فریقین میں سے ایک طرف بہتر (۷۲) نفوس کا بھوکا، پیاسا اور غریب الوطن گروہ تھا، تو دوسری طرف کم سے کم تعداد والی روایت چار ہزار آدمیوں کا آراستہ وپیراستہ لشکر تھا، ایک طرف ماتھوں پر سجدوں کا نور اور تجلی تھی، تو دوسری طرف کبر ونخوت کی شراب سے اکڑی ہوئی گردنیں اور تنی ہوئی بھوئیں تھی، یہ ساری تفاصیل تاریخ اسلام کے اوراق نے اپنے سینوں میں محفوظ کررکھی ہیں۔

امام طبری فرماتے ہیں:

وعباء الحسين اصحابه وصلى بهم صلاة الغداة وكان معه اثنان وثلثون فارساً واربعون راجلا فجعل ظهير بن قين في ميمنة اصحابه وحبيب بن مظاهر في ميسرة اصحابه واعطى رايته العباس بن علي اخاه وجعلوا البيوت في ظهورهم. [طبری۲۲۶/۶دار الفکر]

امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے اصحاب کے ساتھ صبح کی عبادت کی تیاری کی اوران کے ساتھ نماز ادا کی، آپ کی ہمراہی میں ۳۲ سوار اور ۴۰ پیدل کل ۷۲ نفر تھے، آپ نے اپنی جماعت کے میمنہ پر ظہیر ابن قین کو اور میسرہ پر حبیب بن مظاہر کو مقرر فرمادیا، جھنڈا اپنے بھائی عباس کو دیا اور خیمہ کی طرف لشکر کی پشت کی۔

چند سطر بعد لکھتے ہیں:

وجعل عمر على ميمنته عمرو بن الحجاج الزبيدى وعلى ميسرته زمر بن ذي الجوشن وعلى الخيل عزرة بن قيس الاحمسى وعلى الرجال شبث بن ربيع واعطىٰ الراية ذويداً مولاه. [طبری۲۲۶/۶]

اور عمر و بن سعد نے بھی اپنے میمنہ پر عمر بن حجاج زبیدی کو اور اپنے میسرہ پر شمر بن ذی الجوشن کو، سواروں پر عزرہ ابن قیس احمسی کو اور پیدل فوج پر شیث ابن ربیع کو امیر بنایا، جھنڈا اپنے غلام ذوالید کو دیا۔

ہم نے نقشہ جنگ کی یہ ساری تفصیل اس لیے پیش کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ، اس باقاعدہ جنگ کو (جس کی یک طرفہ تیاری مہینوں قبل ہوئی، اور فریقین میں معاملات طے کرنے کے لیے مذاکرات بھی جاری رہے، ۱۲ رگھنٹہ کے لیے ایک فریق نے مہلت لے کر اس جنگ کو ٹالا بھی) بعض حضرات تھوڑی دیر کا ایک معمولی حادثہ، اور دو گروہوں کی ایک ناگہانی جھڑپ قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں، ایک ایسا حادثہ جس میں یہ بھی پتہ چلنا مشکل ہو کہ کس نے کس کو قتل کیا، بالکل اچانک ایک انہونی کی طرح ہوگیا، اور یہ ساری جدوجہد صرف اس لیے ہے کہ امام

حسین کے مظلوم خون کا داغ قاتلان حسین کے دامن سے دھودیا جائے، اور تیرہ سو سال کی طویل اسلامی تاریخ میں امت مسلمہ نے جن خون آشام سفاکوں، اور ناپاک مجرموں کو چوراہے پر لا کھڑا کیا ہے ان کے جرم پر پردہ ڈالا جائے، چناں چہ ایک صاحب کی طویل تحریر کا خلاصہ یہ ہے کہ۔

مکہ سے کوفہ تک کل ۳۰ ر منزلیں ہیں، ایک منزل ایک یوم میں طے کی جاتی ہے، اس طرح مکہ سے کربلا پہونچنے کے لیے ایک مہینہ کی مدت درکار ہوگی، اگر امام حسین رضی اللہ تعالیٰ تعالیٰ عنہ کی کربلا میں آمد دوسری یا تیسری محرم کو تسلیم کرلی جائے، جیسا کہ تمام تاریخ نویسوں کا بیان ہے، تو یہ لازم ہوگا کہ مکہ سے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی ۲ ذی الحجہ کو ہوئی ہو۔

اور اس صورت میں امام حسین جیسے عابد وزاہد، مشتاق حج وزیارت صحابی پر یہ بہت بڑا الزام عائد ہوگا کہ جس وقت ساری دنیا کے مسلمان سمٹ کر مکہ میں جمع ہورہے تھے، امام حسین نے حج کرنے کا انتظار بھی نہیں کیا، اور کوفہ کی طرف کوچ کر گئے اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ ضرور ضرور ۹ ر ذی الحجہ کو حج کر کے ہی روانہ ہوئے ہوں، اس حساب سے ۱۰ ر ذی الحجہ کو مکہ سے آپ روانہ ہوئے اور ۱۰ ر محرم کو کربلا میں پہونچے اور دیکھتے ہی دیکھتے بالکل بے خیالی میں یہ حادثہ ہوگیا جس کی ذمہ داری کسی پر نہیں ڈالی جاسکتی۔

حضرات ! اگر کسی حقیقت نفس الامری کے انکار کے لیے صرف قیاس و اندازہ، ظن وتخمین ہی کافی ہو تو ہمارے خیال میں مذکورہ بالا تحریر میں ابھی بڑی گنجائش تھی، معلوم نہیں اتنے پر ہی کیوں اکتفا کی گئی، یہ کہنا چاہئے تھا کہ امام حسین کم از کم ۱۲ ر ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہوئے، کیوں کہ حج میں صرف ۹ ر تاریخ کا قیام عرفات ہی ضروری نہیں، ۱۰ ر کو طواف زیارت بھی رکن ہے، رمی جمار بھی واجب ہے، اس لیے کہ یہ امر تو بالکل ناممکن ہے کہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج میں وقوف عرفہ تو کیا ہو اور طواف زیارت اور رمی جمرات سے کنارہ کشی کی ہو، پس لامحالہ مناسک حج کی ادائے گی کے لیے ۱۱ ر ذی الحجہ تک امام کا قیام ضروری تھا، پس حج ادا کر کے جانے والے مفروضے اور مکہ سے کربلا تک کی مسافت ۳۰ منزلوں تک ہونے والی

منطق کی رو سے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ۱۲ ار ذی الحجہ کو مکہ سے روانہ ہو کر ۱۲ ار محرم کو یعنی حادثہ کربلا کے گذر جانے کے دو روز بعد کربلا میں پہونچنا چاہئے۔ چلئے چھٹی ہوئی اس قیامت صغریٰ (حادثہ کربلا) کے درمیان سے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے رفقا کا وجود ہی غائب ہو گیا، پھر میدان کربلا میں شہادت کس کی ہوئی؟ کیا مصنفین اور مورخین نے جانبداری سے کام لے کر امام حسین کے نام کو شہرت دے دی؟ (معاذ اللہ)

بات اصل یہ ہے کہ ع

کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے

امام مظلوم کے خون کی لازوال سرخی اس قسم کی حرکتوں سے زائل نہیں ہوسکتی، نہ اس واقعہ کی شدت کو کم کرنے کی کوشش قاتلان حسین کے جرم کو ہلکا کر سکتی ہے، ایک معمولی غور وفکر سے یہ عقدہ حل ہو جاتا ہے کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایام حج سے چند یوم قبل کیوں مکہ سے کوچ فرمایا، طبری میں یہ سوال اور اس کا جواب دونوں مذکور ہیں:

قال هشام عن عوانة بن الحكم عن لبطة بن الفرزدق بن غالب عن ابيه قال حججت بامي فانا اسوق بعيرها حين دخلت الحرام في ايام الحج وذلك في سنة ستين، اذ لقيت الحسين بن علي خارجاً من مكة معه اسيافه وتراسه فقلت لمن هذا القطار؟ فقيل للحسين بن علي فاتيته فقلت له: بابي وامي يا ابن رسول الله! ما اعجلك عن الحج؟ فقال لو لم اعجل لاخذت.

[طبری ۲۰۴/۶]

ہشام نے عوانہ بن حکم سے بواسطہ لبط ابن الفرزدق خود فرزدق کا یہ واقعہ نقل کیا کہ میں ۶۰ھ میں اپنی والدہ کو لے کر حج کے لیے مکہ آیا، حج کا وقت قریب تھا، میں نے داخلی حرم کے وقت دیکھا کہ ایک قافلہ ہتھیاروں اور سواریوں کے ساتھ باہر جا رہا تھا، میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کس کا قافلہ ہے، مجھے بتایا گیا کہ حسین بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا، میں نے بڑھ کر ان سے ملاقات کی اور عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان، اے ابن رسول اللہ آپ نے اتنی جلدی

کیوں فرمائی کہ حج چھوڑ کر ہی جا رہے ہیں، آپ نے فرمایا: فرزدق! میں جلدی نہ کرتا تو پکڑ لیا جاتا۔

ایک دوسری روایت اس سے زیادہ واضح اور صاف ہے:

قال ابو مخنف عن ابی سعید عقیصی عن بعض اصحابه قال: سمعت الحسين بن علی وهو بمكة وهو واقف مع عبدالله بن الزبير فقال له ابن الزبير الی یاابن الفاطمه فاصغی اليه فساره قال: ثم التفت الينا الحسين فقال: اتدرون مايقول ابن الزبير؟ فقلنا لاندری جعلنا الله فداک قال اقم فی هذا المسجد اجمع لک الناس ثم قال الحسين: والله لان أقتل خارجامنها بشبر احب الی من ان اقتل داخلا منها بشبر، وايم الله لو كنت فی حجرها مة من هذه الهوام لاستخرجونی حتی يقضوا فی حاجتهم والله ليتعدن علی كما اعتدت اليهود فی السبت. [طبری ۲۰۳/۶، دار الفکر]

ابو مخنف نے ابو سعید عقیصی سے ان کے بعض دوستوں کے حوالہ سے روایت کی کہ میں نے امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مکہ میں امام عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ سرگوشی کرتے دیکھا، ان سے فارغ ہو کر حضرت امام ہماری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا: تمہیں پتہ ہے کہ ابن زبیر نے مجھ سے کیا کہا، ہم نے عرض کیا: ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہم تو نہیں جانتے، فرمایا: وہ کہہ رہے تھے، آپ یہیں حرم میں قیام فرمائیں، میں لوگوں کو آپ کی امامت اور سلطنت پر جمع کرتا ہوں، اس کے بعد آپ نے فرمایا: واللہ العظیم حرم میں قتل کئے جانے سے بہتر میرے نزدیک یہ امر ہے کہ میں حرم سے دور مارا جاؤں ایک بالشت دور سہی، اور خدا کی قسم اگر میں کسی کیڑے مکوڑے کے سوراخ میں بھی چھپ رہوں تو لوگ مجھے اس میں سے کھینچ کر باہر نکال لیں گے اور مجھ سے اپنی غرض پوری کریں گے، اور واللہ کہ وہ میرے معاملہ میں یونہی حدود اللہ کو پاش پاش کریں گے جیسے یہود نے محترم دن سنیچر کے معاملہ میں سرکشی کی۔

کیا یہ دونوں روایتیں چیخ چیخ کر یہ اعلان نہیں کر رہی ہیں کہ امام حسین کھلی آنکھوں سے

دیکھ رہے تھے کہ میرے خون کی پیاسی تلواریں میان میں تڑپ رہی ہیں، اور مجھے ہلاک کرنے والی طاقتیں پوری قوت سے میدان میں آرہی ہیں، میں کہیں بھی چھپ کر بیٹھوں دشمن میرا کام تمام کر کے ہی دم لیں گے، امام حسین کو خوف ہوا کہ اگر چند یوم اور بھی میں مکہ میں رک گیا تو بہت ممکن ہے کہ حج کی بھیڑ بھاڑ میں صحن حرم میں طواف کرتے ہوئے میدان عرفات میں مصروفیت دعا کے وقت یا منیٰ میں رمی جمار کے اژدھام میں، شب مزدلفہ کی گہری سیاہی میں، کسی بھی موقع پر ایک زہر آلود خنجر نہایت خموشی سے میرے پہلو میں پیوست کر دیا جائے، جس سے چپ چپاتے میرا کام تمام ہو جائے، وہ یہ دیکھ رہے تھے کہ اگر ایسا ہوگا تو میری قربانی کا مقصد فوت ہو جائے گا اور میری شہادت کی کوئی قیمت ہی وصول نہ ہو سکے گی، اور اہل بیت نبوت کا مقدس خون رائے گاں جائے گا۔

اور آج ہم اور آپ خود یہ سوچیں کہ اگر واقعہ حادثہ یونہی وقوع پذیر ہو گیا ہوتا، تو کیا شہادت امام حسین کی وہی افادیت ہوتی جو اس حادثہ کے وطن سے دور، بھوک اور پیاس کی شدت اور مجبوری و بے کسی کے عالم یں میدان کربلا میں رونما ہونے سے ہوئی، آج تو یہ کہنا بھی درست ہے کہ چودہ سو سال کی اس طویل مدت میں صرف اسی حادثہ کبریٰ نے ہی پوری امت مسلمہ کو حق وصداقت کی حمایت کے لیے سرگرم و پر جوش، زندہ اور آمادہ کر رکھا ہے، پس امام عالی مقام کی بصیرت صادقہ نے یہی فیصلہ کیا کہ جب میرے خون کو بہنا ہی ہے، تو ایسی جگہ بہے جہاں سے اس خون کی سرخی پورے عالم کے لیے حق وصداقت کا عنوان بنے اور آپ چاہیں تو اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بلاشبہ مکہ میں نفل کا حج چھوڑ دیا، کیوں کہ میدان کربلا میں ان کو ان کا فرض پکار رہا تھا، وہ اپنے کردار سے غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو جھنجھوڑنا چاہ رہے تھے، لوگو! اسلام پر وہ گھڑی آپڑی ہے، جس کو عرف فقہا میں نفیر عام کہا جائے، تو بے جانہ ہوگا، جب ہر متنفس پر چھوٹا ہو خواہ بڑا، بڈھا ہو خواہ جوان، عورت ہو یا مرد، دفاع فرض ہو جاتا ہے، وہ لوگوں کو دکھانا چاہتے تھے، اب وقت مکہ میں احرام باندھ کر منیٰ میں قربانی کے دنبہ ذبح کرنے کا نہیں ہے، سر سے کفن باندھ کر میدان شہادت میں خود اپنی ذات

کے قربان کرنے کا ہے، حجرہ عبادت میں گھس کر آہ سحر گاہی اور سجدہ شبانہ کا نہیں، تپتی ہوئی زمین اور جھلسے ہوئے میدان میں جان کی بازی لگا کر نعرۂ مجاہدانہ لگانے کا ہے، درس گاہوں کی مسند پر بیٹھ کر ہاتھوں میں عصا لے کر درس معرفت اور تذکار و نصیحت کا نہیں، ہاتھ میں تلوار تھام کر سرگرمی دغا اور شوق شہادت کا ہے گویا۔

دیکھ ساغر ہے یہ شمشیر ہے یہ جام ہے یہ
تو جو شمشیر اٹھائے تو بڑا کام ہے یہ

اور تاریخ بتاتی ہے کہ جن سعید روحوں نے امام حسین کا یہ آفاقی پیغام سنا اپنی حالت حیثیت و مقام نہیں دیکھا جو جہاں تھا وہیں سے چل پڑا۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

الغرض اس مفروضے میں کوئی دم نہیں ''حادثہ کربلا'' ایک ناگہانی واقعہ تھا اور کوئی باقاعدہ جنگ نہ تھی، بلاشبہ وہ ایک نہایت مہیب اور اسلام کی تاریخ میں فیصلہ کن مذہبی جنگ تھی۔

لیکن میں نے اس کو جنگ کے ساتھ عجیب وغریب اور انوکھی لڑائی اس لیے کہا کہ اس کا مقصد دنیا کی تمام لڑائیوں کے برخلاف نرالا اور عجیب وغریب ہے، دنیا کی تمام لڑائیوں میں یہی تو ہوتا ہے کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کو زک دینا تہس نہس کرنا اور تباہی و بربادی، شکست و ریخت کی آخری منزل تک پہونچانا چاہتا ہے، آپ دیکھتے نہیں ''رنگ'' میں دو مکہ باز اترتے ہیں جن میں سے ہر ایک کی خواہش اور انتہائی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اپنے مد مقابل کو مار مار کر اس درجہ بے سدھ کر دے کہ وہ زمین سے اٹھنے کی سکت بھی کھو دے، دو کشتی لڑنے والے اکھاڑے میں کودتے ہیں، لیکن ان میں کون چاہتا ہے کہ میں ٹپکا جاؤں، ہر ایک کی خواہش یہی ہوتی ہے کہ اپنے حریف کو چاروں شانے چت کر دے، دو مقدمے باز کورٹ میں جاتے ہیں، تو ہر ایک اسی کوشش میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح میں فریق مخالف کو قید و بند، فلاکت و مفلسی اور ذلت و رسوائی کی مصیبت میں گرفتار کر دوں۔

المختصر دنیا میں جہاں مقابلہ اور آویزش کا سوال درمیان میں آیا، فریقین کا مطمح نظر ایک دوسرے کو زک دینا، تباہ و برباد، اور نیست و نابود بنانا ہوتا ہے، لیکن ہنگامۂ کربلا میں لشکر یزید کا مقصد جو کچھ بھی رہا ہو، کم از کم عالی مقام کی فوج میں ادنیٰ سپاہی سے لے کر اعلیٰ درجے کے فوجی افسر تک کسی کا مقصد فریق مخالف کو شکست دینا، ان کو تباہ و برباد کرنا، ان کی جان لینا نہیں تھا، بلکہ راہ خدا میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا تھا، مقام تسلیم و رضا میں خود اپنی قربانی دینی تھی، مقتل میں خود اپنے ہی خون میں تڑپنا تھا، اور قربان گاہ حق و صداقت میں خود اپنے رقص بسمل کا تماشہ دیکھنا تھا۔

اللہ اللہ،

تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون من ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم

یا غالب کے الفاظ میں:

عشرت قتل گہ اہل تمنامت پوچھ
عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

اس امر کی وضاحت کے لیے آپ حسینی فوج، اس کے سپاہیوں کی حالت امام عالی مقام کی تدبیر جنگ، اور ان کی زبان مبارک سے متعدد مواقع پر نکلنے والے جملوں پر مبصرانہ نگاہ ڈالتے، ہر ہر چیز پکار اٹھے گی کہ یہ جان لینے والوں کی جماعت نہیں جان قربان کرنے والے سر فروشوں کا گروہ ہے۔

(۱) مثلاً دنیا کی تمام لڑائیوں کا دستور ہے کہ ہر فریق اپنے مد مقابل کی فوجی طاقت سامان جنگ اور تیاریوں کا اندازہ کر کے اسی حساب سے خود بھی تیاری کرتا ہے تاکہ کماحقہ مقابلہ ہو سکے، اور دشمن کو ہر مورچہ پر شکست دی جا سکے، اس کے برخلاف امام عالی مقام کو مخالف کی طاقتوں کا علم ہوتے ہوئے، اور حالات کے یکسر خلاف ہو جانے کے باوجود ایسی کوئی تیاری نہ کی بلکہ جو لوگ کسی دنیا طلبی کی غرض سے ساتھ ہو گئے تھے، انہیں حقیقت حال سے آگاہ کر کے

ساتھ سے علیحدہ کر دیا۔

چناں چہ امام طبری فرماتے ہیں:

فاتی ذلک الخبر حسینا وھو بالزبالة فاخرج للناس کتاباً فقرا علیهم بسم الله الرحمن الرحیم اما بعد: فانه قد اتانا خبر فظیع، قتل مسلم بن عقیل وھانی بن عروة وعبدالله بن بقطر وقد خذلتنا شیعتنا فمن احب منکم الانصراف فلینصرف لیس علیه منا ذمام، قال فتفرق الناس عنه تفرقا فاخذ وایمینا وشمالاً حتی بقی فی اصحابه الذین جاؤوا معه من المدینة وانما فعل ذلک لانه ظن انما اتبعه الاعراب لانهم ظنوا انه یاتی بلدًا قداستقامت له طاعة اهله فکره ان یسیروا معه الامن یرید مواساته والموت معه.

[طبری ۲۱۲/۶، دارالفکر]

قتل امام مسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خبر حضرت امام کو معلوم ہوئی تو آپ نے ایک تحریر کے ذریعہ لوگوں کو مطلع کیا، حمد وصلوۃ کے بعد ہمارے پاس حضرت مسلم بن عقیل، ہانی بن عروہ عبداللہ بن قطر وغیرہ کے قتل کی دہشت ناک خبر آئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ہمارے ماننے والوں نے بے وفائی کی ہے، تو آپ لوگوں میں سے جو صاحبان لوٹنا چاہیں واپس لوٹ جائیں، ہماری طرف سے ان پر کچھ بندش نہیں، یہ سن کر لوگ دائیں بائیں کھسکنے لگے اور وہی اشخاص باقی رہ گئے جو آپ کے ساتھ مدینہ سے آئے تھے، آپ نے لوگوں کو اذن عام اس لیے دے دیا کہ آپ سمجھ رہے تھے کہ کچھ دیہاتی لوگ یہ سمجھ کر ہمارے ساتھ ہو لیے ہیں کہ ہم ایسے ملک میں جا رہے ہیں جہاں کی حکومت ہمارے لیے مستقل ہو چکی ہے تو آپ نے یہ ناپسند کیا کہ لوگ لاعلمی میں رہیں، آپ اپنے ساتھ انہیں کو لے جانا چاہتے تھے جو آپ کے سچے غم خوار اور آپ کے ساتھ جان دینا چاہتے ہوں۔

کیا اس سے زیادہ بھی اس امر کا ثبوت درکار ہے کہ امام حسین جان بوجھ کر قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے، اور ایسے ہی لوگوں کو ساتھ رکھنا چاہتے تھے، جو ہنس ہنس کر عروس شہادت سے

ہم کنار ہو سکیں۔

پھر ایسا بھی نہیں کہ امام عالی مقام نے لشکر جمع کرنے کی کوشش کی ہو، اور اس میں کامیاب نہ ہوئے ہوں، تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ لوگوں نے حمایت کی پیش کش کی مگر آپ نے قبول نہ فرمایا، امام طبری لکھتے ہیں کہ،

طرماح ابن عدی نے امام عالی جناب کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی: حضور میں آپ کو اکیلا اور بے سہارا دیکھ رہا ہوں، حر کے جو ساتھی آپ کے ارد گرد پھیلے ہیں، اگر یہی آپ سے لڑنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو آپ کے لیے کافی ہوں گے، دراں حالے کہ میں آپ کے ساتھ ہونے کے لیے آرہا تھا، تو میں نے کوفہ کے آس پاس اتنے لوگوں کو دیکھا تھا کہ اتنے آدمی ایک ساتھ میری آنکھوں نے کبھی نہیں دیکھے، میں آپ کو خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ آپ ایک قدم بھی آگے نہ بڑھیے، اگر آپ اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں فیصلہ کرنے تک کسی محفوظ مقام تک چلنا چاہتے ہوں تو میں آپ کو اپنے علاقہ کے پہاڑی حصار میں لے چلنے کے لیے تیار ہوں، جس کو "اجا" کے نام سے پکارتے ہیں جہاں ہم نے ملوک غسان وحمیر، نعمان بن بشیر اور رومیوں اور حبشیوں سے کامیاب مدافعت کی ہے اور ہمیشہ کامیاب رہے تھے، میں آپ کو آبادی میں لے چلوں گا، اور قبیلہ طے کے افراد کو جو "اجاء" اور سلمیٰ کے پہاڑی سلسلہ میں آباد ہیں ان لوگوں تک پیغام بھیجوں گا، واللہ العظیم دس روز بھی گزرنے نہ پائیں گے کہ لوگ آپ کے گرد جمع ہو جائیں گے، پیدل بھی اور سوار بھی، آپ کا جب تک جی چاہے وہاں رہیں، اور اگر کوئی فتنہ آپ کے خلاف ہو تو میں قبیلہ طے کے ۹۰ ہزار طائی جوان مردوں کا ذمہ دار ہوں جو آپ کی خاطر جان کی بازی لگا دیں گے، آپ نے یہ سب سن کر فرمایا: اللہ تعالیٰ تم کو تمہاری قوم کو جزائے خیر دے، ہم نے حر اور اس کے ساتھیوں سے جو قول وقرار کر لیا ہے، اس کے ہوتے ہوئے ہم تمہاری بات پر عمل نہیں کر سکتے۔ [طبری ۲۱۶/۶]

ممکن ہے کوئی صاحب یہ سوچیں کہ یہ تو بعد کی باتیں ہیں، جب امام عالی مقام حر کی فوج میں گھر گئے تھے، لیکن میں کہتا ہوں کہ کیا جنگ جو قوم میں حالت جنگ میں حالات سے فائدہ

نہیں اٹھاتیں، اگر امام عالی مقام کا مقصد اہل کوفہ وشام کو شکست دینا ہی ہوتا تو انہیں طرماح ابن عدی کی بات قبول کرنے سے کون سی چیز مانع ہوتی، جب کہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ، الحرب خدعۃ، پھر ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ جذبہ ایثار وقربانی اور شوق شہادت وسرفروشی شروع ہی سے اسی عالم میں تھا، اس سے قبل ہم حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جواب میں امام کا قول نقل کر چکے ہیں کہ، **ایم الله لو کنت فی حجر هامة من هذه الهوام لاستخرجوني حتى يقضوا في حاجتهم،**

ایک دوسری روایت نودان بن عکرمہ کی ہے:

سأل الحسين عليه السلام احد عمومتي اين تريد فحدثه فقال له انشدک الله لما انصرف فوالله لما تقدم الا علی الاسنة و وحدالسيوف فان هٰؤلاء الذين بعثوا اليک لو كانوا كفوک مؤنة القتال ووطؤلک الاشياء فقدمت عليهم كان ذلک راياً فاما على هذه الحال التي تذكرها فانی لا يرىٰ ان تفعل فقال له ياعبدالله انه لايخفى على الرای امره ، ثم ارتحل.

[طبری ٦ ص ٢٩٦]

میرے چچاؤں میں سے کسی نے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں، آپ نے بتایا تو انہوں نے کہا کہ میں آپ کو خدا کی قسم دیتا ہوں آپ فوراً پلٹ جائیے، قسم خدا کی آپ کا جو قدم بڑھ رہا ہے تلواروں اور نیزوں کی طرف بڑھ رہا ہے، جن لوگوں نے آپ کو خط بھیج کر بلایا ہے انہوں نے آپ کی طرف سے جنگ کر کے اپنے حاکموں کو مار بھگایا ہوتا تو ایک بات بھی ہوتی، لیکن موجودہ صورت میں تو میں آپ کو جانے کی ہرگز رائے نہیں دے سکتا، آپ نے فرمایا اے عبداللہ، بات مجھ سے بھی چھپی ہوئی نہیں ہے، رائے وہی ہے جو تم نے کہا لیکن اللہ کے حکم پر کوئی غالب نہیں ہوسکتا یہ کہہ کر آپ روانہ ہو گئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ امام غفلت ولاعلمی میں یہ سمجھ کر کہ میری حکومت کا تخت تیار ہو چکا ہے چلے گئے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ نادان حسین ابن علی رضی اللہ تعالیٰ کو اپنے سے بھی زیادہ بے

وقوف سمجھتے ہیں، کہ ایک سلطنت سے ٹکر لینے کے لیے چلیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہ ہو، ساتھ میں لڑنے والے بھی نہ ہوں، نادانو! وہ خوب جانتے تھے کہ کیا ہونے والا ہے، اور اسی کے موافق آپ نے تیاری بھی کی، مظلومی اور بے کسی کی جنگ بے سروسامانی کے ہتھیاروں سے ہی لڑی جاتی ہے، اور جان دینے والوں کو ایک قتل گاہ سے زیادہ کیا چاہیے۔

(۲) دنیا کی تمام جنگوں میں پولیس کو بھرتی کرتے وقت ان کی عمر دیکھی جاتی ہے، سینہ ناپا جاتا ہے، قد کا اندازہ لگایا جاتا ہے، اور صحت جسمانی کا پیمانہ دیکھا جاتا ہے، اس لیے کہ ان سپاہیوں کا مقصد قتل وخوں ریزی، شکست وریخت، اور دشمن کو مقہور ومجبور کرنا ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ اور بہت سی اسلامی جنگیں جو مظلوموں کے دفاع اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ہوئیں، ان میں بھی چوں کہ ظلم کو مقہور کر کے حق کا پرچم بلند کرنا تھا، اس لیے حضور ﷺ نے بہ نفس نفیس سپاہیوں کی حالت کا اندازہ لگایا، اور فرمایا:

عن عبداللہ بن عمرو قال جاء رجل الیٰ رسول اللہ ﷺ فاستأذنه فی الجهاد فقال أحی والداک قال نعم قال ففیهما فجاهد.

[مشکوۃ شریف باب الجہاد ۳۳۱]

ایک صاحب حضور ﷺ سے جہاد کی اجازت لینے کے لیے حاضر ہوئے، آپ نے فرمایا: تیرے ماں باپ زندہ ہیں؟ عرض کی: ہاں! تو آپ نے فرمایا: تیرا جہاد انہیں کی خدمت ہے۔

اس حدیث شریف کا مقتضیٰ یہی ہوا کہ بڈھے جنگ سے مستثنیٰ کر دیے گئے ہیں کیوں کہ ان کے لیے عصاے پیری کا بوجھ کافی ہے، میدان جنگ میں شمشیر زنی ان کے لیے مشکل ہے، بلکہ ان بڈھوں کی خاطر وہ جوان بھی جنگ وجدل سے مستثنیٰ ہے جو ان کی خدمت میں مصروف ہو، اسی طرح حضور ﷺ نے جہاد میں شرکت کا ذوق ظاہر کرنے والی بیویوں سے فرمایا:

عن عائشة قال: استاذنت النبی ﷺ فی الجهاد فقال: جهاد کن الحج.

[مشکوۃ باب الحج ۲۲۱]

ام المؤمنین سیدتنا عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں: میں نے حضور جان نور ﷺ سے شرکت جہاد کی اجازت چاہی تو انہوں نے کہا کہ تمہارا جہاد حج ہے۔

اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ جو ہاتھ گھروں کے سنوارنے اور پیار کی لوری سے تھپک کر بچوں کو سلانے کے لیے بنائے گئے ہیں، ان کو تلوار چلانا اور قتل و غارت گری زیب نہیں دیتا۔

بچوں کو ہمیشہ حضور ﷺ نے جنگ کی شرکت سے منع فرمایا: اور اسی روک ٹوک اور ممانعت کی وجہ سے اسلامی تاریخ کا یہ دل گداز واقعہ ظہور میں آیا۔

جنگ احد میں جب مجاہدین صف آرا ہو کر حضور ﷺ کے ملاحظہ میں گزرے تو انہیں لڑنے والوں کی صف میں حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی جن کی عمر مشکل سے ۱۴، ۱۵، برس کی ہوگی، کھڑے ہوگئے، اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ یہ بھی جنگ جو نوجوان ہیں، اپنے موزے میں کپڑا ٹھونس لیا تھا کہ قد کچھ اونچا ہو جائے، اور سپاہیوں کے برابر نظر آئے حضور ﷺ ان کی اس چالاکی پر مسکرائے ہوں گے، لیکن آپ نے ان کی کم عمری کی وجہ سے ان کو علیحدہ ہونے کا حکم دیا، لوگوں نے سفارش کی یارسول اللہ ﷺ ان کو ضرور شریک کرلیا جائے، یہ نہایت عمدہ تیر باز ہیں، اور بہترین نشانہ لگاتے ہیں۔

حضرت سمرہ بن جندب کہتے ہیں: کہ میں بھی کمسنی کی وجہ سے چھانٹ دیا گیا تھا مجھے یہ دیکھ کر سخت بے قراری ہوئی کہ حضور ﷺ نے رافع کو اجازت دے دی، میں نے اپنے سوتیلے باپ سے جن کی صف میں میں تھا، کہا کہ رافع بن خدیج لے لیے گئے حالاں کہ میں کشتی میں ان کو پچھاڑ دیتا ہوں، پھر مجھے کیوں الگ کر دیا گیا، میرے والد نے حضور ﷺ سے عرض کیا: آپ نے فرمایا: کہ اگر ایسا ہے تو رافع اور سمرہ کی کشتی ہو جائے، چناں چہ جب سمرہ بن جندب رافع پر غالب آئے تو انہیں بھی آپ نے شرکت کی اجازت دی۔

[زرقانی علی المواہب ۲/۴۰۰، مرکز اہل سنت برکات رضا گجرات]

لوگ شاعری کرتے ہیں:

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف

بہ امید آں کہ روزے بہ شکار خواہی آمد

لیکن ہم نے تو نہ کہیں ایسے شکار دیکھے نہ شکاری، ہاں مدینہ کی گلیوں میں البتہ کمسن بچے بھی اپنا سر ہتھیلی پر رکھے حضور سید عالم کی نذر گزارنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

حضرات! ان متعدد شواہد کے بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ جو جنگیں جان لینے کی غرض سے ہوتی ہیں ان میں ہر طرح یہ بات ملحوظ ہوتی ہے کہ (کار رفتہ بوڑھے) کم عمر بچے اور عورتوں کو فوج سے دور رکھا جائے، اور لڑنے والوں کی نفری زیادہ سے زیادہ کی جائے، اس کے بر خلاف کربلا میں لڑنے والی حسینی فوج کا عالم ہی کچھ اور ہے ۷۰، ۷۲، آدمی کا ایک مختصر گروہ جن میں بریر ابن حفیر جیسا عمر رسیدہ بھی جو مسجد کی چٹائی اور مدرسہ کا بوریہ چھوڑ کر میدان جنگ میں چلا آیا ہے، کم عمر اور نوخیز بچے بھی جن میں ایک ننھا مجاہد تو صرف چھ مہینہ کا گہوارہ مادر چھوڑ کر قتل گاہ میں آیا ہے، اور کمزور اور ناتواں عورتیں بھی جو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے دعا کرتی ہوئی ماری گئیں۔

کیا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فوج کی یہ مختصر تعداد پکار پکار کر نہیں کہتی ہے کہ ہزار ہا ہزار شہسواروں کے مقابلہ میں یہ مختصر سی جماعت جان دینے کے لیے تیار کی گئی ہے، جان لینے کے لیے، سن رسیدہ بریر جن کے ہاتھ میں لوگ قرآن اور تسبیح دیکھنے کے عادی تھے کیا آج ان کے ہاتھ میں تلوار کسی کی جان لینے کے لیے آئی ہے؟ صاف صاف ظاہر ہے کہ یہ جان دینے کا بہانہ ہے، مقام غور ہے کہ چھ مہینہ کی ننھی جان تو کسی کو گالی بھی نہیں دے سکتی، گزند پہونچانا یا قتل کرنا تو دور کی بات ہے، ہاں جان دینا اس کے لیے اتنا آسان ہے کہ پیکان جاں گداز ہی کافی ہے، اسی لیے میں کہتا ہوں کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنی فوج میں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ایسے ہی مہرے رکھے جو اپنی حالت سے ہی جنگ کے مقصد اور لڑائی کی نوعیت کی طرف اشارہ کریں، کہ یہ سرفروشوں کی جماعت ہے، جنگ بازوں اور قاتلوں کی نہیں، اس لیے کہ اس جنگ کا مقصد ہی قلندرانہ ہے۔

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی

قلندر رما یہ ہستی لٹا کر رقص کرتا ہے

اسی طرح ہم نے معرکہ کربلا میں شریک ہونے والے فوجیوں کے حال پر غور کیا تو ہر ایک کی زبان حال ومقال سے یہی نعرۂ مستانہ سنائی دیا:

سر فروشی کی تمنا آج میرے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوے قاتل میں ہے

امام عالی مقام کی فوج کے ایک سپاہی زہیر بن قین بھی ہیں کہ کس طرح امام عالی مقام کے ہمراہ ہوئے طبری کا بیان ملاحظہ فرمایئے:

ہم لوگ زہیر بن قین بجلی کے ہمراہ مکہ سے واپس ہوئے، راستہ میں امام حسین کے قافلے کا ساتھ ہوگیا، تو امام کے ساتھ اترنا ہم کو سخت ناگوار تھا، اگر کسی منزل پر وہ قیام فرما ہوتے تو ہم آگے بڑھ جاتے اور وہ آگے بڑھنے والے ہوتے تو ہم پہلے ہی پڑاؤ کر دیتے، اتفاقاً ایک منزل ایسی آئی کہ ساتھ قیام کیے بغیر چارہ نہ تھا، چنانچہ وہ وادی کے ایک کنارے ٹھہرے اور ہم دوسرے کنارے۔

ابھی ہم صبح کو بیٹھ کر ناشتہ ہی کر رہے تھے کہ امام حسین کا فرستادہ ہمارے پاس آیا، کہ امام حسین بن علی نے زہیر بن قین کو بلایا ہے، یہ سن کر لقمہ ہمارے ہاتھوں سے گر گیا اور ہم پر سکتہ طاری ہوگیا۔

زہیر بن قین کی بیوی بولی: سبحان اللہ! رسول اللہ ﷺ کے نواسے بلا رہے ہیں، اور تم جانے میں آنا کانی کر رہے ہو، جا کر ان کی بات سن لیتے تو کیا ہوتا، یہ سن کر زہیر بن قین امام حسین کی ملاقات کے لیے گئے، واپس لوٹے تو کچھ عجیب عالم تھا، چہرہ نکھرا ہوا کیف وسرور کا عالم طاری تھا، آتے ہی حکم دیا کہ میرے سارے ساز وسامان کو حضرت امام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساز وسامان کے ساتھ ملا دیا جائے، اور عورت سے فرمایا میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں اور تو اپنے میکے چلی جا تا کہ میری طرف سے تجھے کوئی تکلیف نہ پہونچے، احباب اور ہم سفروں سے بولے! جو ہمارے ساتھ رہنا چاہے وہ رہے ورنہ ہماری آپ کی یہ آخری ملاقات ہے، میں تمہیں ایک بات

سناتا ہوں، ہم نے ایک دفعہ ایک غزوہ کے بعد کافی مال غنیمت حاصل کیا، جس سے ہم کو بے حد مسرت حاصل ہوئی، اس پر حضرت سلمان باہلی بولے آج تم اس مال غنیمت پر خوش ہو رہے ہو کل جب تم خاندان رسالت کے نوجوانوں کے ساتھ لڑو گے تو اس سے زیادہ مسرور ہو گے، پس میں تم کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں اور خود امام حسین کے ساتھ جا رہا ہوں، اس وقت سے شہید ہونے تک زہیر بن قین امام کے ساتھ ہر معاملہ میں پیش پیش رہے۔ [طبری ۲۱۰/۶]

یہ اول اول نفرت وکراہت کے ساتھ امام عالی مقام کے خدمت کی حاضری پھر چہرہ پر نگاہ پڑتے ہی انقلاب ہزار جان سے آمادۂ جہاد ہونا، عورت کو علیحدہ کرنا اور احباب کو آخری سلام کرنا، اور ایک پیش گوئی کی یاد، کون کہہ سکتا ہے کہ زہیر بن قین فتح وکامرانی کی لالچ میں امام عالی مقام کے ساتھ ہوئے تھے۔

ایک اور روایت خاص میدان کربلا، اور صفوں کے آمنے سامنے ہونے کے وقت کی ہے۔

فجعل بريريهازل عبدالرحمن فقال عبدالرحمن: دعنا فوالله ماهذه بساعة باطل، فقال له بريروالله قد علم قومي أني ماأحببت الباطل شاباً ولاكهلا ولكن والله انى لمستبشر بما نحن لا قون، والله ان بيننا وبين الحورالعين الا ان يميل هولاء علينا بأسيافهم ولوددت انهم قد مالوا علينا باسيافهم . [طبری ج۶/۲۲۷]

جب دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں صف آرا ہوئیں تو بریر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عبدالرحمٰن سے مذاق کرنے لگے، اس پر آپ نے بریر سے فرمایا: صاحب یہ روح فرساوقت مذاق کرنے کا تو نہیں ہے، اس پر بریر بولے میری قوم گواہ ہے کہ میں جوانی اور ادھیڑ پن کی عمر میں بھی کبھی مذاق کرنے والا نہ تھا، اب کیا ہوں گا، لیکن میں اپنے اس موقف سے بے حد مسرور ہوں، میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے اور حوروں کے درمیان اب اتنا ہی فاصلہ ہے کہ یہ شامی ہم پر حملہ آور ہوں اور دیکھو وہ حملہ آور ہو بھی چکے۔

اللہ اللہ۔ کس درجہ اطمینان وایقان ہے، اور کتنی مسرت وشادمانی ہے، گویا مقتل نہیں ہے عیدگاہ ہے، غالب نے سچ ہی کہا ہے۔

عشرت قتل گہ اہل تمنامت پوچھ

عید نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

الحتصر تفاصیل کے پیش کرنے سے ہماری غرض یہ تھی کہ یہ امر خوب واضح ہو جائے، کہ میدان کربلا میں جولڑائی لڑی گئی ہے، اپنے منشا اور مقصد کے لحاظ سے دنیا کی اور جنگوں سے ممتاز تھی، اس کے مجاہدوں کا مقصد ہی جاں سپاری اور سرفروشی تھا، قربانی وایثار تھا، سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے، اور جان دینے کے لیے ہی تیار ہو کر آئے تھے۔

یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ کچھ لوگ جان دینے کی آرزو میں جنگ میں شریک ہوں، میں کہتا ہوں دیگر قوموں کا حال مجھے معلوم نہیں، لیکن اسلامی فوج کے بہت سے سپاہی اسی آرزو میں دربدر کی خاک چھانتے اور سخت ترین معرکوں میں کود جاتے کہ شاید عروس شہادت سے ہم کنار ہو جاؤں اور جان کا نذرانہ قبول بارگاہ الہٰی ہو جائے۔

غزوہ بدر کی صبح ہونے والی تھی، اور شام ہی کو حضرت عبیداللہ بن جحش اور ایک دوسرے صحابی نے دعا مانگی، پہلے دوسرے صاحب نے دعا مانگی اور حضرت عبیداللہ آمین کہتے رہے، دوسرے صحابی کی دعا ایک عام قسم کی دعا تھی جو ہر سپاہی مانگا کرتا ہے۔ بارالہا! کل میرے مقابلہ میں ایک شہ زور آزمودہ کار جنگ جو اور بہادر پہلوان آئے میں اس پر وار کروں وہ مجھ پر تلوار چلائے، تلواریں اٹھیں نیزے جھکیں تیر سنسنائیں پھر اے میرے معبود میری خواہش یہ ہے کہ میں دشمن کے ٹکڑے اڑادوں، پہلے صاحب دعا کر چکے تو حضرت عبیداللہ کے لب وا ہوئے اور آپ کی زبان سے جو لاہوتی کلمات ادا ہوئے، اسلام کی تاریخ نے امانت بنا کر اپنے سینے میں محفوظ رکھے، آپ کے الفاظ یہ تھے۔

اللھم القنی غدًا رجلاً شدیداً باسہ وشدیدًا حردہ فیقاتلنی فیقتلنی فیجدع بانفی واذنی فاذا لقتیک تقول مافعل بانفک واذنک یاعبداللہ

فاقول فیک وفی رسولک.

اے اللہ کل میرے مقابلہ میں میرے بھائی کی طرح ایک جفاپیشہ اور سرکش جنگجو آئے، وہ مجھ پر وار کرے میں اس پر حملہ کروں، اور دنیا ایک سخت جنگ کا تماشہ دیکھے پھر میری آرزو میرے بھائی کی طرح نہیں ہے کہ میں دشمن کو پچھاڑ دوں بلکہ میری خواہش تو یہ ہے کہ وہ مجھے قتل کرے، پھر میری ناک کاٹ لے کان کاٹ ڈالے تاکہ کل میدان حشر میں جب میں اسی طرح ناک کان کٹا ہوا تیرے حضور میں حاضر ہوں تو تو پوچھے عبداللہ میں نے تو تجھے عمدہ ناک اچھے کان خوب صورت ہونٹ دیئے تھے، یہ ناک کان کہاں کٹوا آئے، تو میں عرض کروں: تیرے اور تیرے رسول کے لیے۔

اللہ اللہ!! ہر جفا ہر ستم گوارا ہے تو یہ کہہ دے کہ تو ہمارا ہے

صبح کو میدان بدر میں جب صفیں آراستہ ہوگئیں اور سورما باہم دست وگریباں ہوئے تو پہلے صاحب کے سامنے حسب آرزو ایک شہ زور مقابل آیا، آپ نے ایک سخت جنگ کے بعد اس کے ٹکڑے اڑا دیئے، دل میں خیال ہوا میں نے کل شام کو دعا مانگی آج صبح ہی قبول ہوگئی، حضرت عبیداللہ نے بھی میرے ساتھ ہی ایک عجیب وغریب دعا مانگی تھی، دیکھوان کا کیا حال ہے، ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دیکھا وہ بھی ایک سخت دشمن سے الجھے ہوئے ہیں اور پوری پامردی سے جہاد کر رہے ہیں، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے دشمن نے تلوار کا ایک بھرپور وار کیا جس سے حضرت عبیداللہ شہید ہو کر گرے، مگر اس وقت ان کی زبان پر ایک عجیب نعرۂ مستانہ تھا ''فزت برب الکعبہ'' کعبہ کے رب کی قسم میں تو کامیاب ہوگیا، یہ جملہ سن کر دشمن حیرت سے اپنی تلوار کی طرف دیکھتا ہے، پھر عبیداللہ کو تڑپتا ہوا دیکھتا ہے، سوچا ہوگا عبیداللہ کو قتل میں نے کیا، ان کا خون میری تلوار سے ٹپک رہا ہے، دنیا یہ کہہ رہی ہے کہ میں جیتا اور عبیداللہ ہارے، لیکن یہ عبیداللہ خود کیا کہہ رہے ہیں، کیا اسلام اپنے ماننے والوں میں ایسی اسپرٹ پیدا کر دیتا ہے کہ جان لینے ہی میں نہیں بلکہ جان دینے میں بھی مزہ آتا ہے، کسی کو برا بھلا کہہ کر نہیں بر اسن کر دعائیں دینے میں بھی لذت حاصل ہوتی ہے گویا۔

سکندر لوٹ کر بھی خوش نہیں دولت زمانے کی
قلندر مایۂ ہستی لٹا کر ناز کرتا ہے

اگر ایسا ہے تو میں بھی اسلام سے دور کیسے رہ سکتا ہوں، تلوار ڈال دی اور خود مسلمان ہو گئے۔

ایک دیہاتی صحابی اسلام لائے، حضور جان نور ﷺ کسی جنگ کی تیاری میں تھے، اور فوج کو ترتیب دے رہے تھے، انہوں نے بھی شرکت کی خواہش ظاہر کی، آپ نے شریک کر لیا، میدان جنگ میں دیگر آزمودہ کار سپاہیوں کو حضور ﷺ نے نبرد آزمائی کے لیے بھیجا، اور انہیں لشکر کے اونٹوں کی چرواہی کی ڈیوٹی عطا کی گئی، حسب الحکم یہ اونٹ چراتے رہے اور دیگر صحابہ لڑتے رہے، اللہ کے فضل سے جنگ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں ہوا اور سرکار دو عالم ﷺ نے مال غنیمت تقسیم کیا، تمام مجاہدوں کے ساتھ ان اعرابی کو بھی آپ نے حصہ دیا، وہ موجود نہ تھے اس لیے آپ نے ان کا حصہ ان کے کسی ہمراہی کو عطا فرمایا کہ فلاں کو دے دینا۔ جب وہ اونٹ لے کر واپس لوٹے تو ان کے ساتھی نے یہ کہہ کر ان کا حصہ دیا کہ حضور نے مال غنیمت سے تمہیں حصہ عطا فرمایا ہے، انہوں نے وہ سامان لے لیا، اسی طرح ہاتھوں میں تھامے ہوئے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی "یارسول الله مالھذا اتبعتک" سرکار میں نے اس مال دنیا کے لیے آپ کا ساتھ اختیار نہیں کیا تھا، اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگے میں نے تو اس لیے جہاد میں شرکت کی تھی کہ، کوئی سنسناتا ہوا تیر آئے اور میرے اِدھر سے اُدھر پار ہو جائے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی خارا شگاف تلوار برق بے اماں بن کر نکلتی اور دشمنوں کو خس و خاشاک کی طرح جلا ڈالتی، کیا ان کا منشا خونریزی اور قتل و نہب تھا۔ خود ان کی زبان سے سنیے کیا فرماتے ہیں:

شهدت مأته غزوة وزهاها، ومافي جسدي موضع شبر الاوفيه ضرب او طعنة اورمى وهاانا أموت كما يموت البعير فطوبىٰ للجبناء.

[ابوبکر صدیق ص۱۸۴]

میں نے لگ بھگ سولڑائیوں میں شرکت کی اور میرے جسم میں بالشت برابر جگہ بھی ایسی نہ ہوگی جس میں تلوار، نیزہ یا تیر کا زخم نہ ہو، لیکن اب بستر پر یوں مر رہا ہوں، جیسے عام جان دار مرتے ہیں اے بزدلو! تمہیں ہی مبارک ہو۔

اپنے عام طرح انتقال فرمانے کا افسوس اور شہادت نصیب نہ ہونے کی حسرت ایک ایک لفظ سے پھوٹ رہی ہے، کہ میں شہادت کے لیے سر ہتھیلی پر رکھے وادی وادی گھومتا رہا، پر وائے ناکامی کی موت شہادت کی مقدر نہ تھی بستر کی موت ملی، جسم کے ٹکڑے ٹکڑے اڑ گئے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ سرفروشی کی تمنا دل میں رہ گئی، اور قتل ہونے کا ارمان پورا نہ ہوسکا۔

پس ایسے لوگوں کے بارے میں کون کہے گا کہ ان کی شمشیر زنی قتل وغارت گری کے لیے تھی، یہ تو صاف صاف جان دینے والوں کا گروہ ہے، جن کی خواہش صرف یہ ہے کہ:

ہزار جان فدائے دے کہ من از شوق
بخاک وخون تپم گوئی از برائے من است

اور جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر آئے ہیں، کربلا والوں نے اپنی گفتار وکردار ہر چیز سے ثابت کردیا کہ بلاشبہ حق پرستوں کا یہ مٹھی بھر کا گروہ قربانی کرنے کے لیے ہی میدان کربلا میں حاضر ہوا تھا۔

اب وہ مقام آگیا ہے کہ ہم اس جاں بازانہ سرفروشی اور سرفروشانہ قربانی کے مقصد پر روشنی ڈالیں تاکہ معلوم ہو کہ آخر اس نذرانہ خون دل کا حاصل کیا تھا، اور امام عالی مقام اور ان کے رفقا ذوی الاحترام نے جان بوجھ کر اپنی جانوں کو حق وشہادت کی قربان گاہ پر کیوں بھینٹ چڑھا دیا۔

بات اصل یہ ہے کہ دنیا میں حق وباطل، نور وظلمت اور خیر وشر کی آویزش ہمیشہ رہی ہے۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز

چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب تک حق و باطل آمنے سامنے صف آرا رہتے ہیں، تو دیکھنے والوں کو امتیاز اور پہچان آسان ہوتی ہے، اس وقت تک حق و باطل کے درمیان خط امتیاز زبان وبیان کے ذریعہ بھی کھینچا جاسکتا ہے، قلم اور تحریر کے ذریعہ بھی اور ضرورت پڑے تو تلوار کی دھار کے ذریعہ بھی۔

لیکن جب ایسا ہوجائے کہ حق و باطل (جھوٹ وسچ) باہم خلط ملط ہوجائیں، یا جھوٹ سچ کا لباس پہن کر جلوہ نما ہو، اور امتیاز مشکل ہوجائے تو امتیاز رفتار وگفتار یا تلوار کی جھنکار سے نہیں حاصل ہوتا، بلکہ قربانی وایثار اور مظلوموں کے خون کی دھار سے خط امتیاز کھینچا جاتا ہے۔

مکہ کی گلیوں میں حق اور باطل الگ الگ کیمپ میں تھے، بدر وحنین، احد وخندق میں آمنے سامنے صف آرا تھے تو امتیاز کے لیے ایک آوازۂ حق بھی کافی تھا، اور مجاہدوں کی شمشیر بے نیام بھی، لیکن کربلا میں منظر کچھ اور ہی تھا، ادھر بھی کلمہ گو اور ادھر بھی کلمہ گو، ادھر بھی گلے میں قرآن مجید حمائل، ادھر بھی بغلوں میں قرآن دبائے ہوئے، اس طرف بھی تسبیح ومصلےٰ، ادھر بھی سجادہ وسبحہ، اس سمت بھی زبان پر نعرۂ تکبیر اور ہاتھ میں پرچم الا اللہ، ادھر بھی وہی ساز وسامان۔ پہچاننے والی نگاہوں کے لیے سخت امتحان تھا اور معرفت حاصل کرنے والوں کے لیے سخت اشتباہ کہ ان دونوں مسلمان گروہوں میں کس کی بات صحیح اور سچ ہے؟ اور کس کا دعوی غلط اور باطل۔

پس اس وقت خط امتیاز کے لیے قربانی کا خون درکار تھا، اور مظلومیت کی بے کسی، امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ آگے بڑھے اور آپ نے پورے خاندان کے مقدس اور بے گناہ خون کا ایک مضبوط حصار قائم کردیا، تا کہ قیامت تک سچائی پہچانی جاسکے اور جھوٹ کی ملمع کاریوں کا پردہ چاک ہوتا رہے، آپ نے کربلا کی تپتی ہوئی ریت پر اپنے خون سے ایک تحریر لکھ دی، جو رہتی دنیا تک حق کا عنوان اور سچائی کا طغرا بنی رہے گی، آپ نے اپنا دل جلا کر شمع حق روشن کی جو اخیر تک باطل کے طوفانوں میں جگمگاتی رہے گی، ہماری اس بات کی تائید اس روایت سے ہوتی ہے

جسے طبری نے خاص شب عاشورہ کے سلسلہ میں نقل کیا ہے:

فلما امسی الحسین واصحابه قاموا الليل كله يصلون ويستغفرون ويدعون ويتضرعون، قال: فمربنا خيلهم تحرسنا وان حسينا ليقرأ ﴿ولا يحسبن الذين كفروا انما نملي لهم ليزدادوا اثما ولهم عذاب مهين ما كان الله ليذر المومنين على ما انتم عليه حتى يميز الخبيث من الطيب﴾

[طبری۲۲۶/۶]

عاشورہ کی رات آئی تو امام حسین اور ان کے کل ساتھی رات بھر دعا میں مصروف رہے، نماز پڑھتے رہے، استغفار کرتے رہے، گریہ وزاری کرتے رہے کہ اسی اثنا میں کہ شامیوں کے سوار ہماری نگرانی کے لیے ہمارے پاس سے گزرے، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سنا گیا کہ قرآن عظیم کی یہ آیت تلاوت کررہے تھے کہ: کافر یہ نہ سمجھیں کہ ہم نے انہیں چھوٹ دے رکھی ہے یہ تو ڈھیل ہے کہ اور گناہ کریں انہیں تو دردناک عذاب ہوگا، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس حال پر نہیں چھوڑے گا کہ پاک اور ناپاک کا امتیاز نہ ہو یہ امتیاز تو ہوکر رہے گا۔

مذکورہ بالا آیت مبارکہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت نازل فرمائی جب کہ منافقین مدینہ حضور ﷺ کے اخبار بالغیب اور ڈھکی چھپی چیزوں کی خبر دینے پر اعتراض کرتے اور مذاق اڑاتے کہ یہ خوب رسول ہیں کہ دور دراز کی مخفی چیزوں کی تو انہیں اطلاع ہو جاتی ہے اور خاص ان کے گرد و پیش کیا ہورہا ہے، ان کے پہلو میں اور ان کے دائیں بائیں کون لوگ ہیں، دوست ہیں کہ دشمن ان کی خبر ہی نہیں، مطلب ان کا یہ تھا کہ ہم منافقین جو دل سے ان کے دشمن اور بدخواہ ہیں ان کے بارے میں اپنی سادگی سے خوش گمانی رکھتے ہیں، کچھ جانتے ہی نہیں، اور ادھر ادھر کی باتوں کو خوب بتاتے ہیں یہ کیسے ہوسکتا ہے؟۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تہدید فرمائی تم سمجھتے ہو کہ اسی طرح پاک اور ناپاک ملے جلے رہیں گے، اللہ جھوٹے اور سچے کو الگ الگ کرے گا، روایتوں میں ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آپ منبر پر تشریف فرما ہوئے، اور آپ نے ایک ایک منافق کا نام لے کر فرمایا:

اخرج یافلان فانک منافق اخرج یافلان فانک منافق.

اے فلاں تو مسجد سے نکل جا کہ تو منافق ہے۔ اور اے فلاں تو بھی نکل کر مسجد سے باہر چلا جا کہ تو بھی منافق ہے۔

گویا میں نے ردائے رحمت ڈال رکھی تھی تم اترا رہے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے تمہارے حال کی خبر نہیں، نکلو نکلو، اب تو تمہیں یقین ہو گیا ہوگا کہ مجھے صرف ڈھکے چھپے کی ہی خبر نہیں۔ دل کے ارادوں کا بھی پتہ ہے۔

آیت کے اس شان نزول کے پس منظر میں امام عالی مقام کا اس آیت کو تلاوت کرنے کا مطلب وہ بھی اس خاص وقت میں یہی ہوا کہ آپ رات بھر اعلان فرماتے رہے، لوگو! تم پر یزیدیوں کے اسلامی نام، ان کے کلمہ ونماز، ان کی تسبیح وتلاوت، ان کے سجدوں اور مصلوں، ان کی کثرت بلکہ ان کے مسلمان ہونے سے دھوکہ کھا رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ مسئلہ خلافت میں وہ حق پر ہیں، اور ان کی امارت اسلام کی حفاظت کی ضامن ہے، اچھا کل صبح ہونے دو، آفتاب چمکنے دو، میدان کارزار گرم ہونے دو، کربلا کی ریت کا ذرہ ذرہ پکارے گا، چڑھتی دھوپ کی ایک ایک کرن گواہی دے گی، قربان گاہ تسلیم ورضا پر گرنے والا مظلوموں کا خون شہادت حق ادا کرے گا اور جنگ کا غبار صاف ہوتے ہی عیاں ہو جائے گا کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر، کون اسلام کے قانون کی حفاظت کرنے والا ہے اور کون اس کی دھجیاں اڑانے والا ہے، کون اسلام کی خاطر اپنے کو قربان کرتا ہے، اور کون اپنی خواہشات کی قربان گاہ پر اسلامی احکام کو بھینٹ چڑھا دیتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جیسے جیسے آفتاب چڑھتا گیا، اور جنگ کا تنور گرم ہوتا گیا، قدم قدم پر یہ روشن ہوتا گیا کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کے احکام کی حفاظت کرنے والے اور شامی و کوفی اس کو پاش پاش کرنے والے ہیں۔

(۱) اسلامی احکام میں نماز کو جو اہمیت، فضیلت اور اولیت حاصل ہے کسی سے پوشیدہ نہیں، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

الفرق بین العبد والکفر ترک الصلوۃ۔ [السنن الترمذي ۲/ ۹۰]

نماز مسلم اور غیر مسلم کے مابین امتیازی نشان ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس چودہ سو سال کی لمبی تاریخ میں زمانہ بدل گیا، تہذیب وتمدن میں تغیر ہو گیا، اور قومیں ادھر سے ادھر ہو گئیں، لیکن کل بھی مسلم وغیر مسلم میں وجہ امتیاز نماز تھی اور آج بھی نماز کہ دو آدمیوں میں ہر چیز مشترک ہو سکتی ہے، نئی تہذیب میں ایسا کچھ بھی مشکل نہیں، لیکن نماز تمام اشتباہوں کے بعد بھی خط امتیاز قائم کر دیتی ہے، میرے سرکار سید الابرار ﷺ فرماتے ہیں:

الصلوۃ عماد الدین، فمن اقامها فقد اقام الدین، ومن ترکها فقد هدم الدین۔ [احیاء العلوم، ۱/ ۱۴۱]

نماز دین کا ستون ہے جس نے نماز قائم کیا اس نے دین قائم کیا اور جس نے چھوڑ دی اس نے گویا دین بھی ڈھا دیا۔

نماز وہ بندگی پروردگار ہے کہ آج سے ۱۴ سو سال قبل دیکھنے والے پر اس کا جو اثر پڑتا تھا، آج چودہ سو سال کے بعد بھی اس کا وہی اثر قائم اور زندہ ہے۔

ابو طالب نے حضرت علی کو حضور ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے دیکھ کر فرمایا: کیا عمدہ عبادت ہے، میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں ان کے ساتھ نیت باندھ کر کھڑا ہو جاؤں، اور آج پروفیسر حتی لکھتے ہیں کہ، نماز میں مجھ کو مساوات کا ایسا دل کش نظارہ نظر آتا ہے کہ میں جب مسلمانوں کو نماز پڑھتے دیکھتا ہوں تو ہر چند کہ میں مسلمان نہیں ہوں، لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ میں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاؤں۔

ہم نے تو تاریخ میں یہی پڑھا ہے کہ دشمن نے مسلمان کو میدان جنگ میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھ کر تلوار رکھ دی اور لڑنا چھوڑ دیا کہ ہم اس قوم سے کیا جنگ کریں جو عین تلواروں کے سایہ میں خدا کی عبادت نہیں چھوڑتی۔

عالمگیر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا مقابلہ جب عبد العزیز خاں افغان سے ہوا تو آپ نے

ٹھیک عالم کارزار میں نماز خوف کے لیے صفیں درست کرنے کا آرڈر دیا، عبدالعزیز نے سمجھا کہ عالمگیر جنگ کی کوئی نئی حکمت عملی ترتیب دے رہا ہے، لیکن شمشیر وسناں کی چھاؤں میں جب مصلی بچھا کر رب العٰلمین کی بارگاہ بے نیاز میں سر بسجود دیکھا تو اپنے سپہ سالار سے کہلا بھیجا، جنگ بند کرو، لڑائی روک دو میں ایسے آدمی کے خلاف جنگ لڑ ہی نہیں سکتا، جو میدان جنگ میں بھی نماز کو نہ بھولے۔

یہی نماز کربلا میں بھی تھی اور ٹھیک یہی عالم کارزار بھی تھا، تلواروں کی چھاؤں بھی تھی، اور برچھیوں کا نرغہ بھی، اس عالم میں امام عالی مقام نے نماز یاد رکھی اور شامیوں نے بھلادی، روایت ملاحظہ ہو:

امام گردوں جناب کے ساتھی یکے بعد دیگرے قتل ہوتے ہی رہے، ہاں یہ بات البتہ تھی کہ جب امام کے ساتھیوں میں سے ایک دو بھی مارے جاتے تو بڑا خلا ادھر محسوس ہوتا اور شامیوں کی تعداد زیادہ تھی بہت مارے جانے کے بعد بھی ان میں کچھ پتہ نہیں چلتا، ابوثمامہ عمرو بن عبداللہ الصائدی نے جب یہ منظر دیکھا تو امام کی بارگاہ میں حاضر ہو کر عرض کی: امام میری جان آپ پر قربان، میں دیکھ رہا ہوں کہ ظالم آپ سے قریب ہوتے جا رہے ہیں، واللہ العظیم خدا نے چاہا تو جب تک میں آپ کے قدموں پر قربان نہ ہولوں وہ آپ کو قتل نہیں کر سکتے (اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میری قربانی کا وقت بھی آہی پہونچا ہے) اور مجھے یہ پسند ہے کہ میں اپنے رب سے اس حال میں ملاقات کروں کہ وہ نماز پڑھ چکا ہوں جس کا وقت قریب آچکا ہے (یعنی ظہر۔

راوی کہتا ہے کہ امام نے ثمامہ کی بات سن کر سر اٹھایا اور فرمایا: تو نے نماز یاد دلائی، اللہ تعالیٰ تم کو نمازیوں اور خدا کی یاد کرنے والوں میں سے بنائے، ہاں نماز تو پڑھنی ہی چاہیے، لیکن یہ اس کا ابتدائی وقت ہے، اچھا ان یزیدیوں سے پوچھ لو اگر اتنی دیر یہ جنگ روک لیں کہ ہم نماز پڑھ لیں، چناں چہ حسب الحکم پوچھا گیا اور نماز کی اجازت چاہی گئی، اس پر الحصین ابن تمیم نے شامیوں کی طرف سے جواب دیا، آپ لوگوں کی نماز قبول نہ ہو گی۔ [طبری ۶/۲۴۷]

پھر اسی کے ایک صفحہ بعد ہے:

ثم صلوا الظہر صلی بہم الحسین صلوٰۃ الخوف.

[طبری ج ۲۳۹/۶ دار الفکر]

اس کے بعد امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان سب لوگوں کو صلوۃ خوف پڑھائی۔

میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس کے بعد بھی یہ روشن ہونا باقی رہ گیا ہے کہ قانون اسلام کی نگہ داشت کون کر رہا تھا، اور اس کی دھجیاں کون اڑا رہا تھا۔

نماز خوف کے لیے دشمنوں سے اجازت لینے کی قطعاً ضرورت نہیں، لیکن امام عالی مقام نے غالباً یہی ظاہر کرنے کے لیے کہ مسلمان تو وہ بھی ہیں، نماز تو انہیں بھی پڑھنا ہے، اختلاف تو بیعت وخلافت کا ہے؟ نماز کا نہیں، بالقصد ان سے نماز کی اجازت طلب کرائی اور دیکھیے کہ نماز کی حرمت ان کی نگاہ میں کتنی ہے، اور وہ بھی جگر گوشہ رسول اور نور دیدۂ بتول کی نماز، جی ہاں ان کی نماز جن پر نماز میں درود بھیجنے کا حکم ہر مسلمان کو ہے۔

(۲) اسلام اور مسلمانوں کا خاص شعار پانی پلانا ہے اور پیاسوں کو سیراب کرنا ہے، احادیث کریمہ میں اس کی طرح طرح پر تاکید فرمائی گئی ہے۔

چنانچہ ایک حدیث میں ہے:

عن ابی ھریرۃ قال: قال رسول اللہ ﷺ: غفر لامرأۃ مومسہ مرت بکلب علی راس رکی یلھث کاد یقتلہ العطش فنزعت خفھا، فأثقتہ بخمارھا فنزعت لہ من الماء فغفر لھا بذلک، قیل: ان لنا فی البھائم اجراً قال: فی کل ذات کبد رطبۃ أجر. [مشکوۃ ص ۱۶۸، باب فضل الصدقہ مجلس برکات]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ حضور جان نور ﷺ نے فرمایا: کہ ایک عورت گنہگار ایک پیاسے کتے کی وجہ سے بخش دی گئی، وہ ایک قریب المرگ کتے کے پاس سے گزری جو ایک کنوئیں کے پاس بے قراری سے گیلی مٹی چاٹ رہا تھا اور اس کو پیاس مارے ڈال رہی تھی، اس فاجرہ عورت کو ترس آ گیا اس نے پاؤں سے موزہ نکالا اپنی اوڑھنی کی رسی بنائی اور کنویں سے پانی نکال کر کتے کو پلا دیا تو بخش دی گئی، لوگوں نے پوچھا: یا رسول اللہ! جانوروں

کے ساتھ بھلائی میں نیکی ہے فرمایا: ہاں ہر تر جگہ میں اجر وثواب ہے۔

ایک دوسری حدیث شریف میں اس سے زیادہ موثر پیرائے میں مواسات وغم خواری سیرابی تشنگاں اور تیمارداری پر روشنی ڈالی گئی ہے:

عن ابی هريرة رضي الله تعالىٰ عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ان الله تعالى يقول: يوم القيامة يا ابن آدم! مرضت فلم تعدني، قال: يارب! كيف اعودك وانت رب العلمين، قال: اما علمت ان عبدی فلانا مرض فلم تعده، اما علمت لو عدته لو جدتني عنده. يا ابن آدم! استطعمتک فلم تطعمنی، قال: يارب! كيف اطعمك وانت رب العلمين، قال: اما علمت انه استطعمک عبدي فلان فلم تطعمه، اما علمت انک لو اطعمته لوجدت ذلك عندي، يا ابن آدم! استسقيتك فلم تسقني، قال: يارب اكيف اسقيك وانت رب العلمين، قال: استسقاک عبدی فلانفلم تسقه اما انک لوسقيته وجدت ذلك عندي. [مشکوٰۃ ص۱۳۴، مجلس برکات]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا: اے شخص میں مریض ہوا تو نے میری عیادت نہیں، کی بندہ عرض کرے گا: تو رب العالمین ہے بھلا میں تیری عیادت کیسے کر سکتا ہوں؟ ارشاد ہوگا: ٹھیک ہے لیکن میرا فلاں بندہ بیمار ہوا اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے وہیں۔ پاتا اے ابن آدم! میں۔ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے کھلایا نہیں، بندہ عرض کرے گا: اے کائنات کے پالن ہار میں تجھے کس طرح کھلا سکتا ہوں؟ حکم ہوگا میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانے کی درخواست کی تو نے ٹھکرادی اسے کھلا دیتا تو مجھ کو اسی کے پاس پالیتا۔ اے انسان میں نے تجھ سے سیرابی چاہی تو نے مجھ پانی نہیں پلایا، بندہ پھر حیرت زدہ ہو کر کہے گا: یارب العالمین بھلا میں تجھ کو کس طرح پانی پلا سکتا ہوں؟ کہا جائے گا: میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تھا تو نے پلادیا ہوتا تو اس کا اجر میرے پاس پاتا۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ایک اور بدیع طریقہ سے سقایہ کی فضیلت پر اپنے اصحاب کو برانگیختہ کیا:

عن سعد ابن عبادہ قال: یارسول الله ان ام سعد ماتت فای الصدقة افضل قال: الماء، فحفر بیرا وقال: هذه لام سعد. [مشکوۃ ص۱۶۹]

سعد بن عبادہ نے عرض کی: یارسول میری ماں مرگئی تو اس کے ایصال ثواب کے لیے کون سا صدقہ اچھا رہے گا، آپ نے فرمایا: ''پانی'' حضرت سعد نے ایک کنواں کھدوایا اور اس پر اپنی ماں کا نام پکارا کہ ''یہ کنواں سعد کی ماں کا ہے''

ایک اور حدیث میں ہے:

ایما مسلم سقی مسلما علی الظماء، سقاه الله من الرحیق المختوم.

[مشکاۃ ص ۱۶۹]

جو مسلمان کسی پیاسے مسلمان کو پانی پلائے تو اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن مہر لگی ہوئی شراب پلائے گا۔

اب آیئے اور ہم دیکھیں کہ میدان کرب وبلا میں کس نے اسلام کے اس پیغام کی حرمت باقی رکھی اور کون اس کی تقدیس کو پارہ پارہ کرنے والا ثابت ہوا۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس جب پانی تھا تو آپ نے اپنے دشمنوں اور خون کے پیاسوں کو بھی سیراب کیا۔

امام طبری لکھتے ہیں:

''حر بن یزید تمیمی کے ساتھ ہزار سپاہی سخت دوپہر میں آئے اور امام حسین کے مقابل دھوپ میں ہی کھڑے ہوئے، حضرت امام حسین اور ان کے ہمراہی عمامہ باندھے اور تلوار حمائل کئے ہوئے تھے، تو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ہمراہی نوجوانوں کو حکم دیا کہ آنے والوں کو پانی پلاؤ اور سیراب کرو اور گھوڑوں کو تھوڑا تھوڑا کر کے پلاؤ تو امام کے نوجوان ہمراہی پیالے، طشت اور لگن لے کر بڑھے لوگوں کو پلایا، جانوروں کو سیراب کیا، علی بن طعان کا بیان ہے کہ میں حر

کے ہمراہیوں میں سب سے بعد میں وہاں پہونچنے والا تھا، امام عالی مقام نے میرا اور گھوڑے کا حال دیکھا تو فرمایا: مشک جھکاؤ اور پانی پیو میں جب پینے کی کوشش کرتا پانی بہنے لگتا، امام نے فرمایا: اسے جھکا کر پیو، لیکن انہوں نے جب یہ دیکھا کہ مجھ کو اس کا سلیقہ نہیں ہے تو خود میرے واسطے مشکیزہ خم کیا اور میں نے سیراب ہو کر پانی پیا اور گھوڑے کو پلایا"۔

[طبری ۶/۲۱۳، دار الفکر]

حر بن یزید کو کون نہیں جانتا ہے اور امام کا یہ سلوک ان کے اور ہمراہیوں کے ساتھ اس وقت تھا جب وہ امام عالی مقام کو گھیر کر کربلا تک لے جانے کے لیے دشمن کی طرف سے آئے تھے، لیکن جب منظر بدلا پانی پر اہل شام کا قبضہ ہوا تو وہ عالم ہوا کہ اس پر آج تک دریائے فرات پانی پانی ہے، چنانچہ حادثۂ کربلا اور تاراجیٔ آل عباس سے تین یوم قبل ۷/محرم کو عبید اللہ بن زیاد کا ظالمانہ اور سنگ دلانہ حکم آتا ہے:

اما بعد: فحل بين الحسين وأصحابه وبين الماء ولا يذوقوا منه قطرة، فبعث عمر بن سعد عمر بن الحجاج على خمس مائة فارس، فنزلوا على الشريعة وحالوا بين حسين واصحابه وبين الماء ان يسقوا منه قطرة.

[طبری ۶/۲۲۰]

حمد وصلاۃ کے بعد تم کو حکم دیا جاتا ہے کہ امام حسین اور ان کے ہمراہیوں اور پانی کے درمیان روک ڈال دو وہ ایک قطرہ پانی بھی نہ پی سکیں، تو اس حکم کی تعمیل میں عمر بن سعد نے عمر بن الحجاج کو پانچ سو سواروں کا دستہ دے کر دریا کے کنارے بھیج دیا جو ایک قطرہ آب کی بھی راہ روک کر بیٹھ گئے۔

پھر سورج رات دن کا منظر بدلتا رہا، ریت بھبھول کی طرح گرم ہوتی رہی اور اسی طرح ۳ دن بیت گئے، لیکن پانی عنقا کی طرح امام اور خیمہ سے دور رہا، اہل بیت نبوت کے ہونٹ بھوک و پیاس کی شدت سے خشک ہوتے گئے، گلے میں کانٹے پڑتے رہے اور بچے بوڑھے، نوجوان مرد عورتیں اور بچیاں سب تشنگی کی آگ میں جلتے رہے۔

ننھے علی اصغر نے ایڑی رگڑی، ہاتھ پاؤں پٹکے، بار بار سوکھی زبان نکالی، آنکھیں الٹی، صرف ایک گھونٹ پانی کے لیے، مگر جواب کیا ملا؟ ایک سنسناتا ہوا تیر جو سوکھے گلے کو پار کرتا ہوا خود انہیں کے خون سے ان کو سیراب کر گیا۔

چھوٹی سکینہ کی بے قراری دیکھ کر آپ کے بھائی حضرت عباس نے مشکیزہ اٹھایا اور جان کی بازی لگا کر دشمنوں کے حصار کو توڑا اور مشک فرات کے پانی سے بھر لیا، آہ کتنا حوصلہ ہوگا اس شیر دل مجاہد کے دل میں، عباس یہ پانی سے بھرا ہوا مشک جس وقت خیمہ حسین میں پہونچے گا ننھے ننھے بچوں کا جوش مسرت دیدنی ہوگا، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جذبہ تشکر واستحسان قابل ملاحظہ ہوگا، مشک کندھے سے لٹکائے دونوں ہاتھوں سے فوج اعدا کو مارتے ہٹاتے، راستہ صاف کرتے خیمہ آل عبا کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں کہ کسی نے پیچھے سے ایسا ہاتھ مارا کہ وہ ہاتھ ہی شانے سے کٹ کر علیحدہ ہو گیا، جس میں مشک لٹک رہا تھا، آپ نے نہایت پھرتی اور چابک دستی سے دوسرے ہاتھ سے مشکیزہ سنبھالا، اور اسی سے دفاع کرتے ہوئے آگے بڑھے کہ دوسرا ہاتھ بھی اسی طرح شانے سے الگ کر دیا گیا، گرتی ہوئی مشک کا تسمہ دانتوں میں دبا لیا، اور اس جد وجہد کے نتیجہ میں شاید دشمنوں کے نرغہ سے باہر بھی آ گئے ہوں اور امید ہو چلی ہوگی کہ جسم زخموں سے چور اور لہو میں تر بتر ہے تو کیا ہوا؟ دونوں شانوں سے ہاتھ کاٹ دیئے گئے تو کیا غم؟ خیمہ امام میں پانی تو پہونچ جائے گا، میں سمجھوں گا کہ زندگی کی بازی جیت لی، کہ اسی عالم امید ورجا میں ایک سنسناتا ہوا تیر مشک کو چھیدتا ہوا گزر جاتا ہے، اور سارا پانی ریت میں جذب ہو جاتا ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمت ٹوٹ گئی اور گھوڑے پر بیٹھا رہنا بھی دوبھر ہو گیا، زمین پر تشریف لائے اور پکارا "یا اخاہ ادرکنی" بھائی جان عباس آپ پر قربان اس کی خبر لیجیے۔

اس پورے حادثے میں ساقی کوثر کے نونہالوں کی تشنگی اور ایک ایک قطرہ آب کے لیے تڑپ تڑپ کر جان دینے کے کئی ایک مناظر آتے ہیں، کہ پتھر بھی پسیج جائے، لیکن ان درندہ صفت انسانوں کے دل میں اسلامی رواداری کا کیا سوال، انسانی مروت کی آخری رمق بھی ختم

ہو چکی تھی، وہ امام کے بچوں کو تڑپتا دیکھتے، جوانوں کو خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا دیکھتے، اور دریائے فرات کا پانی دکھا دکھا کر امام سے کہتے:

الاتنظر الی الماء کانہ کبدالسماء، واللہ لاتذوق منہ قطرۃ حتی تموت عطشاً. [طبری ۲۲۰/۶]

امام فرات کے پانی کو نہیں دیکھ رہے ہو جیسے نکھرا ہوا آسمان، مگر خدا کی قسم آپ اس کا ایک قطرہ چکھ بھی نہیں سکتے، آپ کو تو پیاسا ہی مرنا ہے۔

میں کہتا ہوں: کیا اس کے بعد بھی کوئی کہہ سکتا ہے کہ یزید اسلام کی حرمت کا پاسبان تھا؟ امام ذی وقار نے اپنے کردار سے روز روشن کی طرح عیاں فرما دیا کہ کون رسول اللہ ﷺ کے دستور کا پالن کرنے والا ہے، اور کون اس کو رد کرنے والا ہے، سچ فرمایا تھا: امام ہمام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے: ماکان اللہ لیذر المومنین علی ماانتم. (الآیہ)

(۳) اسلام نے عورت کی حرمت کا غیر معمولی لحاظ فرمایا اور اس کچلے ہوئے طبقہ کو ذلت ومحرومی کی پستی سے نکال کر ثریا کی بلندی تک پہونچا دیا، وہ مرد جو عورت کو اپنی ہوس رانی کے کھلونے سے زائد حیثیت دینے کو تیار نہ تھا، اس کو بتایا ﴿ھن لباس لکم وانتم لباس لھن﴾ مردو! تم میں اور عورتوں میں صرف بازی گر اور کھلونے کی نسبت نہیں ہے، وہ تمہاری آرائش ہیں، اور تم ان کی زینت ہو، ان سے تمہاری حفاظت ہے اور تم ان کے محافظ ہو، وہ تمہاری پردہ پوش ہیں اور تم ان کے پردہ دار ہو، نادانو! وہ کھلونا نہیں ہیں جنہیں جب چاہا کھیلا اور جب چاہا توڑ پھوڑ کر پھینک دیا، وہ تمہاری زندگی کی گاڑی کا دوسرا پہیہ ہیں اور تمہاری شریک حیات ہیں۔

﴿ومن آیاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ ورحمۃ﴾

اللہ کی قدرت کی دلیلوں میں سے ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے کہ اس نے تمہارا جوڑا تمہیں میں سے بنایا اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت ڈال دی۔

مرد نے عورت کے تمام حقوق پامال کر رکھے تھے، اور اسے کسی معاملہ میں مساویانہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہ تھا، پیغمبر اسلام ﷺ نے مردوں کو للکارا ﴿ولھن مثل الذی علیھن﴾ اب یہ ظلم ختم کیا جاتا ہے، اور رحمت عالم کی بارگاہ سے آزادی نسواں کا منشور عطا ہوتا ہے کہ جس طرح مردوں کے عورتوں پر حقوق ہیں اسی طرح عورتوں کے بھی مردوں کے ذمہ حقوق ہیں اور مطالبے ہیں، جن کی ادائے گی ضروری ہے۔

اللہ اللہ پیش گاہ نبوت سے عورتوں کے ساتھ رفق ومروت، لطف ومہربانی کے کیسے کیسے فرمان صادر ہوئے، ایک دفعہ آپ سفر میں تشریف لے جارہے تھے، کچھ عورتیں بھی ہمرکاب تھیں کسی ساربان نے عرب کے دستور کے مطابق حدی خوانی ونغمہ باری شروع کی تو آپ نے عورتوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: "رفقا بالقواریر" ان آبگینوں کے ساتھ نرمی کرو، یا تو اس خیال سے حدی خوانی سے اونٹ تیز رفتار ہوں گے جس سے ان کی پیٹھ پر سوار ہونے والی عورتوں کو تکلیف ہوگی یا اس خیال سے کہ شعر خوانی سے عورتوں کے جذبات پر نامناسب اثر پڑ سکتا ہے، گویا یہ عورتیں آبگینہ ہیں آبگینہ جنہیں شکست وریخت سے دوچار ہونے کے لیے ہلکی سی ٹھیس بھی کافی ہے، اے مردو! عورتوں کو ٹھیس لگانے سے بھی باز آؤ۔

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

دنیا کی کسی قوم میں اس خلق نبوی کی مثال ملنی مشکل ہے کہ صرف اپنی عورتوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک نہیں، دشمن کی عورتوں کے ساتھ بھی جو میدان جنگ میں مسلمانوں کے سامنے آئیں، اسلام ان کے ساتھ بدسلوکی کی اجازت نہیں دیتا اور مسلمان سپاہیوں کو ان پر ہاتھ اٹھانے سے سختی کے ساتھ منع کرتا ہے، رسول اللہ ﷺ اور ان کے بعد خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کسی بھی خطۂ ارض میں اسلامی فوج روانہ کرنے سے پہلے یہ تاکید فرماتے تھے، خبردار، خبردار، عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھانا، ایک دفعہ کسی غزوہ میں آپ کی نگاہ ایک ایسی عورت پر پڑی جس کو کسی نے غلطی سے قتل کر دیا تھا، آپ گھبرا اٹھے اور بار بار فرماتے: اللھم انی ابرء الیک، اللھم انی لم او مربہ، اللھم انی مارضیت بہ" (او کماقال)

یا اللہ میں تیری جناب میں اس سے برأت ظاہر کرتا ہوں، یارب نہ میں اس سے راضی ہوں، نہ میں نے اس کا حکم دیا۔

اسی رحمۃ للعالمین کی امت کربلا کے میدان میں بھی تو تھی، کیا اس کے لیے یہ احکام نہ تھے، پھر ان کے سامنے دشمنوں اور غیر مسلموں کی عورتیں بھی نہ تھیں، خاص ان کے رسول کی بہو بیٹیاں، نواسیاں اور پوتیاں تھیں، لیکن آہ کہ ان ظالموں نے ان پاک نفس پردگیان عفت وعصمت کے ساتھ وہ سلوک کیا کہ دشمن بھی نہ کرتا۔

جن کے حرم میں فرشتے بے اجازت پر نہ مار سکیں، جن کی بارگاہ میں باریابی کے لیے آفتاب کی دوشیزہ کرنیں بھی تھرتھرائیں، افسوس کہ یہ سفاک قتل حسین کے بعد ان کے خیموں میں سفاکانہ گھس گئے، مال واسباب لوٹا، زیور اتروالیا، اور بے دردانہ سب کو قیدی بنالیا۔

لاعلمی میں قتل ہوجانے والی عورت کے خون سے برأت ظاہر کرنے والے رسول، عورت کے قتل سے شدت کے ساتھ روکنے والے رسول اللہ ﷺ کی ناہنجار امت نے میدان کربلا میں یہ بھی کیا کہ جن عورتوں کو امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دامن کرم میں پناہ دی تھی، ان کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے، اور انہیں ذرا بھی خوف خدا اور شرم از رسول دامن گیر نہ ہوئی، امام طبری فرماتے ہیں:

''ابو جناب کی روایت ہے کہ ہم میں ایک آدمی عبداللہ بن عمیر نامی قبیلہ بنوعلیم کا تھا، کوفہ میں بیر جعد کے پاس مکان بنا کر اقامت گزیں تھا، اور اس کے ساتھ اس کی بیوی قبیلہ نمیر کی ام وہب نامی رہتی تھی، قتل امام عالی جناب کے قریب اس نے کوفہ میں فوجیوں کی آمد ورفت کربلا کی طرف سپاہیوں کو کوچ کرتے دیکھا، پوچھا تو اس کو بتایا گیا ہم لوگ فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کے لڑکے امام حسین کے ساتھ لڑنے کے لیے جارہے ہیں، عبداللہ نے سوچا مجھے مشرکین سے جہاد کرنے کا بڑا شوق تھا، اور میرا خیال ہے کہ جو لوگ اپنے نبی کے نواسے سے جنگ کررہے ہوں ان سے جہاد مشرکین کے ساتھ جہاد سے کم درجہ نہ ہوگا''۔

گھر جاکر اپنی بیوی سے مشورہ کیا اور حالات سے باخبر بنایا، ام وہب نے کہا آپ کی

رائے ٹھیک ہے، اور خدا ہمیشہ یونہی آپ کو اچھے کام کی ہدایت دیتا رہے، آپ مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں، چنانچہ وہ اپنی گھروالی کے ساتھ میدان کربلا میں امام عالی مقام رضی اللہ تعالی عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جب جانبین صف بستہ ہوچکے تو عمر بن سعد نے سب سے پہلے اپنا تیر پھینکا پھر دیگر لوگوں نے تیر بازی کی، اور لشکر یزید کی طرف سے یسار، زیاد ابن ابی سفیان کا غلام اور عبیداللہ ابن زیاد کا غلام ساتھ نکلے اور لڑنے والوں کا مطالبہ کیا، ان کے مقابلہ کے لیے بریر بن حضیر اور حبیب ابن مظاہر نے نکلنا چاہا، امام گردوں جناب نے انہیں روکا تو حضرت عبداللہ بن عمیر آگے بڑھے اور عرض کیا اے ابوعبداللہ (امام حسین) آپ مجھے ان سے مقابلہ کرنے کی اجازت دیں، آپ نے عبداللہ بن عمیر کے سراپا پر نگاہ کی، ایک قدآور بھرے بھرے بازوؤں چوڑے چکلے سینہ والا جوان نظر آیا، آپ نے فرمایا: تم بہادر جنگ جو معلوم ہوتے ہو، جی چاہے تو ان کا مقابلہ کرو، عبداللہ نے امام کی بارگاہ سے اجازت پا کر میدان کا رخ کیا، دونوں شامی فوجیوں نے عبداللہ کا نام ونسب پوچھا: آپ نے بیان کیا تو بولے: تم ہمارے ہمسر نہیں، ہمارے مقابلہ کے لیے تو زہیر بن قین، حبیب بن مظاہر یا بریر بن حضیر وغیرہ کو آنا چاہیے، حضرت عبداللہ نے انہیں گالی دے کر کہا: حرامیو! تمہیں اپنے سے کم رتبہ آدمی سے لڑنے سے انکار ہے، فلاں یا فلاں کو ہی آنا چاہئے، ان پر حملہ کردیا، ابھی وہ یسار کے ساتھ ہی الجھے ہوئے تھے اور اس پر ایسا وار کیا تھا کہ اس کا کام تمام ہی کردیا تھا، کہ سالم نے ان پر حملہ بول دیا، لوگ چلانے لگے، عبداللہ ہوشیار ابن زیاد کا غلام تمہیں ہلاک کرنے کے لیے پہونچ چکا ہے، مگر حضرت عبداللہ اس وقت متوجہ ہوسکے جب اس نے آپ پر تلوار چلادی، آپ نے اس کا وار بائیں ہاتھ پر روکا جس سے آپ کے بائیں ہاتھ کی انگلیاں کٹ کر علیحدہ ہوگئیں۔ اس کے بعد آپ نے حملہ کرکے اسے قتل کردیا، آپ کی عورت ام وہب نے یہ منظر دیکھا تو برداشت نہ کرسکیں، ایک ڈنڈا لے کر میدان میں نکل پڑیں، اپنے شوہر کو للکارتی جارہی تھیں، میرے ماں باپ تم پر فدا، حضور پاک ﷺ کی پاک اور ستھری اولاد کی مدافعت میں خوب جہاد کرو، حضرت عبداللہ نے انہیں واپس پلٹانا چاہا تو دامن ان کے ہاتھ سے کھینچ کر بولیں: میں نے تو تمہارے ساتھ مرنے کی قسم کھائی

ہے، یہ دیکھ کر امام حسین نے پکارا، اہل بیت کی طرف سے خدا تمہیں بہتر بدلہ دے، اے ام وہب لوٹ آؤ، اور عورتوں کے ساتھ بیٹھو، اسلام میں عورتوں پر جہاد نہیں ہے، یہ سن کر ام وہب پلٹ پڑیں۔ [طبری ۶/۲۳۱]

راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد امام عالی مقام اور ان کے ساتھیوں پر اہل شام کی طرف سے حملہ عام شروع ہوگیا، اس جنگ مغلوبہ میں بھی کلبی (عبداللہ) نے خوب داد شجاعت دی، اور بڑی سخت جنگ کی، تو ہانی بن ثبت اور بکیر بن حی نے مل کر ان پر حملہ کیا اور حضرت عبداللہ الکلبی کو شہید کرڈالا، حضرت امام کی طرف سے یہ دوسرے شہید تھے۔ [طبری ص ۲۵۰]

راوی کہتا ہے کہ حضرت عبداللہ الکلبی کی شہادت کے بعد ان کی بیوی لشکر امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مٹی اور خون صاف کرتی جاتی تھی، اور کہتی جاتی تھی، آپ کو جنت مبارک ہو، آپ کو جنت مبارک ہو۔

شقی ازلی شمر ذی الجوشن نے یہ منظر دیکھا تو ظالم بولا: اے رستم ایک لکڑی سے اس عورت کا سر توڑ دو اور اس نابکار نے واقعۃً اس مظلوم کے سر پر اس زور سے ڈنڈا مارا کہ سر کے ٹکڑے اڑ گیے اور وہ بے چاری وہیں شہید ہوگئی، اس کے بعد اسی بد بخت شمر نے چیخ کر کہا: آگ لاؤ میں امام حسین کا خیمہ کیوں نہ جلادوں اور نیزہ سے خیمہ حسین پر حملہ کیا، خیمہ کے اندر کی عورتیں چیخ کر باہر نکل آئیں اور امام عالی مقام نے اس کو مخاطب کر کے کہا: اے او ذی الجوش کے لڑکے تو میری زندگی میں ہی میرے اہل بیت کے خیمہ میں آگ لگا رہا ہے۔ [طبری ۶/۲۴۷]

اس مظلوم نوحہ گر امرأۃ کلبیہ کا قتل، اور بچوں اور عورتوں کے خیمہ میں آگ لگانے کا عزم ناپاک یہ اعلان کر رہا ہے کہ میدان کربلا میں صرف امام حسین کا ہی خون نہیں بہایا گیا، ایک ایک کر کے بے شمار اسلامی حرمتوں کا بھی قتل ہوا، اور قوانین اسلام کی غارت گری کی گئی، امام حسین شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی اس عظیم قربانی کے ذریعہ دنیا پر یہی واضح کرنا چاہتے تھے کہ یہ قوم جو اقتدار اور قوت کے نشے میں سرشار ہو کر خلافت اسلامیہ اور نیابت رسول کی دعویدار بن رہی ہے درحقیقت میں غارت گر اسلام اور قاتل حرمت اسلام ہے۔

(۴) چھوٹوں پر شفقت، یتیموں پر رحمت اور بچوں کے ساتھ پیار کا سلوک اسلامی اخلاقیات کا ایک تابندہ پہلو ہے، حضور رسالت مآب ﷺ نے ہمیشہ یتیموں کے آنسو پونچھے اور چھوٹوں کے سر پر دست کرم پھیرا، ارشاد ہے:

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا. [مشکاۃ شریف ص ۴۲۳]

جس نے چھوٹوں پر شفقت نہ کی، اور بڑوں کی تعظیم نہ کی وہ ہمارے طریقہ پر نہیں ہے۔

اسلامی سوسائٹی میں چوں کہ یتیم سب سے زیادہ قابل رحم شخصیت ہے، اس لیے حضور جان نور ﷺ نے اس کے لیے بار بار خصوصی ہدایت فرمائی ہے:

خیر بیت فی المسلمین بیت فیه یتیم یحسن الیه. [ابن ماجہ ۲۶۲]

مسلمان گھروں میں سب سے بہتر وہ گھر ہے جہاں کوئی یتیم ہو جس پر احسان وسلوک کی بارش کی جاتی ہو۔

میدان جنگ میں جہاں عام طور سے تلواریں چھوٹے بڑے کی تمیز نہیں کرتیں، عورت مرد کا امتیاز نہیں برتتیں، جو بھی سامنے آیا بے دریغ اس کو قتل کر دیا جاتا ہے، لیکن اسلام کی فوجیں چوں کہ امن وراحت کی پیغام بر ہیں، اس لیے ان کو یہ حکم ہے مجرموں اور سرکشوں کے علاوہ کسی کو گزند نہ پہونچائی جائے، اور بچوں اور عورتوں کا خاص طور سے خیال رکھا جائے، پیغمبر اسلام ﷺ نے جب بھی کہیں لشکر روانہ فرمایا اس کی سخت ہدایت اور تاکید فرمائی:

کان رسول الله ﷺ اذا أمر امیراً علی جیش نفسه بتقوی الله ومن معه من المسلمین خیراً. ثم قال اغزوا بسم الله فی سبیل الله قاتلوا من کفر بالله اغزوا فلاتغلوا ولاتغدروا ولاتمثلوا ولاتقتلوا ولیدًا. [متفق علیہ]

حضور ﷺ جب بھی کسی کو کسی لشکر یا کسی چھوٹی فوج کا امیر قرار دیتے تو اس کو خود اس کے بارے میں خدا کے خوف اور جو مسلمان اس کے ساتھ ہوں ان کے بارے میں بھلائی کا حکم دیتے، پھر ارشاد ہوتا اللہ کے نام سے اللہ کے رستے میں کافروں سے جہاد کرو، خوب پامردی سے

لڑو پر زیادتی نہ کرنا بے وفائی سے پرہیز ضروری ہے اور خبردار خبرادار قتل کے بعد کسی کا مثلہ نہ کرنا اور دیکھو بچوں پر ہرگز ہاتھ نہ اٹھانا۔

ایک دوسری حدیث گرامی ہے:

نهى النبي ﷺ عن قتل النساء والصبيان.

[بخاری شریف ۱/۴۲۳، مجلس برکات]

حضور ﷺ نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا۔

چناں چہ پوری خلافت راشدہ کے دور میں اسی پر عمل درآمد رہا، اور ہر امیر اپنے سپہ سالار کو عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانے سے سختی سے روکتا رہا، اور اسلام کی اسی رحم دلانہ تعلیم کا نتیجہ تھا کہ اسلامی تاریخ کا یہ دل گداز واقعہ آج بھی بچوں کے ساتھ رحم و مروت کا سنگ میل بنا ہوا ہے۔

حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسلام کے ان مظلوم شہیدوں میں سے ہیں جنہیں غداروں نے قید کر کے مکہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا، تاکہ وہ جنگ بدر میں مرنے والے کسی کافر کے ثار (بدلہ خون) میں شہید کیے جائیں آپ کس شان کے قیدی تھے، خود اہل مکہ کا بیان سنئے۔

عن مارية مولاة حجير بن ابى اهاب وكانت قد اسلمت قالت: كان خبيب عندى حبس فى بيتى فلقد اطلعت عليه يوماً، وان فى يده لقطفاً من عنب مثل راس الرجل ياكل منه وما اعلم فى ارض الله عنبًا يوكل.

[الروض الأنف معہ سیرۃ النبویہ ۳/۳۶۷، دار الکتاب العلمیہ]

ماریہ جو حجیر بن اہاب کی باندی تھی اور بعد میں مسلمان ہوگئی، اس کا بیان ہے کہ میرے ہی مکان میں خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ قید تھے، میں نے ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک آدمی کے سر اتنا بڑا خوشہ انگور دیکھا، جس سے وہ کھا رہے تھے حالاں کہ اس وقت روئے زمین پر انگوروں کا موسم نہ تھا۔

آپ ہی اسلام کے وہ پہلے شہید ہیں جنھوں نے قتل سے قبل دو رکعت نفل پڑھنے کی روایت قائم کی، جب آپ کی شہادت کا وقت قریب ہوا تو یہی واقعہ پیش آیا جسے ہم نقل کرنا چاہتے ہیں:

قال ابن اسحاق انها قالت قال لي حين حضرة القتل: ابعثي اليّ بحديدة أتطهّر بها للقتل، قالت: فاعطيت غلامًا من الحي الموسیٰ فقلت: ادخل بها على هٰذا الرجل البيت، قالت: فوالله ما هو الا ان ولى الغلام بها اليه فقلت: ماذا صنعت اصاب والله الرجل ثاره بقتل هٰذا الغلام، فيكون رجلا برجل فلما ناوله الحديدة اخذها من يده ثم قال لعمرك ماخافت امك غدري حين بعثتك بهذه الحديدة الي ثم خلى سبيله.

[الروض الانف معہ السیرۃ النبویہ ۳/۲۶۷، دار الکتاب العلمیہ بیروت]

ابن اسحاق کی روایت ہے کہ اسی عورت کا بیان ہے کہ جب حضرت خبیب کی شہادت کی گھڑی قریب ہوئی تو مجھ سے کہا کہ استرہ دے دو کہ قتل کی تیاری میں بال وغیرہ درست کرلوں، میں نے خاندان کے ایک بچہ کے ساتھ استرہ بھیج دیا (ابن ہشام کا کہنا ہے کہ وہ بچہ اسی عورت کا تھا) معاً مجھے خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کیا؟ ایک آدمی کے پاس ہم جس کے خون کے پیاسے ہیں چھری کے ساتھ اس کا شکار بھیج دیا، اب تو وہ نہایت آسانی سے اس کو اپنے قتل کے انتقام میں مار ڈالے گا۔ (میں سخت بے قرار تھی مگر اس شہید کی ہمت کے قربان) یہ کہہ کر اس نے بچہ کو چھرا لے کر واپس آنے دیا، تیری ماں تجھے بھیجتے وقت اتنا بھی نہیں ڈری کہ میں تجھ سے انتقام لے سکتا ہوں۔

بچوں کے ساتھ اسلام کا وہ کردار ہے جس کی تعلیم رسول مختار ﷺ نے دی تھی، لیکن آیئے اور میدان کربلا میں اس کی تار تار دھجیاں ملاحظہ کیجیے، وہ دیکھیے امام گردوں جناب کے سارے جاں نثار ایک ایک کر کے آپ پر قربان ہو چکے ہیں، اب آپ یکہ و تنہا ہیں، حرم کی عورتیں ہیں، کچھ چھوٹے بچے ہیں، اور دشمنوں کی یلغار اپنے شباب پر ہے، تیروں کے پرے،

نیزوں کی انیاں تلوار کی بجلیاں ہر چہار جانب سے اسی ماہ امت کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں، اسی عالم میں امام محمد باقر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے مطابق۔

اتی الحسین بصبی له فهو فی حجره، اذ رماه احد من بنی اسد بسهم فذبحه، فتلقی الحسین دمه، فلما ملأ کفیه صبه فی الارض ثم قال: رب ان تک حبست عناالنصر من السماء فاجعل ذلک لماهو خیر. [طبری ج۶/۲۴۳]

حضرت امام عالی مقام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک بچہ لاکر آپ کی گود میں دیا گیا، وہ آپ کی گود ہی میں تھا کہ قبیلہ بنی اسد کے کسی ظالم نے تیر کا نشانہ لگا کر اس ننھی سی جان کو ختم کر دیا، آپ نے دونوں ہاتھ میں اس بچہ کے بے گناہ خون کو لے کر زمین پر بہا دیا پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا: پروردگار اگر تو نے ہم سے اپنی مدد روک لی ہے تو اس کو ہمارے بہتری کے لیے محفوظ رکھ۔

اسی عالم کا ایک دوسرا منظر بھی ملاحظہ ہو:

عن هانی ابن ثبیت الخضرمی قال: کنت ممن شهد قتل الحسین فوالله انی لواقف عاشر عشرة لیس منا رجل الاعلی فرس، وقد جالت الخیل وتصعصعت، اذ خرج غلام من آل الحسین وهو ممسک بعود من تلک الا بنیة، علیه ازار وقمیص وهو مذعور یلتفت یمینًا وشمالاً،فکانی انظر الی درتین فی اذنیه تذبذبان کلما التفت، اذا قبل رجل یرکض حتی اذا دنامنه مال عن فرسه ثم اقتصد الغلام فقطعه بالسیف، قالوا: لهانی هو صاحب الغلام، فلما عتب علیه کنی عن نفسه. [طبری۶/۲۴۳]

ہانی ابن ثبیت کا بیان ہے کہ میں قتل گاہ حسین میں حاضر تھا، ہم دس آدمی ایک ساتھ گھوڑوں پر سوار تھے، ان میں دسواں میں تھا، صفیں ٹوٹ چکی تھیں، اور سوار گردش میں تھے، اس عالم میں خیمۂ امام عالی مقام سے ایک بچہ ایک لکڑی ہاتھ میں لیے نکلا، تہ بند باندھے قمیص پہنے، دہشت زدہ ادھر ادھر تاک رہا تھا، اس کے کان میں دو موتیاں تھیں جو دائیں بائیں لڑنے کے

وقت ہلتی تھیں، اس بچے کی جانب ایک سوار گھوڑا بڑھا کہ متوجہ ہوا اور قریب پہونچ کر تلوار سے اس کا کام تمام کر دیا، لوگ کہتے ہیں کہ وہ صاحب واقعہ خود ہانی ابن شبیت ہی تھا، لیکن لوگوں کی لعنت وملامت کے خوف سے اپنا نام ظاہر نہیں کرتا تھا۔

ایک اور دل دوز نظارہ بھی پیش نظر ہے:

ثم ان شمر بن ذی الجوشن اقبل فی الرجالة نحو الحسين فاخذ الحسين يشد عليهم فينكشفون عنه، ثم انهم احاطوا به احاطة واقبل الى الحسين غلام من اهله فاخذته اخته زينب ابنة على لتحبسه، فقال لها الحسين احبسيه، وجاء يشد الى الحسين فقام الى جنبه وقال: قد اهوىٰ بحر بن كعب الى الحسين بالسيف، فقال الغلام: يا ابن الخبيثة أتقتل عمي؟ فضربه بالسيف فاتقاه الغلام بيده فاطنها الا الجلدة فاذا يده معلقة فنادىٰ الغلام يا امتاه فاخذه الحسين فضمه الى صدره، وقال: يا ابن اخي اصبر على مانزل بك واحتسب فی ذلک الخير فان الله يلحقک بآبائک الصالحين. [طبری ج ۶ / ۲۴۴]

شمر بن ذی الجوشن ۵۰ / سواروں کو لے کر حضرت امام حسین کی طرف متوجہ ہوا، امام نے ان سے مقابلہ کیا تو سب کائی کی طرح پھٹ گئے، لیکن پھر انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا، ناگاہ ایک چھوٹا بچہ خیمہ سے نکل کر امام کی طرف آنے کے لیے زور مارنے لگا، آپ کی ہمشیرہ حضرت زینب نے اسے روکا بھی، امام نے پکار کر فرمایا بھی کہ اس کو آنے نہ دینا، لیکن وہ دوڑتا ہوا امام عالی مقام کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو گیا، ادھر بحر بن کعب امام سلام اللہ علیہ پر حملہ کے لیے تلوار تول چکا تھا، بچے نے یہ دیکھا تو بے اختیار بول پڑا او خبیثہ کے بچے تو میرے چچا کو قتل کردے گا، اب وہی تلوار اس بچے پر جھک پڑی اور اس نے بچاؤ کے لیے ہاتھ اٹھایا تو اس کے ہاتھ کی کھال تک اڑا لے گئی، میں نے دیکھا اس کا ہاتھ جھول رہا تھا اور وہ شدت کرب میں اماہ اماہ کہہ کر چیخ رہا تھا، امام حسین نے اس کو اپنے سینے سے چمٹا کر فرمایا: میرے بھائی کی نشانی صبر کر اللہ تجھے ثواب دے اور تجھے تیرے آبا کے صالحین کرام کے پاس پہنچائے۔

میں کہتا ہوں: یہ امام عالی مقام کے ننھے بھتیجے کے ترشے ہوئے ہاتھ، یہ خیمۂ امام گردوں جناب کے اتنے چھوٹے بچے کی نعش جس کے کانوں میں ابھی گوشوارے آویزاں تھے، اور سب سے بڑھ کر آپ کی گود کی ننھی جان کا بے گناہ لہو، کیا پکار پکار کر نہیں کہہ رہا ہے کہ شہادت امام عالی مقام پر آنسو بہانے والو! آؤ دیکھو! کربلا میں صرف امام حسین کا بے گوروکفن لاشہ ہی پڑا ہوا نہیں ہے، حدیث رسول من لم یرحم صغیرنا کی لاش بھی ہمارے مظلوم خون میں نہائی ہوئی پڑی ہے، کیا اب بھی تمہیں شبہ رہ گیا ہے کہ یزید غارت گر حرمت اسلام نہیں ہے؟۔

(۵) رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک سے پہلے جنگوں میں اہل عرب کا یہ عام دستور تھا کہ اختتام جنگ کے بعد فاتحین اپنے مقتولوں کو دفن کرتے اور مخالف مقتولوں کی لاشیں یونہی چھوڑ دیتے جنہیں چیل کوے، گیدڑ اور کتے نوچتے رہتے، کتنے لوگ مخالف سورماؤں کی کھوپڑی میں شراب پیتے، اور ان کی نعشوں کی شکل بگاڑ دیتے، ناک، کان، ہونٹ کاٹ لیتے، آنکھیں پھوڑ دیتے، اعضا قلم کر دیتے، جس کو وہ مثلہ کہتے تھے، لیکن جب اسلام آیا تو اس کے نبی رحمت ﷺ نے شدید ترین معاندین کی لاشوں کو بھی دفن کرایا، اور مثلہ کی مخالفت کر دی، چناں چہ الروض الانف معہ السیرۃ النبویہ ۲/۲۸۲ میں ہے:

''حضور ﷺ نے میدان جنگ میں سیدالشہدا حضرت امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نعش مبارک تلاش کی، ڈھونڈتے ڈھونڈتے میدان احد کے قلب میں آپ کا لاشہ اس حال میں ملا کہ آپ کا شکم مطہر پھاڑ دیا گیا تھا، جگر نکال لیا گیا تھا اور بری طرح آپ کا مثلہ کر دیا گیا تھا، ناک ترشی ہوئی تھی اور کان کٹے ہوئے، حضور رحمت للعالمین ﷺ نے یہ عالم دیکھا تو رنج والم میں ڈوب گئے اور فرمایا: اگر صفیہ (سیدالشہدا کی بہن) کے حزن وملال کا خیال نہ ہوتا اور یہ ڈر نہ ہوتا کہ بعد میں لوگ اسی کو دستور بنالیں گے، تو میں ان کے جثے کو یوں ہی چھوڑ دیتا کہ قیامت میں پرندوں کے معدوں اور درندوں کے شکم سے محشور ہوتے۔

اور اگر خدا نے مجھے قریش پر غلبہ دیا تو میں اکیلے حمزہ کے بدلے میں ۳۰/آدمیوں کا مثلہ کروں گا، اور جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے حضور ﷺ کا یہ غیظ وجلال دیکھا،

تو کہنے لگے اگر اللہ نے ہم کو ان پر غلبہ دیا تو ہم ایسا مثلہ کریں گے کہ کبھی نہ ایسا کیا گیا ہوگا۔

اور سرکار نے وہاں کھڑے ہو کر یہ بھی فرمایا: اے چچا مجھے آپ کے جیسی مصیبت کبھی نہیں پہونچائی گئی، اور اس سے زیادہ غصہ دلانے والی صورت حال سے میں کبھی دو چار نہ ہوا تھا، پھر ارشاد ہوا آسمان والے ان کو "اسد اللہ واسد رسولہ" کہتے ہیں، حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالی عنہما کی روایت ہے کہ اسی موقعہ پر یہ آیت اتری:

﴿وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ماعوقبتم به، ولئن صبرتم لهو خير للصابرين واصبر وماصبرك الا بالله ولاتحزن عليهم ولاتك في ضيق مما يمكرون﴾ [الروض الانف معہ السیرۃ النبویہ ۳/۲۸۲]

جتنی تمہیں تکلیف پہونچائی ہے اتنا ہی تم بدلہ لے سکتے ہو، اور صبر کرو تو یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے، آپ صبر کیجیے کہ آپ کا یہ صبر اللہ ہی سے ہے، آپ ان پر غمگین نہ ہوں، اور ان کے مکر سے تنگی میں نہ پڑیں۔

اللہ اکبر! کہاں تو پیغمبر کا وہ غضب وجلال اور کہاں یہ صبر وتحمل اور عفو ودرگزر کہ یہ آیت نازل ہونے کے بعد نہ یہ کہ آپ نے خود انتقام لینے کا ارادہ ترک فرمادیا، بلکہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو مثلہ سے روک دیا۔

قال ابن اسحاق وحدثني حميدالطويل عن الحسن عن سمرة بن جندب قال ماقام رسول الله ﷺ في مقام قط ففارقه حتى يامرنا بالصدقة وينهانا عن المثله. [الروض الانف معہ السیرۃ النبویہ ۳/۲۸۲]

ابن اسحاق نے حمید طویل سے اور وہ حضرت حسن سے اور وہ سمرہ بن جندب سے روایت کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جب بھی وعظ فرمایا صدقہ کا حکم ضرور دیا اور مثلہ سے منع فرمایا۔

یہ ہے میدان جنگ میں دشمنوں کے ساتھ اسلام کا سلوک اور مسلمانوں کا کردار اور یہ ہے مثلہ کی ممانعت اور دشمنوں کی لاشوں کے ساتھ برتاؤ کا اسلامی حکم، لیکن آیئے دیکھیے کہ میدان

کربلا میں خود رسول کریم رؤف ورحیم ﷺ کے جگر گوشوں کے ساتھ اہل کوفہ وشام کا کیا سلوک رہا۔

عبیداللہ ابن زیاد اگر حکومت وقت کے خلاف بلند ہونے والی آواز کو خاموش کرنا چاہتا تھا، تو دنیا دیکھ لے کہ میدان کربلا میں دوپہر ڈھل چکی ہے، اور حق کی آخری آواز بھی خاموش ہے، یزید کے اقتدار کو اگر امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے خطرہ تھا، تو واضح ہو کہ یہ خطرہ ٹل گیا ہے، اور امام عالی مقام کا سرتن سے جدا ہو چکا ہے اور بے سر کا جسم خون میں لت پت پڑا ہوا ہے، عالم یہ ہے کہ۔

وجد بالحسین علیہ السلام حین قتل ثلاث وثلثون طعنة واربع وثلثون ضربة. [طبری ۲۴۶/۶]

آپ کے جسم اطہر پر تیروں کے ۳۳/اور تلواروں کے چونتیس (۳۴) زخم ہیں۔

اسی عالم میں عمر ابن سعد کی آواز گونجتی ہے۔

من ینتدب للحسین ویوطئہ فرسہ؟ [طبری ۲۴۷/۶]

حسین (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کو گھوڑوں سے روندنے کے لیے کون تیار ہوتا ہے۔

یہ سن کر یزید کی فوج کے دس سورما گھوڑا بڑھاتے ہتھیار چمکاتے باہر نکلے امام عالی مقام کی نعش مبارک کے پاس آئے، گھوڑوں کو ایڑ لگائی، اور آہ ثم آہ کہ۔

فداسوا الحسین بخیر لھم حتی رضوا ظھرہ وصدرہ. [طبری ۲۴۷/۶]

پس امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روند ڈالا اور ان کا سینہ ان کی پشت ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالی۔

اور یہ کچلے اور روندے ہوئے بے گور وکفن لاشے سخت دھوپ اور گرد وغبار کے طوفان میں اسی طرح پڑے رہے، یہ اتنا دل گزار منظر تھا کہ اہل بیت نبوت کا لٹا ہوا قافلہ جب اسی راہ سے کوفہ کو لے جایا جا رہا تھا، تو آپ کی بہن حضرت زینب سلام اللہ علیہا سے ضبط نہ ہو سکا اور آپ بے اختیار پکار اٹھیں۔

یامحمداہ یامحمداہ ! صلی علیک ملائکۃ السماء، ھذا حسین بالعراء، مرمل بالدماء، مقطع الاعضاء، یامحمداہ ! بناتک سبایا، وذریتک مقتلۃ تسفی علیھا الصباء. [طبری ج ۶/ ۲۴۸]

یا محمداہ اے بابا جان، آپ پر آسمان کے فرشتوں کا درود ہو یہ آپ کے دل بند امام حسین ویرانے میں خون میں شرابور پڑے ہوئے ہیں، جن کے اعضائے جسم ٹکڑے ٹکڑے کر دیے گیے ہیں، یا رسول اللہ! یہ آپ کی بیٹیاں قیدی بنائی گئی ہیں اور آپ کے خاندان کو کاٹ کر ڈال دیا گیا ہے، جس پر ہوا دھول اڑا رہی ہے۔

اللہ اللہ! جس پیغمبر اعظم ﷺ نے اپنی امت کو دشمنوں کی نعش کے مثلہ کرنے سے روکا تھا، اس کی نافرمان امت نے اسی کے نواسے کی مبارک نعش کو گھوڑے دوڑا کر قیمہ بنا ڈالا، اور دل کی بھڑاس نکالی۔

یہ چند مثالیں ہم نے پیش کیں، تلاش کرنے سے متعدد شہادتیں اور بھی فراہم ہو سکتی ہیں، جس سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ میدان کربلا میں کوفیوں اور شامیوں نے اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیا تھا، کہ یہ لوگ مسلمانوں کے روپ میں ننگ اسلام ہیں اور خلافت یزید کی حمایت میں خلافت اسلامیہ کی دھجیاں اڑا رہے تھے، اور حرمت اسلام کو پارہ پارہ کرنے والے ہیں۔

اور جیسا ہم نے شروع میں عرض کیا تھا، امام عالی مقام اپنی مظلومانہ قربانی سے یہی بات لوگوں کو ذہن نشین کرانا چاہتے تھے کہ فی الوقت شام کی حکومت کے تخت پر جو شخص فروکش ہے، اسے اپنی حکومت کے مقابلہ میں اسلامی حرمت اور دینی تقدس کی کچھ پرواہ نہیں، اس لیے وہ مسلمانوں کا خلیفہ اور اسلام کا محافظ نہیں ہو سکتا۔

اور ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ امام عالی مقام اپنے اس مقصد میں پوری طرح کامیاب رہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ امام سیادت مآب نے مدینہ طیبہ میں جب ان کے سامنے خلافت یزید کا مسئلہ پیش ہوا تو اپنی پوری قوت سے یہ امر لوگوں کے ذہن نشین کرانا چاہا کہ، یزید اس کا اہل

نہیں ہے۔ چنانچہ کامل ابن اثیر میں ہے:

قام مروان فیهم وقال ان امیر المومنین قد اختار لکم فلم یال قد استخلف ابنه یزید بعده، فقام عبدالرحمن بن ابی بکر فقال کذبت والله یامروان وکذب معاویة ماالخیار اردتما لامة محمد، ولکنکم تریدون ان یجعلوا هو قلیة وقام الحسین بن علی وانکر ذلک.[ ]

مروان نے کھڑے ہوکر کہا کہ امیر المومنین نے تمہارے لیے انتخاب میں کوئی کوتاہی نہیں کی ، اور اپنے لڑکے یزید کو انہوں نے جانشین بنایا، یہ سن کر عبدالرحمٰن بن ابوبکر کھڑے ہوگئے اور کہا: اے مروان تو نے بھی غلط کہا اور معاویہ نے بھی غلط کیا، تم لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی امت کے ساتھ بھلائی نہیں کی، تم لوگ تو ہر قلیہ کو رواج دے رہے ہو، امام حسین نے کھڑے ہوکر اسی طرح ردوانکار میں تقریر کی۔

اہل کوفہ کو امام عالی مقام نے جو خط لکھا اس میں تصریح فرمائی:

ماالامام الاالعامل بالکتاب الله والقائم بالقسط والدائن بدین الحق.

[کامل فی التاریخ لابن لاثیر ۳/۱۳۳، دارالکتاب العربی]

امام تو وہی ہے جو اللہ کی کتاب نافذ کرے، عدل وانصاف قائم کرے، اور دین حق کے ساتھ معاملہ کرے۔

اشراف اہل بصرہ کو آپ نے اس سے زیادہ وضاحت میں لکھا ہے۔

وکان الحسین قد کتب الی اهل البصرة نسخة واحدة الی الاشراف، فکتب الی مالک ابن مسمع البکری والاحنف بن قیس والمنذربن الجارود ومسعود بن عمر وقیس بن الهیثم وعمرو بن عبیدالله یدعوهم الی کتاب الله وسنة رسوله، وان السنة قدماتت، والبدعة قد احییت.

[کامل فی التاریخ لابن الاثیر ۳/۱۳۵، دارالفکر العربی]

امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل بصرہ کے اشراف کو ایک ہی مضمون کا خط تحریر

فرمایا، مالک بن مسمع ،احنف بن قیس منذر بن جارود، مسعود بن عمر قیس بن ہشیم ،عمر بن عبید اللہ سب کو کتاب اللہ اور سنت رسول کی دعوت دی اور لکھا کہ سنت ساری جا چکی ہے اور بدعت کو لوگوں نے زندہ کرلیا ہے۔

حر بن یزید ریاحی اور ان کے ساتھیوں کو جب انہوں نے آپ کو چہار جانب سے گھیر رکھا تھا۔

ایک دل ہلا دینے والا خطبہ دیا:

من رأى سلطانًا جائرًا مستحلا لحرم الله ناكثا لعهدالله مخالفا لسنة رسول الله ﷺ يعمل في عباد الله بالاثم والعدوان، فلم يغير عليه بفعل ولاقول، كان حقا على الله ان يدخله مدخله. الا وان هولاء قد الزموا اطاعة الشيطان، وتركوا طاعة الرحمن، واظهروا الفساد وعطلوا الحدود استأثروا بالغنيمة، و احلوا حرام الله وحرموا حلاله. [طبری ج۶/۲۱۵]

جس نے کسی ایسے ظالم بادشاہ کو دیکھا جو اللہ کے حرمات کو حلال قرار دے، جس نے اللہ کا عہد توڑ رکھا ہو، اور رسول اللہ ﷺ کی سنت کی مخالفت کی ہو جو اللہ کے بندوں کے ساتھ ظلم وسرکشی کا معاملہ کرتا ہو، تو جو یہ سب دیکھتے ہوئے بھی طاقت کے باوجود قول یا عمل سے اس کو بدلنے کی کوشش نہ کرے، ضرور اللہ تعالیٰ اس کو اس کے ٹھکانے تک پہونچائے گا، بیشک ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت کی ہے، اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے، فساد پھیلا رہے ہیں حدود الٰہی معطل ہیں، مال غنیمت کو اپنی جائداد بنالیا ہے، اللہ کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دے رکھا ہے۔

الغرض امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہر موقعہ پر اپنی پوری قوت سے یزید کی خلاف شرع حکومت کے خلاف آوازۂ حق بلند کیا، لکھ کر لوگوں کو آگاہ کیا، خطبہ ارشاد فرما کر لوگوں کو جھنجھوڑا۔

اس پورے طوفان بلا میں امام گردوں جناب کی آواز جب تک نکلتی رہی حق وصداقت

کی پکار سے پہاڑوں کو دہلاتے اور صحرا کو ہلاتے رہے، لیکن پوری اسلامی امت میں ان چند نفوس قدسیہ کے علاوہ جو شروع سے ہی آپ کے ساتھ تھے کس نے آپ کی بات سنی؟ کس نے آپ کی آواز پر لبیک کہا؟ اور یزید کی حکومت کے خلاف کس نے نوٹس لیا، کیوں کہ حق و باطل کا التباس ایسا شدید تھا کہ بات وعظ و تذکیر، نصیحت و تنبیہ، اور اعلان و بیان کی حد سے باہر نکل چکی تھی، اور اب امتیاز پیدا کرنے کے لیے قربانی کے گرم لہو کی ضرورت تھی۔

چناں چہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب تک امام عالی مقام کی آواز بلند ہوتی رہی بے حسی اور بے توجہی کا وہ عالم رہا، لیکن جیسے ہی ان کی آواز خاموش ہوئی ان کے خون ناحق کی پکار شروع ہوئی، تو کائنات کا ذرہ ذرہ امام مظلوم کی آواز میں آواز ملانے لگا، اور پورے عالم اسلام میں یزید کی حکومت کے خلاف طوفان اٹھ کھڑے ہوئے، جنگ کے شعلے لپکے، اور شورش کی آندھیوں نے ایوان حکومت کو ہلا کر رکھ دیا، چناں چہ

(۱) اہل مدینہ نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ انصاری کی قیادت میں یزید کی بیعت سے انکار کر دیا اور تمام امویوں کو مدینہ سے نکال دیا، حضرت عبداللہ بن حنظلہ کا بیان ہے۔

"واللہ یزید پر حملہ کی ہم نے اس وقت تیاری کی جب ہم کو یقین ہو گیا کہ اب ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش ہوگی، کیوں کہ فسق و فجور کا یہ عالم تھا کہ لوگ اپنی ماں، بہنوں، بیٹیوں سے نکاح کر رہے تھے، شرابیں پی جا رہی تھیں، اور لوگوں نے نماز ترک کر دی تھی"۔

[تاریخ الخلفاء ص ۳۰۶]

(۲) اہل مکہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی میں یزید کی بیعت توڑ ہی دی تھی، ابن اثیر کے حوالہ سے شاہ معین الدین ندوی لکھتے ہیں:

اہل حجاز نے شروع ہی میں یزید کی خلافت خوش دلی کے ساتھ قبول نہ کی تھی، بعض بزرگوں نے اس کی بیعت بھی نہیں کی تھی، حضرت امام حسین کی شہادت کا اور بڑا اثر پڑا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر عرصہ سے مکہ میں موقعہ کے منتظر تھے، انہوں نے اس واقعہ کو لے کر اہل مکہ کو یزید کی مخالفت پر ابھارا۔ [تاریخ اسلام ج ۲ ص ۵۷]

(۳) کوفہ میں "توابین" نے حضرت سلیمان بن صرور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رہنمائی میں قتل حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد ہی آپ کی مدد نہ کرنے کے جرم کے کفارہ کی تحریک شروع کی، جو زور پکڑ کر قاتلان امام حسین سے انتقام اور جنگ کی صورت میں ظاہر ہوئی، اور پورے عالم اسلام میں اس وقت صورت حال یہ ہوگئی تھی، کہ ۶۴ھ میں یزید کے فوت ہونے کے بعد، حجاز، عراق، مصر، شام کے تمام بڑے بڑے ملک حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہو گئے تھے۔

اور اگر چند امور ایسے وقوع پذیر نہ ہو گئے ہوتے، جنہوں نے بعد کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا، تو اسی وقت سے اسلامی حکومت کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہوتا۔ اور اموی حکومت کی کوئی تاریخ ہی نہ بن پاتی۔

پھر بھی امام مظلوم کے خون ناحق نے لوگوں کے دلوں میں بنو امیہ کے خلاف اتنی تلخی بھر دی تھی کہ اس کے بعد جو تحریک بھی اٹھی غلط ہو یا صحیح سب نے شہادت امام عالی مقام کا سہارا لیا، پس امام گردوں جناب کی کتنی بڑی کامیابی ہے کہ انہوں نے ۷۲ر آدمیوں کی قربانی دے کر ایک عظیم اور مطلق العنان حکومت کی چولیں ہلا دیں، ظلم وجور کے طوفان کا دھارا موڑ دیا، اور آئندہ قیامت تک حق پرستوں کے اخلاص ووفا کی شمع جلا دی، حریت وجانثاری کی شاہراہ قائم کی اور حق گوئی وحق پناہی کی ریت ڈالی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن ☆ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

حنفی اولیائے کرام

حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات سے ایک واقعہ ان کی سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے۔

مشائخ میں سے ایک بزرگ کا بیان ہے کہ میں نے مدتوں اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کی، بار الہا! میں رجال الغیب میں سے کسی آدمی کی زیارت سے مشرف ہو جاؤں ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں حضرت احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مزار پاک کی زیارت کر رہا ہوں اور وہیں ایک دوسرا آدمی بھی موجود ہے فوراً میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ آدمی رجال الغیب سے ہے، جیسے ہی خواب سے بیدار ہوا اس خیال سے کہ بیداری میں بھی اس کی زیارت سے مشرف ہوں احمد بن حنبل کے مزار پر انوار پر پہنچا، واقعی وہی آدمی موجود تھا جسے میں نے ابھی ابھی خواب میں دیکھا تھا۔ مزار پر پہونچ کر میں فاتحہ پڑھنے لگا، اتنے میں کہ میں فاتحہ خیر سے فراغت پاؤں وہ آدمی احاطہ مزار سے باہر نکل گیا، میں نے بھی جلدی کی اور اسی کے پیچھے پیچھے لپکا۔ چلتے چلتے جب وہ دجلہ کے قریب آئے تو اس کا دونوں پاٹ اتنا سمٹ گیا کہ بآسانی ایک قدم میں پار کیا جا سکے، میں نے سوچا یہ ہاتھ سے جا رہے ہیں اس لیے انہیں قسم دے کر روکا اور ان کا مذہب پوچھا، منھ میری طرف کر کے انہوں نے جواب دیا: حنیفا مسلما وما انا من المشرکین. میں نے سوچا کہ حنفی المذہب ہیں واپسی میں خیال ہوا کہ غوث پاک سے بھی تصدیق کر لینی چاہیے، ابھی میں دولت سرائے دروازے پر ہی تھا کہ آپ نے اندر سے پکار کر کہا کہ آج روئے زمین پر سوائے اس کے اور کوئی ولی اللہ حنفی المذہب نہیں ہے۔

اس واقعہ سے وقت کے آزاد کم نصیبوں کو مقدس ترین مذہب حنفی پر کیچڑ اچھالنے کا شاخسانہ ہاتھ آ گیا کہ اس مذہب میں کوئی ولی ہوا ہی نہیں جو اس کے بطلان پر صریح دلیل ہے، حالاں کہ خود اسی واقعہ میں ایک ایسے ولی کی تقدیس کی شہادت غوث پاک دیتے ہیں۔ جو حنفی

المذہب ہیں۔اور بیک گام دجلہ کو پار کر سکتے ہیں۔خیال ہوا کہ منکرین کے علی الرغم تذکرہائے مشائخ واولیا چند ایسی برگزیدہ ہستیوں کے حالات ذکر کردیئے جائیں جو مذہب حنفی کے پیرو تھے۔

ابراہیم بن ادہم: ابراہیم بن ادہم بن سلیمان بن منصور بلخی، آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، ایک مرتبہ شکار کے لیے کسی جنگل میں گئے ہوئے تھے کہ ایک آواز سنی: ابراہیم اس کام کے لیے تمھیں نہیں پیدا کیا گیا ہے، یہ سننا تھا کہ خود شکار ہو گئے، توبہ کیا اور مکہ پہنچے، وہاں سفیان ثوری اور فضیل بن عیاض اور ابو یوسف غسولی کی صحبت میں رہتے تھے، شام میں آئے وہیں دشت بانی کرتے تھے اور کسب حلال سے روزی حاصل کرتے ولایت وکرامت میں شہرہ آفاق ہیں۔۱۶۲۔۱۶۰ھ میں وصال ہوا، ان کے شدت ورع کا یہ عالم تھا کہ سوائے شے حلال کے اور کچھ نہ کھائیں گے، جب شبہ سے بھی پاک کوئی چیز نہ ملتی تو جان بچانے کے لیے دو چار لقمے کھالیتے۔

آپ نے باغ کی نگہ بانی اور کھیتوں کی رکھوالی کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا (نفحات الانس مترجم ص ۱۹۰) ایک دفعہ ایک سپاہی نے آکر کچھ پھل آپ سے مانگے تو آپ نے فرمایا: میں مالک کے مال میں خیانت نہیں کر سکتا، اس نے کوڑے سے آپ کے سر پر مارنا شروع کر دیا، آپ نے اپنا سر جھکا لیا اور فرمایا: ہاں ہاں اس کو سزا دو بہت دنوں سے اپنے رب کی نافرمانی کر رہا ہے، پولس آپ کو پہچان گیا تو معذرت کرنے لگا، آپ نے فرمایا بھئی وہ سر جسے معافی کی خواہش ہوتی تھی اسے تو میں بلخ ہی میں چھوڑ آیا۔

ایک دفعہ آپ کچھ لوگوں کے ساتھ سفر کر رہے تھے کہ ایک آدمی نے کہا: حضرت آگے راستہ روکے ایک شیر کھڑا ہوا ہے۔آپ اس کے پاس گئے اور فرمایا میاں ابوالحرث اگر تمھیں ہمارے بارے میں کوئی حکم دیا گیا ہو تو اپنا کام کرو ورنہ ہمارا راستہ چھوڑ دو۔یہ سننا تھا کہ وہ گاؤ گاؤ کرتا ہوا واپس ہو گیا۔ [جامع کرامات اولیا مترجم۔ص ۲۷، مکتبہ جام نور دہلی]

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جبریل کو خواب میں دیکھا کہ ایک کاغذ لیے کچھ

لکھ رہے ہیں، میں نے پوچھا کیا لکھ رہے ہو، کہا خدا کے دوستوں کی فہرست لکھ رہا ہوں، تو میں نے کہا اس کے نیچے لکھ دو کہ خدا کے دوستوں کا چاہنے والا ابراہیم ادہم، پس آواز آئی کہ اے جبریل ان کا نام سب سے پہلے لکھ لو۔ [تذکرۃ الاولیا مترجم ص ۹۷، مکتبہ جام نور]

شفیق بن ابراہیم بلخی:

آپ کی کنیت ابوعلی ہے اور آپ طبقہ اولیٰ کے صوفیائے کرام میں سے ہیں، امام اعظم کے شاگرد امام زفر کے آگے زانوئے ادب تہ کیا، قاضی ابو یوسف صاحب اور ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کتاب الصلوۃ پڑھی اور خود حاتم اصم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے استاد ہیں، ابراہیم بن ادہم کے بھی ساتھ رہے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے ابراہیم بن ادہم سے پوچھا: معاش کے بارے میں آپ کا معمول کیا ہے؟ جواب دیا جب کھانے کو مل جاتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور نہیں ملتا ہے تو صبر۔ حضرت شفیق بلخی نے تعریض کی، اتنا تو خراسان کے کتے بھی کرلیا کرتے ہیں۔ ابراہیم بن ادہم نے کہا: پھر آپ کا کیا طریقہ ہے؟ فرمایا: جب نہیں پاتے ہیں تو شکر کرتے ہیں اور پاتے ہیں تو دوسروں کو دے کر ایثار کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کا یہ حال ہوا کہ بڑھ کر حضرت شفیق کا ہاتھ پاؤں چومنے لگے اور کہا استاد آپ ہی ہیں، خود حضرت شفیق اپنے دلچسپ مکالمے کا ماحصل بیان کرتے ہیں جو قاضی ابو یوسف علیہ الرحمہ کے ساتھ پیش آیا تھا۔ فرماتے ہیں امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں قاضی ابو یوسف سے بہت دنوں سابقہ رہ چکا تھا کچھ دنوں کے لیے میں بغداد سے دور چلا گیا۔ واپس لوٹا تو دیکھا کہ ابو یوسف قاضی القضاۃ ہیں اور آدمیوں کی بھیڑ ان کے ارد گرد لگی ہوئی ہے، میں بھی جا کر کھڑا ہو گیا تو ابو یوسف بولے: یا شیخ فقیروں کا سا لباس آخر یہ کیا ہیئت بنا رکھی ہے۔ میں نے جواب دیا، بھائی تم جو چاہتے تھے وہ تمہیں مل گیا لیکن مجھے جس کی تلاش تھی وہ اب تک مجھے نہ مل سکا۔ اسی لیے یہ سوگواری اور ماتم زدگی ہے۔ یہ سننا تھا کہ ابو یوسف زار و قطار

رونے لگے۔آپ ہی کا یہ مقولہ ہے میں کردہ گناہوں سے اتنا خائف نہیں ہوں جتنا ناکردہ گناہوں سے ڈرتا ہوں۔[نفحات الانس مترجم ص ۲۰۱]

آپ ۱۷۴ھ میں ختلان کے اندر شہید ہوئے۔آپ سے امام اعظم علیہ الرحمہ کی شان میں یہ الفاظ مروی ہیں:

امام ابوحنیفہ اپنے زمانہ میں تمام لوگوں سے پرہیزگار، سب سے بڑے عالم، سب سے بڑے عابد، سب سے بزرگ اور دین میں سب سے محتاط اور اپنی رائے سے دور تھے، کسی مسئلہ کا فیصلہ نہیں فرماتے یہاں تک کہ آپ کے تمام اصحاب جمع ہو جائیں اور مسئلہ پر سب کا اتفاق ہو جاتا تب ابو یوسف وغیرہ سے کہتے اس کو فلاں باب میں رکھو۔

معروف کرخی: آپ کا نام معروف اور کنیت ابومحفوظ ہے۔آپ میں بچپن سے ہی اسلام کی تڑپ موجود تھی، آپ کے والدین نصرانی تھے، لیکن آپ مسلمان بچوں کے ساتھ نماز پڑھتے اور ماں باپ کو اسلام کی ترغیب دیتے رہتے، آپ کے والدین یہ سوچ کر کہ کہیں لڑکا اسلام قبول نہ کرلے ایک عیسائی معلم کے پاس بٹھا دیا، اس نے پہلا ہی سوال کیا۔بچے بتاؤ تم لوگ گھر میں کتنے آدمی ہو۔میں، میرے ابا اور میری والدہ کل تین آدمی ہیں۔اچھا تو تم کہو کہ ثالث ثلاثۃ عیسیٰ تین خداؤں میں کا تیسرا ہے۔آپ فرماتے ہیں کہ عالم کفریت میں بھی میری غیرت نے یہ گوارا نہ کیا کہ ایک کے سوا دوسرے کو پکاروں، میں نے انکار کیا تو معلم نے مارنا شروع کیا، وہ جس شدت سے مارتا میں اسی جرأت سے انکار کرتا، آخر عاجز ہو کر اس نے میرے والدین سے کہا کہ اس کو قید کردو۔تین دن میں وہاں رہا۔ہر دن ایک روٹی ملتی مگر میں کھاتا نہیں، جب مجھے وہاں سے نکالا تو میں بھاگ گیا، چوں کہ میں والدین کا اکیلا ہی لڑکا تھا میری جدائی سے انہیں سخت قلق ہوا اور کہنے لگے وہ ہمارے یہاں لوٹ تو آئے جس مذہب کو چاہے اختیار کرے بلکہ ہم بھی اس کے ساتھ اپنا دین تبدیل کردیں گے، چنانچہ کچھ دنوں کے بعد میں لوٹا اور الحمدللہ کہ میرے والدین بھی مسلمان ہوگئے۔[نفحات الانس مترجم ص ۱۸۶۔تذکرۃ الاولیا، ص ۱۷۴]

آپ اذان اس شان سے پڑھتے کہ جب اشہد ان لا الہ الا اللہ کہتے تو شدت خوف

سے رونگٹے اور داڑھی کے بال کھڑے ہو جاتے اور اتنا بے قرار ہو جاتے کہ معلوم ہوتا اب زمین پر گرے، تب گرے بار ہا رات بھر آپ کی مسجد سے گریہ و بکا کی آواز آتی، آپ دعا و استغفار کرتے رہتے، حضرت سری سقطی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں: کہ مجھے جو کچھ ملا حضرت معروف کے طفیل میں ملا۔

عبدالوہاب کا قول ہے کہ حضرت معروف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بڑا تارک الدنیا میں نے نہ دیکھا، آپ کے تصرف کا یہ عالم تھا کہ بارہا آپ نے دریا کو صرف ایک قدم میں پار کیا، زندگی میں آپ مستجاب الدعوات تھے۔ اور وصال کے بعد بھی یہ عالم ہے کہ ان کی قبر قضائے حاجات کے لیے تریاق مانی جاتی ہے۔ آپ کا وصال ۲۰۰ھ میں ہوا۔ ایک دفعہ آپ نے دجلہ کے کنارے قرآن شریف اور کپڑا وغیرہ رکھ کر غسل کرنا شروع کیا، ایک عورت آئی کپڑے لے کر بھاگی، حضرت معروف نے اس کا پیچھا کیا اور ایک جگہ روک کر کہا کوئی حرج نہیں میں تمہارا بھائی معروف کرخی ہوں۔ کیا تمہارا کوئی لڑکا، بھائی، شوہر ہے جو قرآن پڑھے۔ کہا نہیں۔ تو تم قرآن شریف مجھے دے دو اور کپڑے لے لو۔ میں نے دنیا اور آخرت میں ہر جگہ تمہیں معاف کیا۔ یہ سن کر عورت کو اتنی شرم آئی کہ اس نے توبہ کی اور آپ کی برکت سے اولیا میں سے ہو گئی۔

[تذکرۃ الاولیا مترجم، ص ۱۷۴]

بایزید بسطامی: آپ کا نام طیفور بن عیسیٰ بن آدم بن سروشان ہے، آپ نے شیخ خضرانہ، یحییٰ بن معاذ رازی وغیرہ کی صحبت پائی اور حضرت شقیق بلخی سے بھی ملاقات رہی ہے، آپ مشائخ کے استاد اور مقتدا ہیں۔

آپ کا وصال ۲۶۱ھ میں ہوا۔ فقہ حنفی میں آپ کا درجہ بہت بلند ہے، لیکن ولایت میں آپ کا مرتبہ اس سے بھی اونچا ہے، سوانح نگاروں کا بیان ہے کہ آپ پر ولایت کا وہ دروازہ کھل گیا کہ اس کی شہرت میں فقہ دانی دب گئی، اپنے استاد کا ادب اتنا ملحوظ تھا کہ وصال کے وقت وصیت کی کہ میری قبر میرے استاد کی قبر کے پائیں اور ان کی مزار سے پست ہو۔ جب آپ نماز پڑھتے تو شدت خشیت کی وجہ سے آپ کے سینے سے گھر گھراہٹ کی آواز صاف سنائی دیتی۔ [نفحات الانس مترجم ص ۲۱۲]

آپ کی وسعت علم اور بڑھے ہوئے زہد وتقدس سے متاثر ہو کر دیر معان کے پانچ سو راہبوں نے اپنی زناریں توڑ دیں اور کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے۔ وصال کے بعد آپ کو کسی نے خواب میں دیکھا عرض کی: آپ کے ساتھ کیا پیش آیا۔ فرمایا: مجھ سے پوچھا گیا اے بڈھے کیا لائے ہو، میں نے عرض کی: آہ بادشاہوں کے دربار میں ایک فقیر بے نوا آیا ہے، اس سے یہ نہیں پوچھا جاتا ہے کہ کیا چاہتے ہو یہ سوال ہوتا ہے کہ کیا لائے؟ [نفحات الانس مترجم ص: ۲۱۳]

یحیٰ بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں نے حضرت ابو یزید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ایک رات نماز عشا سے لے کر نماز فجر تک دیکھا کہ سر جھکا کے کھڑے ہیں، صبح ہوتے ہوتے ایک طویل سجدہ کیا اور کہنے لگے یا خدا تجھ سے فلاں ولی نے فلاں چیز اور فلاں ولی نے فلاں کرامت مانگی۔ اسی طرح انہوں نے بیس سے زائد اولیا کا نام شمار کرایا، اور اخیر میں کہا کہ میں ان سب چیزوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں اور میں تجھ سے تجھی کو مانگتا ہوں۔

آپ چھوٹے تھے، اس وقت قرآن شریف پڑھ رہے تھے جب ﴿یاایھاالمزمل قم اللیل الا قلیلا﴾ پڑھا تو باپ سے دریافت کیا، یہ خدا کس سے کہہ رہا ہے کہ آپ تقریباً رات بھر نماز پڑھا کریں، انہوں نے جواب دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے۔ پھر جو کام رسول اللہ نے کیا آپ کیوں نہیں کرتے۔ والد نے کہا اصل میں یہ حکم صرف خدا کے رسول کے لیے ہے۔ سب کے لیے نہیں، اس وقت حضرت بایزید چپ ہو گئے، لیکن جب اس سورت میں یہ آیت پڑھی ﴿وطائفة من﴾ الذین تو باپ سے پوچھا آپ تو کہہ رہے تھے کہ یہ صرف حضور کی خصوصیت ہے اور اس میں یہ ہے کہ صحابہ بھی تہجد پڑھتے تھے۔ ہاں فرزند یہ صحیح ہے۔ تب آپ وہ کام کیوں نہیں کرتے جو رسول اللہ اور صحابہ کرام نے کیا، اس عظیم الشان ہدایت کے بعد باپ کے لیے بھلا چارہ کار کیا رہ گیا تھا۔ ساری ساری رات تہجد پڑھنے لگے۔

ایک روز حضرت بایزید بیدار ہوئے تو دیکھا کہ باپ تہجد پڑھ رہے ہیں۔ عرض کی: مجھے بھی سکھا دیجیے میں بھی پڑھوں گا۔ باپ نے کہا صاحبزادے ابھی تم چھوٹے ہو سو جاؤ۔ اچھا تو اگر قیامت کے دن میرے معبود نے مجھ سے سوال کیا کہ تو نے کیا کیا تو کہہ دوں گا، میں نے والد

سے تو کہا تھا کہ مجھے بھی نماز سکھا دیجیے میں بھی پڑھوں گا۔ مگر انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ تم ابھی چھوٹے ہو، اب اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ کہنے لگے نہیں نہیں تم یہ نہ کہنا، میں تمہیں سکھائے دیتا ہوں اور پھر حضرت بایزید بھی رات رات بھر نماز پڑھا کرتے۔

ایک دفعہ آپ سے کسی نے پوچھا، راہ خدا میں سب سے بڑی مشقت کونسی آپ نے اٹھائی، فرمایا: یہ نہیں بتا سکتا۔ پھر یہی بتائے سب سے چھوٹی مشقت کونسی تھی جو راہ خدا میں آپ نے اٹھائی۔ فرمایا: میں نے نفس کو طاعت الٰہی کی طرف بلایا اس نے انکار کیا۔ تو سال بھر تک اسے پانی نہیں پینے دیا، آپ فرماتے تھے: لوگ حساب سے ڈرتے ہیں، میں چاہتا ہوں کہ مجھ سے حساب لیا جائے، پوچھا گیا کیوں؟ تو فرمایا: شاید حساب کتاب کے دوران میں مجھ سے میرا رب یہ کہہ کر پکارے یا عبدی، اور میں لبیک کہوں پس اس کلام کی لذت میرے نزدیک ساری کائنات سے افضل ہے، پھر وہ میرے ساتھ جو چاہے کرے۔

فضیل ابن عیاض: ابوعلی فضیل ابن عیاض بن مسعود بشر تمیمی خراسانی زاہد مشہور ہیں آپ پیشہ ور ڈاکو تھے۔ ابورد سے لے کر سرخس تک آپ ڈاکہ ڈالا کرتے تھے۔ آپ ایک لڑکی پر عاشق ہو گئے ایک دفعہ اس تک پہنچنے کے لیے اسی کی دیوار پر چڑھے ہوئے تھے کہ کسی کی تلاوت کرنے کی آواز ان کے کان میں ٹکرائی، ﴿الم یان الذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر اللہ﴾ کیا مومنوں کے لیے وہ وقت قریب نہیں آیا کہ ان کا دل ذکر الٰہی کے لیے پگھلے۔ دیوار سے اتر پڑے اور کہا ہاں یہ دن آپہنچا ہے واپس ہوئے تو رات کے وقت ایک ویرانے میں پہنچے، وہاں ایک قافلہ اترا ہوا تھا کچھ لوگ مصر تھے کہ اسی وقت سفر کیا جائے، کچھ کہتے تھے: کہیں فضیل راستہ ہی میں لوٹ نہ لے۔ آپ نے اپنے دل میں سوچا کہ میں راستہ کا چور اور مسلمان مجھ سے ڈریں، یا اللہ میں توبہ کرتا ہوں اور میں نے عہد کر لیا کہ بقیہ زندگی مکہ مکرمہ میں گزاروں گا۔

[تہذیب التھذیب ۶/۲۲۱، دار الفکر]

آپ نے فقہ حضرت امام اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے سیکھا اور ان سے امام شافعی نے روایت کی، ائمہ حدیث میں امام مسلم اور بخاری کے بھی آپ استاد ہیں، آپ کو تفرد اور گوشہ نشینی

بہت پسند تھی، آپ مسجد میں تھے کہ ایک آدمی آیا اور کہا کہ آپ سے انسیت حاصل کر سکتا ہوں، آپ کے پاس بیٹھنا چاہتا ہوں، آپ نے فرمایا: اس سے بڑی وحشت کیا ہوگی یا تو تم چلے جاؤ، پھر میں ہی یہاں سے اٹھ جاؤں۔ ایک دفعہ آپ منی کے کسی پہاڑ پر تھے آپ نے فرمایا خدا کے کچھ ایسے ولی ہیں کہ اگر وہ اس پہاڑ کو کہہ دیں کہ حرکت کر تو وہ ہلنے لگیں، ابھی آپ کہہ ہی رہے تھے کہ پہاڑ ہلنے لگا تو آپ نے فرمایا: ارے میں نے تجھے نہیں کہا تھا میں نے تو مثال دی تھی، تب پہاڑ ساکن ہوا۔ آپ کے شدت مجاہدہ کے بارے میں ابراہیم بن اشعث کی روایت ہے کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ ایک رات سورہ محمد پڑھ رہے تھے اور اس آیت کو بار بار دھرا رہے تھے۔ ''ہم تمہیں آزمائیں'' آنسو بہتا جاتا تھا اور آپ فرماتے تھے، معبود اگر تو نے آزمایا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔

آپ کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ آپ نے ہارون الرشید جیسے باعظمت شہنشاہ کا ہاتھ پکڑ کر یہ کہہ دیا کہ ہارون تیرا ہاتھ کتنا نرم ہے، کاش تو اسے کل جہنم کی آگ سے بچا سکتا۔ اور یہ تیرا چہرہ کتنا دلکش ہے کاش تو اسے دوزخ کے بھڑک سے محفوظ رکھ سکتا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک نے آپ کے بارے میں کہا: آج روئے زمین پر فضیل سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ حضرت شریک کی رائے ہے کہ ہر قوم کی ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی حجت ہوتی ہے اور فضیل ابن عیاض اپنے زمانہ والوں کے لیے حجت و رہبر تھے۔ آپ توبہ کے بعد زندگی بھر بیت اللہ شریف میں مقیم رہے۔ مجاہدہ میں یکتا۔ مستقل پرہیزگار۔ خشیت الٰہی سے لرزاں و ترساں اور ہمیشہ چشم پرنم رہتے تھے۔ تنہائی اور لوگوں سے علیحدہ رہنا آپ کا شعار تھا۔ آپ نے اپنی بقیہ زندگی میں اسباب دنیوی کی طرف توجہ نہ کی۔ امام اعظم کے بارے میں آپ سے یہ کلمات منقول ہیں۔

امام اعظم مشہور فقیہ اور مانے ہوئے پرہیزگار اور صابر، طالب علموں کے ساتھ بغایت مہربان اور خاموش طبع تھے۔ آپ ۱۸۷ھ میں واصل بحق ہوئے۔

داؤد طائی: آپ کی کنیت ابوسلیمان، نام داؤد بن نصیر طائی ہے، آپ ان دس مقتدر علما میں سے تھے جنہوں نے امام کے مذہب کو مدون کیا۔ آپ نے شریعت و طریقت دونوں امام

اعظم علیہ الرحمہ سے سیکھا۔اور حبیب راعی سے بھی مرید تھے،آپ شاگرد و مرید حضرت معروف کرخی علیہ الرحمہ سے بھی تھے،فضیل بن عیاض،ابراہیم ادہم وغیرہ کے معاصرین سے ہیں،جملہ علوم وفنون میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔اور فقہ میں تو فقیہ الفقہا تھے،تصوف کی طرف توجہ کی تو اپنے وقت کے مشائخ وسادات اہل اللہ میں بے مثل و بے نظیر تھے۔حضرت معروف کرخی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسا آدمی نہیں دیکھا جو حضرت داؤد طائی سے زیادہ تو کیا برابر بھی دنیا کو بے حقیقت وحقیر سمجھتا،ساری دنیا ان کی نظر میں ہر کاہ سے بھی بے مقدار تھی۔ آپ کو اپنے باپ سے میراث میں کل بیس اشرفیاں ملی تھیں،انہیں کو بیس سال میں صرف کر کے ختم کیا،اور اسی کے ساتھ متاع حیات بھی صرف کر دی،ساری زندگی نہ تو کسی بادشاہ کا کوئی تحفہ قبول کیا نہ دوستوں کا کوئی ہدیہ۔عطا بن مسلم کا بیان ہے کہ ہم نے بار ہا دیکھا اور وثوق سے کہتے ہیں کہ زندگی بھر حضرت داؤد طائی کے گھر کی کل کائنات یہی رہی۔ایک چٹائی ایک اینٹ جس پر سوتے،ایک پیکٹ جس میں روٹی رکھتے،ایک لوٹا جس سے پانی پیتے اور وضو وغیرہ کرتے۔

[تہذیب التھذیب ۲۴/۳ دار الفکر]

محارب بن آثار نے کہا کہ اگر داؤد طائی گذشتہ امتوں میں ہوتے تو اللہ تبارک وتعالیٰ ان کے تقدس و پارسائی کے قصے ہم پر بیان کرتا۔

گوشہ نشینی،زہد و پرہیزگاری،تقویٰ و تواضع آپ کے خاص اوصاف تھے۔باختلاف روایت ۱۶۰ھ یا ۱۶۵ھ میں آپ کا وصال ہوا۔امام صاحب کی مدح آپ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے۔امام ہدایت کا ستارہ ہیں جس سے چلنے والے راہ پاتے ہیں،اور ان کا علم ایسا ہے کہ اولیا کا قلب جسے گوارہ کرتا ہے،اور خود امام نے ان کے بارے میں پیشن گوئی فرمائی تھی کہ تم عبادت وریاضت کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔

ابو الحامد لفاف: احمد بن خضرویہ بلخی۔آپ متقدمین صوفیا کبار میں سے ہیں،صاحب نفحات الانس نے آپ کو طبقہ اول میں شمار کرایا ہے،خراسان کے مشہور مقام بلخ میں رہتے تھے اور وہیں پر آسودہ خاک بھی ہوئے،آپ کی تربت پاک مدتوں زیارت گاہ خلائق بنی رہی،

لوگ فیض و برکت کے لیے حاضری دیتے تھے۔ ابو تراب بخشی اور حاتم اصم کے ہم صحبت تھے، ابراہیم ادہم کی زیارت بھی کی تھی، چناں چہ ان سے مقولہ نقل کرتے ہیں: ابراہیم ادہم نے کہا پاک دل سے خدا کی طرف رجوع کرنے کا نام توبہ ہے، آپ بایزید بسطامی اور ابو حفص حضرات کے ہم عصروں میں سے تھے، ابو حفص حداد سے سفر حج میں ملاقات کی تھی، اور بایزید بسطامی سے خود بسطام جا کر کسی نے ابو حفص حداد سے پوچھا کہ گروہ صوفیہ میں سے کس کو آپ نے بہت زیادہ بزرگ دیکھا تو فرمانے لگے، ہمت وصدق احوال میں احمد بن خضرویہ سے بزرگ میں نے کسی کو نہ دیکھا، کسی نے آپ سے وصیت طلب کی تو فرمایا: اپنے نفس کو اتنا مار ڈالو کہ تم خود زندہ ہو جاؤ۔ [مراۃ الاسرار، ص: ۲۹۷۔ نفحات الانس مترجم ص ۲۱۰ ملخصا]

ایک دفعہ آپ جمعہ پڑھنے کے ارادے سے نکلے تو معلوم ہوا کہ آپ کا گدھا کھو گیا ہے، بیوی نے کہا پن چکی میں آٹا دے آئے تھے پس گیا ہوگا، اگر نہ لائے تو کھانا نہ پکے گا، اور خود ان کو خیال ہوا کہ آج ہی باری ہے کھیت میں پانی دینے کی۔ اگر سستی کی تو کھیت ویسا ہی پڑا رہ جائے گا، کیوں کہ میری باری کے بعد کوئی سینچنے نہ دے گا، پھر آپ نے سوچا یہ ساری چیزیں عبادت الٰہی سے بڑھ کر نہیں ہو سکتیں آپ نماز جمعہ پڑھنے چلے گئے۔ واپس لوٹے تو گدھا اپنی جگہ بندھا پڑا تھا، بیوی روٹی پکا رہی تھی اور یہ خبر ملی کہ کھیت بھی سینچ گیا، بیوی نے قصہ بتایا کہ آپ کے جانے کے بعد میں نے سنا کہ کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے، گئی دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ہمارا گدھا ہے، لیکن اس کے پیچھے ایک شیر آ رہا ہے میں نے گدھے کو اندر کر کے جھٹ دروازہ بند کر دیا اور شیر لوٹ گیا اور ہمارے کھیت سے ملا ہوا جو کھیت ہے رات اس نے اپنے کھیت میں پانی دینے کے لیے نہر کاٹی اور سو گیا پانی نے ہمارے کھیت میں راستہ بنالیا اور ہمارا کھیت لبریز ہو گیا تو وہ جاگا اور پڑوسن کا شوہر اپنا آٹا لینے گیا ہوا تھا اور بھول سے ہمارا اٹھا لایا یہاں آ کر پتہ چلا تو دے گیا، آپ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور فرمایا: میں نے تیرے ایک کام کو کیا میرے معبود! اور تو نے اتنے سارے کام کرا دیئے۔

حضرت محمد بن حامد کہتے ہیں کہ احمد بن خضرویہ کے وصال کے وقت میں ان کے پاس

بیٹھا ہوا تھا، اس وقت رونے لگے اور فرمایا: صاحب زادے جس دروازے کو ۹۵ سال سے کھٹکھٹا رہا تھا وہ آج کھولا جا رہا ہے، کیا معلوم نیک بختی کے ساتھ کھلے یا بد بختی کے ساتھ، اصل سوال وجواب کا وقت تو اب آیا ہے، تمہارے سوال وجواب کی کہاں فرصت ہے، اسی وقت آپ کے قرض خواہ بھی آگئے جن کی سات سو اشرفیاں آپ پر باقی تھیں۔ آپ نے ان کی طرف دیکھا اور بولے، ابھی تو نے کہا میں دعا سنتا ہوں میں تجھے پکارتا ہوں، میرے خدا میرے قرض داروں کا قرض چکا دے اور وہ مجھ سے راضی ہوں، تو ہر شے پر قادر ہے، ابھی آپ کے الفاظ فضا میں گونج ہی رہے تھے کہ کسی نے آپ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور کہا: ابی حامد کے قرض خواہ کہاں ہیں ادھر آئیں، آپ شاید اسی کے انتظار میں تھے، ادھر قرض ادا ہوا ادھر آپ نے آنکھیں بند کر لیں۔

[جامع کرامات الیا، ص:۲۶۳]

حضرت بایزید کی شان میں آپ سے یہ جملہ مروی ہے:

میں نے ایک رات اپنے رب کو خواب میں دیکھا، اس نے مجھ سے کہا سب ہی تو کچھ نہ کچھ مجھ سے مانگتے ہیں، لیکن بایزید صرف مجھ سے مجھی کو مانگتے ہیں، آپ کا سنہ وفات ۱۴۰ھ ہے

خلف ابن ایوب: آپ کی کنیت ابوسعید ہے، آپ بلخ کے رہنے والے تھے، امام محمد اور امام زفر کے صحبت یافتہ ہیں، ابن ابی لیلیٰ اور قاضی امام ابو یوسف حنفی علیہ الرحمہ سے فقہ سیکھا، تصوف میں ابراہیم بن ادہم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرید ہیں، اور بہت زمانہ تک ان کی خدمت میں رہے، آپ اہل بلخ کے فقیہ اور ان کے زاہد کہے جاتے تھے، آپ کی سچائی صدق وصلاح اور زہد مشہور عالم تھا، حنفی المذہب تھے۔ حضرت ضمیری کہتے ہیں: اگر خلف کا علم جمع کیا جاتا تو امام رازی کے علم کے برابر ہوتا، لیکن خلف میں یہ برتری تھی کہ ان کے علم پر ان کا زہد وتقویٰ غالب آ گیا۔ حضرت حجۃ الاسلام امام محمد غزالی علیہ الرحمہ نے آپ کی ایک نماز کا ذکر اپنی کتاب مکاشفۃ القلوب اردو ص:۸۳ پر کیا ہے جس سے آپ کے عرفان واستغراق کا اندازہ ہوتا ہے، فرماتے ہیں: کہ خلف بن ایوب نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کو بھڑ نے کاٹ لیا اور اس زور سے ڈنک مارا کہ خون بہنے لگا اور انہیں نماز میں اتنا استغراق تھا کہ معلوم ہی نہ ہوا کہ کیا ہوا۔ اتنے

میں ابن سعید نکلے اور انہوں نے بتایا تو کپڑا دھو ڈالا۔ کسی نے ان سے کہا آپ اس طرح نماز پڑھتے ہیں کہ بھڑ ڈنک مارے اور خون نکل آئے پھر آپ کو پتہ نہ چلے۔ کہنے لگے اس شخص کو اتنی سی بات کا پتہ چلے گا در آں حالے کہ وہ مالک جبار کے سامنے کھڑا ہے اور ملک الموت اس کے پشت پر ہیں اور جہنم اس کے بائیں طرف اور پل صراط قدم کے نیچے۔ آپ کی وفات صحیح قول کی بنا پر رمضان ۲۱۵ھ میں ہوئی۔ امام اعظم علیہ الرحمہ کی شان میں آپ سے یہ کلمے مروی ہیں۔ علم رسول اللہ ﷺ سے صحابہ کے سینوں میں آیا۔ اور ان لوگوں سے تابعین کو ملا۔ پھر ابو حنیفہ کے پاس آ گیا۔ چاہے اس سے کوئی راضی ہو یا غضب ناک۔

عبداللہ ابن مبارک : عبداللہ بن مبارک بن واضح الحنظلی، آپ باپ کے اعتبار سے ترکی اور ماں کے اعتبار سے خوارزمی تھے، موالاۃ کا سلسلہ قبیلہ بنو تمیم سے تھا، احادیث آپ نے بہت سارے بزرگوں سے حاصل کیں جن کی تعداد ایک ہزار تک پہونچتی ہے جن میں امام اوزاعی اور امام سفیان ثوری جیسے اجلہ علما شامل ہیں۔ اور آپ کے شاگردوں کا سلسلہ بھی کافی دراز ہے جن میں صاحب مذہب امام احمد بن حنبل اور فضیل ابن عیاض جیسے جلیل القدر علما و اولیا شامل ہیں۔

آپ ہمارے امام اعظم علیہ الرحمہ کے خاص طالب علموں میں سے تھے۔ اور فقہ آپ نے خاص طور سے سیکھی تھی، آپ بیک وقت محدث، فقیہ، ادیب، نحوی، صرفی، لغوی، شاعر، زاہد، پارسا، شجاع، مجاہد، ساری خوبیوں کے جامع تھے۔ آپ کے مخطوطات احادیث کی تعداد بیس ہزار تک پہونچتی ہے ۱۱۸ھ میں آپ کی ولادت ہوئی اور ترسٹھ سال کی عمر میں ۱۸۱ھ میں وصال ہوا، آپ کا شمار اسلام کے جلیل القدر اماموں میں ہوتا ہے، ولایت میں اپنے وقت کے ابدال قرار دیئے گئے ہیں۔ اور آپ کی بے شمار کرامتیں مشہور ہیں، آپ ایک اندھے کے پاس سے گزر رہے تھے کہ کسی طرح معلوم ہو گیا کہ ابن مبارک جا رہے ہیں، عرض کی: خدا کے واسطے میرے لیے دعا کر دیجیے۔ راوی کا بیان ہے کہ آپ نے دعا کی اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندھا آنکھ والا ہو گیا۔ اور سب کچھ نظر آنے لگا۔

آپ کے ورع اور پرہیزگاری کا یہ عالم تھا کہ ایک دفعہ شام میں کسی آدمی سے ایک قلم منگنی کے طور پر لیا کہ کام کر کے واپس کر دوں گا اور پھر آپ بھول گئے، جب خراسان میں واپس آئے تو سامان میں دیکھا کہ قلم بھی ساتھ ہی چلا آیا ہے، صرف اتنے سے کام کے لیے شام واپس گئے اور قلم صاحب قلم کو لوٹا دیا۔

کچھ دنوں تک آپ نے باغبانی کا کام بھی کیا ہے، ایک دفعہ آپ کا مالک آیا اور کہا شیریں انار توڑ لاؤ آپ لائے تو ترش تھا، اس نے جھنجھلا کر پھر میٹھے انار کا آرڈر دیا آپ پھر ترش ہی اٹھا لائے، غصہ ہو کر کہتا ہے: تم اتنے دن سے باغبانی کر رہے ہو۔ تمہیں یہ بھی تمیز نہیں آئی کہ ترش انار کون ہے اور شیریں انار کون ہے، آپ نے فرمایا: میں حفاظت اور رکھوالی کرنے پر غلام رکھا گیا تھا آپ نے کچھ تو نہ کہا تھا کہ کھا لیا کرنا، اس لیے میں نے ایک پھل بھی کبھی نہیں چھوا۔ یہ سن کر صاحب باغ اتنا کافی متاثر ہوا کہ اپنی لڑکی سے آپ کی شادی کر دی۔ آپ نے تجارت بھی کی ہے۔

ایک دفعہ حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ سے کہنے لگے اگر آپ اور آپ جیسے متوکلین اولیاء اللہ نہ ہوتے تو میں تجارت ہرگز نہ کرتا، چناں چہ سال بھر میں آپ لاکھ لاکھ درہم فقیروں اور صوفیا کو دے ڈالتے تھے۔ [تہذیب التہذیب ۴/۴۵۹]

مصعب بن وہب فرماتے ہیں: کہ اگر میری ساری عمر کے بدلے مجھے ابن مبارک کی عمر کا ایک سال بھی مل جائے بلکہ ایک دن تو میں غنیمت سمجھوں گا۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ جن عبادتوں میں عبداللہ بن مبارک رہتے ہیں میں نے کوشش کی کہ تین دن بھی ان کے جیسا ہو جاؤں مگر مجھ سے نبھ نہ سکا۔ امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جو ہارون الرشید جیسے شہنشاہ کو بھی جب آتا تھا طالب علموں کی صف میں بٹھا دیتے تھے اور جب کبھی ابن مبارک پہونچے تو ان کے لیے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ یحیٰ ابن یحیٰ کہتے ہیں کہ میں نے امام کو دیکھا کہ ابن مبارک کے لیے اس طرح اپنی جگہ سے کھسکے کہ اس طرح کسی کو بھی اپنے پاس جگہ بناتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ جب ابن مبارک بیٹھ گئے تب امام مالک نے حدیث پڑھانی شروع کی اور پڑھائی کے بیچ بیچ میں ابن

مبارک سے یہ پوچھ لیا کرتے تھے کہ اس حدیث کے بارے میں کون حدیثیں ہیں، تو ابن مبارک بھی ان کا اتنا ادب ملحوظ رکھتے کہ نہایت آہستگی سے ان کے کان میں بتادیتے۔ آپ کے معاصرین آپ کے بارے میں رطب اللسان ہیں اور آپ کو تمام خوبیوں کا جامع تصور کرتے ہیں۔ اس ساری جلالت شان کے باوجود آپ سے امام اعظم کے بارے میں جو تعریفیں اور جس کثرت کے ساتھ مروی ہیں کسی دوسرے سے نہیں۔

امام کی شان میں یہ اشعار آپ نے کہے ہیں:

لقد زرت البلاد ومن علیہ

امام المسلمین ابوحنیفہ

امام اوزاعی نے ایک دفعہ ابن مبارک سے کہا کہ یہ بدعتی کون ہے جو کوفہ میں پیدا ہو گیا جس کو لوگ ابوحنیفہ کہتے ہیں، آپ نے جواب دینے کے بجائے ایک کتاب ان کے ہاتھ میں دے دی، اسے پڑھ کر کہنے لگے جس کے مصنف کا نام نعمان بن ثابت تھا یہ کون بزرگ ہیں؟ ابن مبارک نے کہا یہ ایک شیخ ہیں جن سے میری ملاقات عراق میں ہوئی تھی۔ بڑے جلیل القدر عالم ہیں، پھر امام اوزاعی سے بولے یہ وہی بزرگ ہیں جن کو آپ نے ابھی بدعتی بنایا ہے، ابن مبارک نے عقدہ کشائی کی تو امام اوزاعی نے کہا جاؤ ان سے اور سیکھو، بڑے مہتم بالشان عالم ہیں، اس کے بعد خود امام اوزاعی کی ملاقات امام اعظم سے مکہ میں ہوئی اور انہیں مسائل میں تبادلہ خیال ہوا تو ابن مبارک سے کہنے لگے، حاسدوں نے مجھ سے لگائی بجھائی کی تھی، میں اس سوء ظنی سے استغفار کرتا ہوں، یہ تو بہت بڑے بزرگ نکلے۔ وفات کے وقت ابن مبارک نے آنکھیں کھول دیں اور مسکرا کر فرمایا: وبمثل ھذا فلیعمل العاملون رضی اللہ تعالیٰ عنہ امام کی شان میں فرماتے ہیں: مجھے فقہ جو کچھ آئی ہے انہیں سے آئی ہے۔

وکیع بن الجراح: بن ملیح الرواسی الکوفی حافظ الحدیث۔ آپ علم شریعت وطریقت دونوں کے جامع تھے۔ چناں چہ آپ نے بزرگوں سے حدیثیں حاصل کی ہیں جن میں

امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری وغیرہ چوٹی کے ائمہ شامل ہیں اور خود یہ بھی مرجع خلائق تھے۔ ان کے بے شمار شاگردوں میں امام شافعی جیسے ائمہ شامل ہیں، آپ کی ولادت ۱۲۸ھ میں ہوئی، ابھی آپ بالکل بچے ہی تھے جب آپ کو حضرت سفیان ثوری نے اپنے پاس بلایا اور پوچھا تم نے کیا کیا حدیثیں سنی ہیں، تو آپ پوری پوری حدیثیں مع سند ومتن سنا دیتے۔ یہ سن کر حضرت سفیان مسکراتے اور ان کے قوت حافظہ کی داد دیتے اور اظہار تعجب کرتے اور فرماتے: عنقریب اس بچے کی شان بہت بلند ہونے والی ہے، چناں چہ حضرت سفیان کا وصال ہوا تو ان کے مسند حدیث پر حضرت وکیع ہی بیٹھے، ان کی طرف رجوع خلائق کا یہ عالم تھا کہ جہاں پہنچ گیے ساری مجلس درہم برہم ہوگئی۔ اور صرف انہیں کا حلقہ درس جاری رہا۔ ایک سال آپ حج کو تشریف لے گئے اور دوسرے علما ومحدثین بھی گئے جن میں عبدالرزاق اور ابواسامہ جیسے اعلام علما بھی تھے، دیگر علما کچھ پہلے پہنچ گئے تھے اور اپنا اپنا حلقہ درس قائم کرلیا تھا، حضرت وکیع کچھ دیر سے پہونچے پھر بھی لوگوں نے آپ پر اتنا ہجوم کیا کہ ساری درس گاہیں خالی ہوگئیں۔

حضرت عبدالرزاق اپنے حلقہ درس میں پہونچے تو دیکھا کہ بالکل اجاڑ ہے، کسی سے پوچھا: لوگ آج کہاں گئے اس آدمی نے کہا امام وکیع آئے ہیں، سب ان کے حلقہ درس میں شریک ہیں، یہ سن کر حضرت عبدالرزاق نے شکر ادا کیا اور فرمانے لگے میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ لوگوں کی رغبت حدیث سے کم ہوگئی ہے۔ ابواسامہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ سب لوگ میرے درس سے اٹھ کر وکیع کے وہاں پہنچ گئے تو انہوں نے فرمایا: ارے وہ تو اژدھا ہے جہاں پہونچ گیا آس پاس جلا کے رکھ دیا۔ [تہذیب التھذیب ۱۴۳/۹]

ابوہشام رفاعی کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ عبیداللہ بن موسیٰ حدیث بیان کررہے ہیں اور ان کے پاس مشتاقان علم کی بھیڑ لگی ہوئی ہے، پھر طواف کرنے کے بعد جو لوٹا تو دیکھا کہ وہ خالی بیٹھے ہیں اور کوئی بھی ان کے پاس نہیں ہے، میں نے پوچھا کیا ہوا، کہنے لگے بھائی ایک اژدھا آگیا ہے اسی نے سب کو اچک لیا ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ وہ اژدھا حضرت وکیع بن الجراح تھے۔ ایضاً

علی بن حشر کا بیان ہے کہ حضرت وکیع کو میں نے کبھی کتاب ہاتھ میں لے کر بیان کرتے ہوئے نہیں دیکھا، پوچھا آپ کا حافظہ کس طرح ایسا تگڑا ہے ۔ کہا گناہوں کو ترک کردینے سے زیادہ مفید شے حافظہ کے علاج کے لیے کوئی شئ میں نے نہیں دیکھی۔ ایضاً آپ نے چالیس حج کیے۔ عبادان میں چالیس راتوں میں چالیس ختم قرآن پڑھا۔ چالیس ہزار درہم صدقہ کیا۔ اوران کوکبھی کسی نے سوتا ہوا نہ دیکھا۔ آپ کے زہد واتقا پرہیزگاری کا عالم یہ تھا کہ سفر وحضر ہر حالت میں ہمیشہ روزہ رکھتے اور ساری رات نماز پڑھتے تھے، ابن جنادہ نے اپنی آنکھ دیکھا حال بیان کیا، مسلسل سات سال تک میں نے آپ کو قریب سے دیکھا لیکن کبھی آپ کو قبلہ سے رخ پھیرے ہوئے نہ دیکھا، کسی حال میں ہوں روبقبلہ رہتے تھے اور نہ تو آپ نے کبھی کچھ کسی سے مانگا نہ سوال کیا۔ نقل حدیث میں آپ کے احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ کے والد خزانہ پر مامور تھے، آپ جب ان سے روایت کرتے تو کسی دوسرے راوی سے روایت ضرور پہونچاتے۔ ایضا

ابن انس نے کہا کہ میں نے وکیع سے زیادہ افضل کسی کو نہیں دیکھا، کسی نے پوچھا عبداللہ بن مبارک کو بھی فرمایا: وہ بھی بزرگ تھے، لیکن وکیع سے زیادہ بزرگ میں نے کسی کو نہ دیکھا، وہ ہمیشہ روزہ رکھتے، ساری رات نماز پڑھتے، اور امام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ کے فتووں پر فتوی دیتے تھے۔

حفص ابن غیاث سے آپ کی بڑی دوستی تھی، لیکن جب سے وہ قاضی بنادیئے گئے اس وقت سے آپ نے ان سے قطع تعلق کرلیا جو اتنا محتاط تھا وہ دنیا کو کیا خطرے میں لاتا خود منصب قضا بھی انہیں پیش کیا گیا تو آپ نے انکار فرمادیا، آپ اپنے وقت کے امام المسلمین تھے ۱۹۷ھ میں حج سے لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں انتقال ہوگیا۔

امام اعظم کے بارے میں یہ کلمات آپ سے منقول ہیں: مارأیت احدا افقه منه ولا احسن صلوة منه. کسی نے امام کے بارے میں آپ سے کہا کہ ابوحنیفہ نے تو غلطی، کی تو آپ نے اسے جھڑک دیا اور فرمایا امام ابوحنیفہ کے متعلق جو یہ کہے جانوروں سے بھی بدتر ہے۔

ابوبکر وراقی: آپ کا نام محمد بن عمر الحکیم ترمذی ہے، آپ مشہور صاحب مسند امام ابوعیسیٰ ترمذی کے ماموں ہیں، آپ احمد خضرویہ کے صحبت یافتوں سے ہیں، صاحب تصانیف کثیرہ ہیں صاحب دیوان شاعر بھی ہیں، گزشتہ آسمانی کتابوں کے عالم تھے، آپ کے ارشادات میں سے یہ ہے۔ کہ اگر لالچ سے پوچھا جائے کہ تیرا باپ کون ہے؟ تو شک کو بتائے گا اور اگر اس سے اس کا پتہ پوچھا جائے تو بتائے گا ذلت وخواری۔ اس کی غایت پوچھی جائے گی تو بتائے گا محرومی۔ آپ اپنے مریدین کو گوشہ نشینی کی تعلیم دیتے تھے اور سیر وسیاحت سے روکتے تھے، اور فرماتے ہر خیر وبرکت کی کنجی صبر میں ہے۔

اگر انسان اپنے گوشہ عبادت میں ہی صبر سے بیٹھا رہا تو اس پر برکت کا ظہور ہوگا۔ آپ نے فرمایا: لوگوں کی تین قسمیں ہیں امرا، فقرا، علما، اگر امرا بُرباد ہو جائیں تو معیشت تباہ ہو جاتی ہے اور انفعالی بدحالی پھیل جاتی ہے۔ اور علما میں خرابی آئے تو روش شریعت غارت ہو جاتی ہے۔ اور فقرا میں فساد ہو تو لوگوں میں بداخلاقی پھیل جاتی ہے۔ پھر ہر سہ گروہ کے فساد پر بھی آپ نے روشنی ڈالی اور فرمایا کہ حکام میں خرابی ظلم سے آتی ہے۔ علما میں لالچ سے۔ اور فقیروں میں دربار سے۔ آپ کا مزار مقدس ترمذ میں زیارت گاہ خلائق ہے۔

حاتم اصم ابوعبدالرحمن: ابن عنوان ابن اصم قدمائے مشائخ خراسان سے ہیں، حضرت شفیق بلخی کے شاگردوں سے ہیں اور حضرت احمد خضرویہ کے نام سے جیسا کہ ظاہر ہے، ویسے بہرے نہ تھے۔ آپ کی سماعت تو اتنی تیز تھی کہ مکھی کو جب مکڑی پکڑ لیتی تھی تو مکھی کی بھنبھناہٹ بھی آپ سن لیا کرتے تھے، آپ کے اصم (بہرے) مشہور ہونے کا سبب یہ ہے کہ کوئی بڑھیا آپ سے مسئلہ پوچھنے آئی درمیان کلام میں ہی آواز کے ساتھ اس کی ریح خارج ہوگئی، وہ اس پر بہت شرمندہ ہوئی۔ آپ نے اس کی خجالت دیکھ کر فرمایا، بلند آواز سے کہو، جس سے بڑھیا نے یہ سوچا کہ شاید میری وہ حرکت حضرت حاتم اصم کے کان تک نہیں پہونچی اور اس کی خجالت دور ہوگئی، اسی دن سے آپ کو لوگ اصم کہنے لگے۔ [نفحات الانس مترجم ص: ۲۲۳] آپ سے کسی نے پوچھا نماز کیسے پڑھتے ہو۔ فرمایا: پورا وضو شرعی رعایت کے ساتھ نماز کی جگہ ٹھیک

سے حواس جمع کرتا ہوں۔ پھر کھڑا ہو کر کعبہ کو اپنے آنکھ کے سامنے کرتا ہوں اور پل صراط کو اپنے پیر کے نیچے تصور کرتا ہوں اور جنت کو اپنے دائیں اور دوزخ کو اپنے بائیں ملک الموت کو اپنے پیچھے اور یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آخری نماز ہے اس تصور کے ساتھ میں اللہ اکبر کہتا ہوں، پھر ترتیل کے ساتھ پڑھتا ہوں اور خشوع وخضوع کے ساتھ رکوع وسجود کرتا ہوں، پھر بایاں پیر بچھا کر اور دایاں کھڑا کر کے سرین پر بیٹھتا ہوں، پھر یہ نہیں جانتا کہ قبول کی گئی یا نہیں۔ میری ہر ایک نماز تیس سال سے اسی طرح ہوتی ہے۔ [القلیوبی، تذکرۃ الاولیا، ص ۳۰۲]

(واضح رہے کہ نماز کا جو طریقہ خصوصاً قاعدہ بیان فرمایا ہے وہ حنفی طریقہ ہے) آپ کی ایک نماز میں جماعت نہ ملی تو آپ کی ماتم پرسی صرف ابو اسحٰق بخاری نے کی، آپ نے اظہار افسوس فرمایا کہ اگر آج میرا کوئی بچہ مر گیا ہوتا تو دس ہزار آدمی ماتم پرسی کو آتے۔

حدیث تقرب

اور

غوث پاک

اللہ تعالٰی اپنے بندوں سے کتنا قریب ہو جاتا ہے اس کو پیغمبر اسلام نے اس حدیث میں بیان فرمایا ہے:

مایزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتی احببته، فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به، وبصره الذی یبصر به، ویده التی یبطش بها، ورجله التی یمشی بها. [مشکوۃ ص ۱۹۷، مجلس برکات]

بندہ نوافل کے ذریعہ مجھ سے قریب ہو جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں، اور جسے میں چاہنے لگتا ہوں اس کا کان ہو جاتا ہوں جس سے سنتا ہے، اور آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ ہو جاتا ہوں جسے پھیلاتا ہے، اور پیر ہو جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔

پانچویں صدی ہجری کے شہرۂ آفاق بزرگ اور امت اسلامیہ کے مسلم الثبوت ولی حضرت پیران پیر شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانی رضی اللہ تعالٰی عنہ نے اس حدیث کی وضاحت بڑے دل آویز انداز سے کی ہے۔

اور جو اپنے رب عزوجل کی محبت کثرت نوافل سے تلاش کرتا ہے وہ خدا کا وصال پالیتا ہے اور خدا کے محبوبوں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے، اس وقت وہ خدا کا مرید بلکہ مراد

ہوجاتا ہے اور اس سے سالکان راہ کی مشقتیں اٹھادی جاتی ہیں، وہ رحمت الٰہی ولطف ربانی کے سمندر میں غوطہ زن رہتا ہے، اور جوار الٰہی میں جگہ پاتا ہے اور اس پر معرفت خداوندی، انس ربانی اور سکون الی اللہ کا فتح باب ہوجاتا ہے تب وہ اسرار الٰہی بیان کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ خدا ہی سے کہتا ہے، خدا ہی سے سنتا ہے، اسی کی روشنی میں دیکھتا ہے، اسی کی قدرت سے بولتا ہے، اور اسی کی طاقت سے تصرف کرتا ہے۔ وہ خدا کی ہی عبادت میں کوشش کرتا ہے اور دامن قدرت ہی میں سکون پاتا ہے اس کی نیند بھی اطاعت ربانی، ذکر الٰہی اور اورادو وظائف کے ساتھ ہوتی ہے، اور وہ خدا کے امین، اس کے گواہوں، اوتاد اور بندگان خدا کے محافظوں سے ہوتا ہے، انہیں کی طرف پیغمبر اسلام سے حدیث: لایزال عبدی میں اشارہ کیا ہے۔

[بہجۃ الاسرار]

علامہ ملا علی قاری علیہ الرحمہ احناف کے جلیل القدر عالم اور مشکوۃ شریف کے مستند شارح نے اپنی موقر کتاب مرقاۃ المفاتیح ۵/۴۳ پر اس حدیث کا مطلب بیان کرتے ہوئے وہ قول نقل کیے ہیں۔

(۱) خدائے ذوالجلال اپنے محبوبوں کے اعضاو جوارح کو اپنی مرضی کا آلہ اور وسیلہ بنالیتا ہے حتی کہ وہ دیکھتا ہے، کہ جو مرضی الٰہی ہے، اور وہی سنتا ہی ہے جو خدا کو پسند ہے، او رخدائے قادر وتوانا اسے ناپسندیدہ باتوں سے روکتا ہے۔ بالفاظ دیگر ملت بیضا اسلامیہ ودین پاک محمدی اس کی پوری حیات پر حاوی ہوجاتا ہے اور اس کی عادت ثانیہ بن جاتا ہے حتی کہ اس کی ہر حرکت وسکون شرع کے دائرے میں ہوتی ہے۔

(۲) خدا جب بندے کو چاہتا ہے تو اس کی حاجت پوری کرنے میں اس کے اعضا پر سبقت فرماتا ہے، یعنی اس کے ہاتھ، کان، ناک وغیرہ اتنی جلدی وہ امور نہیں کرسکتے جن کو جتنی جلد خدا پورا کردیتا ہے، بالفاظ دیگر ان سے محیر العقول افعال صادر ہوتے ہیں۔

مختصر الفاظ میں ان دونوں کی وضاحت یوں کی جاسکتی ہے۔ ایک طرف اولیا اللہ شریعت ربانی کے اتنے پابند ہوتے ہیں کہ اس کے سوا وہ کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ دوسری طرف ان

سے وہ محیر العقول افعال صادر ہوتے ہیں جن کی گرد تک بھی پہنچنا عام انسانوں کا کام نہیں۔

پس اسلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے نیک بندوں کی معرفت کے لیے واضح نشان دو باتوں کو بتایا ہے۔ ایک تو پابندیٔ شریعت اس کی عادت ثانیہ ہو جائے، دوسرے اس سے خوارق صادر ہوں، لیکن چوں کہ دوسری بات بہت حد تک پہلی بات کا ثمرہ اور نتیجہ ہے، کیوں کہ اسی حدیث میں بندہ کے کثرت نوافل و پابند شرع ہونے پر یہ عظیم الشان مقام مرحمت فرمانے کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس لیے جہاں صرف پابندی شرع ہو اور خوارق کا ظہور نہ ہو وہاں تو ہم اس شخص کے بندۂ خدا اور مرد راہ حق ہونے کی شہادت دے سکتے ہیں۔ اسی طرح جہاں یہ دونوں باتیں بھرپور پائی جائیں وہاں بدرجہ محبوب ربانی ہونے کی شہادت دی جائے گی۔ لیکن جہاں صرف خوارق ہی خوارق ہوں اور پابندی شرع نام کو نہ ہو وہاں ولایت و بزرگی کا یقین نہیں کرنا چاہیے۔

محبوبان بارگاہ لم یزل کی برگزیدہ صفات کے سلسلہ میں پابندی شرع یا اظہار کرامات دونوں تقدیر پر مذکورہ بالا حدیث اور اس کی تشریحات میں پانچ چیزوں کا ذکر تفصیل سے آیا ہے: کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں یعنی خصوصاً یہ اعضا مرضیٔ الٰہی کے پابند ہوتے ہیں اور نسبتہً ان سے خوارق کا ظہور زیادہ ہوتا ہے، ذیل میں ہم غوث پاک کی سوانح سے ان اعضا کے متعلق شہادتیں اتباع شرع اور صدور کرامت دونوں ہی سلسلہ میں پیش کریں گے۔

کثرت نوافل: لیکن اس سے قبل کثرت نوافل اور از دیاد عبادت الٰہی کو وفور مجاہدہ اور کثرت ذکر کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا جس کو محبت زبان اور تقرب الی اللہ کا آخری زینہ قرار دیا گیا ہے، غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مجاہدہ کتنا بڑھا ہوا تھا اور آپ نے اسے ہمیشہ ہر خطر کے طے کرنے میں کیا خار کھائے ہیں اس کا اندازہ خود غوث پاک اور آپ کے لیل و نہار دیکھنے والوں کے حسب ذیل بیان سے کیا جا سکتا ہے۔

چالیس سال تک نماز فجر کو عشا کے وضو سے پڑھا ہے، اور ۱۵ سال تک عشا کے بعد ایک پیر پر کھڑے رہ کر صبح تک پورا پورا قرآن مجید ختم کیا ہے، اور گیارہ سال تک بغداد کے ایک

برج میں اعتکاف تحنث میں مشغول رہے کہ لوگ اس برج کو طول قیام کی وجہ سے عجمی کہتے تھے۔

[اخبار الاخیار مترجم ص ۳۶]

شیخ ابوالفتح ہراسی کہتے ہیں: میں نے چالیس سال تک غوث پاک کی خدمت کی، اس پوری مدت میں آپ عشا کی نماز کے بعد اپنی خلوت گاہ راز میں چلے جاتے صبح کو باہر نکلتے اور کسی کو ساتھ رہنے کی اجازت نہ تھی۔ میرا مشاہدہ بہت راتوں کا ہے کہ ابتدائے شب میں نفل پڑھتے پھر ذکر میں مشغول ہو جاتے۔ ایک تہائی رات تک یہی ہوتا، پس کبھی تو سارا جسم روشن ہوتا ہے، کبھی جثہ بہت بڑھ جاتا، کبھی فضا میں بلند ہو جاتے اور کبھی میری نگاہ سے اوجھل ہو جاتے۔ پھر دوسری تہائی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے اور بڑے طویل سجدے کرتے اور نہایت عجز سے چہرہ خاک پر رکھتے۔ پھر ایک تہائی مراقبہ کرتے اور دعا وزاری کرتے تا آں کہ صبح کی نماز کے لیے باہر آتے۔ [بہجۃ الاسرار مترجم ص ۲۴۹]

غوث پاک کا اپنا بیان: ایک رات عراق کے ویرانے میں ایک زینہ پر چڑھ رہا تھا۔ دل میں نیند کا خیال آیا وہیں کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لیا اور صبح تک ایک قرآن ختم کر کے دم لیا۔ [بہجۃ الاسرار]

اسی سلسلہ میں داد و دہش، غریبوں کی مدد اور یتیموں کی پرورش کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے۔ چناں چہ حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس میدان میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ آپ کے صاحب زادے بیان فرماتے ہیں کہ میرے والد نے ولایت میں شہرت پانے کے بعد صرف ایک حج کیا ہے، اس سفر میں میں آپ کا منتظم امور تھا۔ جب ہم مقام حلہ تک پہنچے تو فرمایا: کہ سب سے غریب گھر تلاش کرو، ہم نے تفتیش کے بعد ایک ویرانے میں ایک کمبلوں کا خیمہ پایا جس میں ایک بڈھا، اس کی بیوی اور ایک بچی تھی۔ خود والد نے ٹھہرنے کی اجازت چاہی اور اس نے بخوشی منظور کر لیا۔ جب وہاں کے روسا و مشائخ کو اس کی اطلاع ہوئی تو سب نے بہت کچھ التجا کی اور اپنے مکانوں میں ٹھہرنے کو کہا لیکن آپ نے انکار کر دیا۔ بہر حال ہر طرف سے تحفہ و تحائف کا انبار لگ گیا، کتنوں نے جانور بھیجے، کتنوں نے کپڑے نذر کیے، بہت سارے لوگوں

نے روپیہ اشرفی حاضر خدمت کیا، اور کتنے لوگوں نے سفر کے لیے سواریوں کا انتظام کیا، آپ نے اپنے رفقا کی طرف دیکھا اور فرمایا: ان تحائف میں جو ہمارا حصہ ہے ہم نے سارا کا سارا اس گھر والوں کو دے دیا سب نے آپ کی اقتدا میں اپنے اپنے حصے اس گھر والوں کو دے دیے، کچھ دنوں کے بعد جب میں واپس لوٹا تو میں نے دیکھا کہ پورے گاؤں میں اس بڈھے سے زیادہ مالدار کوئی نہ تھا، اور وہ ہر شخص سے یہی کہتا تھا یہ غوث پاک کی رات بھر اقامت فرمانے کی برکت ہے۔ [بہجۃ الاسرار]

اللہ اللہ بہانا تلاش کر کے غربا نوازی کے مواقع فراہم کئے جاتے تھے، اس قسم کا ایک دوسرا واقعہ بھی قابل ذکر ہے جس میں ایثار اور کریم النفسی کا بے مثال مرقع نظر آتا ہے، خود آپ ہی فرماتے ہیں: بغداد کی زندگی اور اپنے ابتدائے امر میں ایک دفعہ مجھ پر بیس روز گزر گئے کہ میں نے ایک دانہ نہ کھایا اور کوئی جائز چیز ایسی مجھے ملی بھی نہیں جسے کھا سکوں، چناں چہ میں ایوان کسریٰ کے ویرانے میں گیا کہ شاید مجھے وہاں کوئی حلال چیز مل جائے تو میں نے دیکھا، ستر آدمی اولیائے کرام میں سے اسی کاوش میں سرگرداں ہیں اور میری ہی طرح رزق حلال کے متلاشی ہیں، میری غیرت نے گوارا نہ کیا کہ میں بھی اس میں شریک ہو کر حصہ بٹاؤں، واپس لوٹا، اتفاق سے بغداد میں وطن کا ایک ملاقاتی مل گیا اور اس نے چاندی کا ایک ٹکڑا نکالا اور کہا کہ یہ تمہاری ماں نے بھیجا ہے، پس میں نے اس میں سے کچھ حصہ اپنے لیے رکھ لیا اور باقی اس ویرانے میں جا کر ان سب لوگوں پر تقسیم کر دیا اور کہا کہ یہ میری ماں نے حلال کمائی سے بھیجے ہیں، میں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ خود کھا لوں اور آپ کو شریک نہ کروں۔ اور وہاں سے پھر بغداد آ کر بچے ہوئے پارۂ سیم سے روٹی خریدی اور بہت سارے فقیروں کو جمع کرایا پھر ہم سب نے مل کر وہ روٹی کھائی اور رات تک وہ چاندی کا ٹکڑا میرے پاس نہ تھا، **ویورث علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ.** [بہجۃ الاسرار]

غوث پاک کی حیات طیبہ میں ایسے اعلیٰ اخلاقی نمونوں کی بہتات ہے جس پر انسانیت بجا طور پر ہمیشہ فخر کرے گی، اور ہر قوم ان روشنی کے میناروں سے کسب ضیا اپنی خوش قسمتی تصور

کرے گی۔ ایک دفعہ آپ نے ایک شکستہ دل فقیر کو دیکھا جس کا بشرہ ہی اس کی بے کسی کا مرثیہ گو تھا۔ شدت تاثر سے قلب پاک تڑپ گیا۔ قریب جا کر فرمایا: کہو کیسا حال ہے؟ اس نے عرض کیا: حضور آج میں سفر کے ارادے سے نکلا، راہ میں دریا پر ملاحوں نے میری غریبی کی وجہ سے کشتی میں سوار کرنے سے انکار کر دیا۔ اپنی بے کسی پر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور اب تک اسی آگ میں لوٹ رہا ہوں، اسی وقت ایک آدمی اشرفیوں کی تھیلی لایا، آپ نے فقیر کو دے کر کہا جا کر ملاح کی اجرت دے دو اور اس سے کہو: اب کسی فقیر کو نہ لوٹائے، عبد القادر کہتا ہے، اور چلتے چلتے آپ نے اپنا مبارک جبہ بھی اتار کر اسے دے دیا، اس نے بیس دینار میں بیچ دیا۔

سمعه الذی یسمع به: پابندی شرع کے سلسلے میں اولیا کی سماعت کا مرضئ الٰہی کا پابند ہونا اور ہر ناپسندیدہ بات سے رکنا، خلاف شرع آوازوں سے احتراز کرنا، ایک نا قابل انکار حقیقت ہے۔ (وہ بھی غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کی پوری زندگی مرضیات الٰہی اور شروس قدس کی دلنواز آوازیں سننے میں ختم ہوئی ہے)

ایک زاہد مرتاض جس کی نوے سالہ حیات میں ۲۵ سال اس عالم میں گزرے کہ وہ عراق کے ویرانوں میں مصروف ذکر وفکر رہا ہو، جو نہ تو خود کسی سے ملتا ہو اور نہ اور کوئی اس سے ملتا ہو۔ مستقل گیارہ سال بغداد کے ایک برج میں مقیم رہ کر عبادت وریاضت میں مصروف رہا ہو۔ بار بار اپنے نفس کے بھوک کے شدید تقاضے کے بعد بھی وہاں سے نہ ہٹا ہو۔ جو مسلسل تین سال تک صرف ان کے وعدہ کے خیال سے ایک در پر پڑا رہا ہو اور گھاس پھوس کھا کر بسر کی ہو اور کھانے کے لیے بھی کہیں نہ ملا ہو۔ جس نے پیہم ۳۳ سال تک دن میں طالب علموں کو سبق پڑھائے ہوں، فاضل اوقات میں فتوی نویسی کی ہو، اور رات میں شاہد عدل سے محو گفتگو ہو، اس کی زندگی میں کہاں ایسے مواقع آسکتے ہیں کہ خلاف شرع بات سننے کی طرف متوجہ ہوا ہوگا۔ اور اس کے لمحات حیات میں اس قسم کے منکرات کی گنجائش کہاں نکل سکتی ہے، پھر بھی تاریخ نے اپنے سینے میں ایک اسی قسم کا واقعہ غوث پاک کی حیات کا محفوظ رکھا ہے۔

خود غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان ہے: ایک دفعہ گھومتے گھومتے میں ایسے

صحرائے لق ودق میں پہونچا جہاں پانی عنقا تھا اور تری کا فور تھی۔ اسی عالم میں کئی روز گزر گئے اور شدید پیاس نے بے حال کردیا، رحمت حق سے بدلی کا ایک آوارہ ٹکڑا آکر میرے حلق کو چند قطرہ پانی سے سیراب کر گیا جس سے یک گونہ تسکین حاصل ہوئی۔ پھر ایک نور چمکا جس نے سارے آسمان کو ڈھک لیا اور اس میں سے ایک عجیب وغریب شکل ہویدا ہوئی جس نے پکار کر کہا اے عبدالقادر میں تیرا پروردگار ہوں میں نے جو چیزیں غیروں پر حرام قرار دی ہیں تجھے حلال کیں جو چاہے لے اور جو چاہے کر۔ میں نے جواب میں اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کہا یہ کیسی ملعونی باتیں ہیں کہ یک بیک وہ روشنی تاریکی سے بدل گئی اور آواز آئی آج تم کو تمہارے علم شرع اور پابندئ مذہب نے بچالیا، ورنہ میں نے اسی طرح آج ستر (۷۰) آدمیوں کو گمراہ کیا ہے، اس میں سے ایک بھی نہ سنبھل سکا۔ [اخبار الاخیار مترجم ص ۳۷]

اور ظاہر ہے کہ جو بچپن میں، جوانی میں، خلوت میں، جلوت میں، حریم راز و پردہ گاہ ازل سے یہ دلنواز نغمہ شب و روز سنتا ہو۔ الیّ یامبارک الیّ یامبارک یعنی میری طرف اے مبارک، میری طرف اے مبارک، اس پر کسی بھی خلاف شرع بات کا کیا اثر ہوسکتا ہے اور وہ غنائے دنیا کی طرف کیسے متوجہ ہوسکتا ہے، اور آج بھی ہر شخص جانتا ہے کہ سلسلہ محمدیہ قادریہ میں غناو مزامیر سے احتراز پر شدت سے عمل کیا جاتا ہے۔

بصرہ الذی یبصربہ: خدا ان کی نگاہ ہوجاتا ہے جس سے وہ دیکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں غوث پاک کی پوری حیات میں کوئی اس قسم کا واقعہ بھی نہیں ملتا کہ ان کی نگاہوں نے کبھی مرضئ الٰہی کے خلاف کام کیا ہو، اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے جن کی نگاہیں لوح محفوظ میں ہوں ،عینی فی لوح المحفوظ جو شاہد عدل کے جمال حیات بخش سے آسودہ نظارہ ہوں، جسے بچپن میں بھی آوارہ گردی کے میلان پر ٹوکا جاتا، وماخلقت لمثل ھذا آپ اس لیے نہیں بنائے گئے ہیں۔ ان کی نگاہیں کیسے ماسوائے حق دیکھ سکتی ہیں۔ خود غوث اعظم کا بیان ہے :لااعجبنی من زینۃ الدنیاقط. مجھے دنیا کبھی نہیں بھائی۔ حضرت مسعود نے پوچھا: ولاحین کنت صغیراً جب آپ بچے تھے جب بھی نہیں؟ فرمایا: ہاں، ولاحین کنت صغیراً جب

بچہ تھا تب بھی نہیں۔ [بہجۃ الاسرار]

آپ کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ آپ کے سامنے کوئی خلاف شرع بات ہو، آپ کے صاجزادے حضرت عبدالرزاق کہتے ہیں: میں اپنے والد کے ساتھ نماز جمعہ کو نکلا اور ساتھ میں میرے دو بھائی عبدالوہاب اور عیسیٰ بھی تھے، اسی راستے سے بادشاہ کے تین اونٹ شراب کے جارہے تھے جس کے ساتھ کچہری کا مالک اور عمائدین سلطنت میں سے ایک تھا اور شراب کی بو خوب پھیلی ہوئی تھی، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی نے ان لوگوں کو ٹھہرنے کا حکم دیا تو ان لوگوں نے اور تیزی کے ساتھ جانوروں کو ہانکنا شروع کیا اور چاہا کہ جلدی سے آنکھ سے اوجھل ہوجائیں، آپ نے جانوروں کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ نہیں کھڑے ہوتے تو تم کھڑے ہوجاؤ، اب لوگ لاکھ مار رہے ہیں، لیکن جانوروں کو نہ وہاں سے ہلنا تھا نہ ہلے، اور خود لے جانے والے قولنج کے شدید دورے میں مبتلا ہو گئے تھے۔ وہ لوگ بے قرار ہو کر تڑپتے تھے اور ابتہال وزاری سے معافی مانگتے تھے، آپ نے توجہ فرمائی تکلیف جاتی رہی اور شراب کی بوتل سرکہ سے بدل گئی اور جانور چل پڑے، رہ گیروں میں ایک شور اٹھا اور شیخ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد کی طرف چل پڑے جب بادشاہ کو یہ خبر ہوئی تو خود زیارت کے لیے آیا اور آپ کے حضور میں بہت سارے محرمات سے نہایت عاجزی کے ساتھ توبہ کی۔ [بہجۃ الاسرار مترجم ۱۱۲]

لسانہ الذی یتکلم بہ : خدا اولیا کی زبان ہوجاتا ہے جس سے وہ بولتے ہیں۔

حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان کتنی پابند شرع تھی، اور صدق مقال ان میں بچپن سے ہی کوٹ کر بھری تھی، اس کی وضاحت کے لیے غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات طیبہ کا صرف ایک مشہور ومعروف واقعہ کافی ہے، جسے اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے، کسی نے آپ سے پوچھا یہ مرتبہ آپ کو کیسے ملا آپ نے فرمایا سچائی سے۔ میں نے زندگی میں کبھی جھوٹ نہیں کہا حتیٰ کہ جب میں مکتب میں تھا جب بھی۔ پھر آپ نے اپنے بچپن کا حال سنایا کہ میں نے عرفہ کے دن بازار میں ایک گائے کا پیچھا کیا۔ اس نے میری طرف منہ پھیر کر کہا، اس کے لیے تم کو نہیں پیدا کیا گیا ہے اور نہ تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے، میں ڈر کر گھر آیا اور مکان کی چھت پر چڑھ گیا تو

لوگوں کو عرفات میں جمع دیکھا، اتر کر ماں کے پاس آیا عرض کی: اماں جان مجھے خدا کی راہ میں سونپیے اور اجازت دیجیے کہ میں بغداد جا کر علم حاصل کروں اور نیکوں کی صحبت سے فیض اٹھاؤں، ماں نے وجہ پوچھی، میں نے کل کا ماجرا کہہ سنایا تو وہ رونے لگیں اور مجھے اسی دینار دکھائے جسے والد چھوڑ گئے تھے، میں نے اپنے بھائی کے لیے چالیس چھوڑ دیئے اور چالیس دینار والدہ نے میر گدڑی میں سی دیئے، جدائی کے وقت مجھ سے ہر حال میں سچ بولنے کا وعدہ لیا اور نہایت بے قراری سے بولیں: یہ آخری ملاقات ہے پھر قیامت میں ملیں گے جاؤ خدا کی راہ میں سدھارو۔ میں ایک چھوٹے قافلے کے ساتھ چل پڑا، جب ہم ہمدان سے آگے بڑھے تو ہم پر ساٹھ گھوڑ سواروں نے حملہ کیا، لیکن مجھ سے کسی نے تعرض نہ کیا، ایک نے چلتے ہوئے پوچھ لیا: میاں فقیر تمہارے پاس بھی کچھ ہے، میں نے کہا چالیس دینار، پوچھا کہاں ہیں؟ میں نے جواب دیا میر بغل کے نیچے گدڑی میں سلے ہوئے ہیں۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ دوسرے سے یہی بات چیت ہوئی وہ بھی چلا گیا اور دونوں نے اپنے سردار کے پاس جا کر یہ بات نقل کی، اس نے پکڑوا منگایا اور اس سے بھی میری یہی بات چیت ہوئی اس نے گدڑی جب ادھیڑوائی تو دینار ملے، تو تعجب سے پوچھا آخر تمہیں بتانے کی ضرورت کیا تھی، سب تو چھپاتے ہیں، میں نے کہا چلتے چلتے ماں سے وعدہ کر آیا تھا کہ ہر حال میں سچ بولوں گا، یہ سن کر وہ رونے لگا اور بولا تم اپنی ماں سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتے اور میں اتنے دنوں سے اپنے رب سے وعدہ خلافی کر رہا ہوں، اس وقت اس نے اور سب نے میرے ہاتھ پر توبہ کی اور لوٹ کا تمام مال واپس کر دیا۔

[بہجۃ الاسرار مترجم ص: ۲۵۵]

خود غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں: میں اس وقت تک کلام نہیں کرتا جب تک مجھ سے کہا نہیں جاتا ہے عبد القادر بولو سنا جائے گا۔

اب بات زبان تک آ گئی ہے تو اکل وشرب کا ذکر بھی بے محل نہیں ہوگا، کیوں کہ زبان کا مرضیٔ الٰہی کا پابند ہونا ان سب باتوں کو بھی شامل ہے۔ آپ کی والدہ کی روایت ہے کہ میرا بچہ عبد القادر جب میں نے اسے جنا تو یہ رمضان کے ایام میں وقت کے اندر دودھ نہیں پیتا تھا، ایک

مرتبہ انتیس (۲۹) کا چاند ہم لوگ نہ دیکھ سکے تو میرے وہاں لوگ دوڑے ہوئے آئے کہ آپ کے بچے نے دودھ پیا ہے یا نہیں؟ میں نے جواب دیا نہیں، تفتیش پر معلوم ہوا کہ کل چاند ہوا تھا وہ دن رمضان کی پہلی تاریخ تھی۔ [بہجۃ الاسرار]

اور انہیں پر ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ مدتوں فاقہ ہی پر بسر ہوتی رہی، آپ ہی سے روایت ہے کہ فرمایا چالیس چالیس دن ہو گئے ہیں کہ میں نے ایک دانہ نہیں کھایا۔

ایک دفعہ میں نے اپنے خدا سے عہد کیا کہ اس وقت تک نہ کھاؤں گا کہ کھلایا نہ جاؤں، اور اس دم تک نہ پیوں گا جب تک پلایا نہ جاؤں، چالیس روز گزر گئے کہ ایک دانہ نہ کھایا، چالیسویں روز ایک شخص کھانا سامنے رکھ گیا، نفس بھوک سے تڑپ رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ ابھی ٹوٹ پڑے گا میں نے کہا: میں اپنے رب سے کیا ہوا وعدہ نہیں توڑوں گا، جس کی وجہ سے نفس سے ایک شور اٹھا، شیخ ابوسعید خزیمی گزر رہے تھے کہا، عبدالقادر یہ شور کیسا ہے؟ میں نے عرض کیا: نفس بھوک سے مضطرب ہے لیکن بحمدہ اللہ روح مطمئن ہے، تو مجھ سے وہ یہ کہہ گئے کہ باب البلاخ پر مجھ سے ملو، میں اس پر بھی نہیں اٹھا تو حضرت خضر نے آ کر کہا کہ ابوسعید سے جا کر ملو، پھر انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے لقمہ بنا بنا کر کھلایا اور خرقہ خلافت پہنایا۔ [بہجۃ الاسرار]

یہ تو خیر عالم سلوک کا حال ہے، اس وقت جب آپ کا اثر لوگوں پر ثابت ہو گیا تھا اور آپ کی ولایت وقطبیت کی دھاک چار دانگ عالم میں بیٹھ چکی تھی، اس وقت آپ کے روزانہ کا معمول یہ تھا، اگر کوئی سونا چاندی تحفہ لاتا تو آپ ہاتھ نہ لگاتے بلکہ فرماتے اسے مصلے کے نیچے رکھ دو، اس کے بعد خادم آتا تو فرماتے کہ مصلے کے نیچے سے اسے نکال لو اور اسے نانبائی اور بقال کو دے دو۔ [بہجۃ الاسرار]

خاص خلیفۂ وقت اور بادشاہ اسلام کا خلعتوں کے ساتھ یہ برتاؤ تھا کہ اسے بغیر کسی معاوضہ کے ابوالفتح طحاوی کو دے دیتے اور اس سے بطور قرض علما اور صلحا کے لیے آٹا منگا لیتے اور خود اپنی غذا کا یہ انتظام فرمایا تھا کہ آپ کی ذاتی زمین حلال کمائی کی تھی جسے آپ کے احباب میں سے ایک شخص بوتا جوتتا تھا اور آپ کے خاص مرید اسے خود پیس کر دو چار روٹی پکا دیتے تھے جو

ہر دن شام کے وقت آپ کے پاس پہنچ جاتی تھی اور حضرت غوث پاک خود اپنے ہاتھ سے ٹکڑہ ٹکڑہ کر دیتے، اس وقت جتنے لوگ ساتھ رہتے انہیں ایک ایک ٹکڑہ دے دیتے اور بقیہ اپنے لیے رکھ چھوڑتے۔ [بہجۃ الاسرار]

یدہ التی یبطش بھا: خدا اولیا کا ہاتھ بن جاتا ہے جسے وہ پھیلاتے ہیں۔ اکل حلال اور کسب رزق کے سلسلے میں جتنی بھی مثالیں اوپر گزری ہیں ان سبھی کو ہاتھ کی مرضیٔ الٰہی کی پابندی میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ تاہم یہاں ایک مثال مشتبہ روزی سے بچنے اور احتراز کرنے کی پیش کی جارہی ہے جو کافی عبرت ناک اور سبق آموز ہے، ابو العباس حضرت بن عبد اللہ کہتے ہیں:

ہم ایک رات غوث پاک کے مدرسہ میں تھے، آپ بھی تشریف فرما تھے کہ امام وقت مستنجد باللہ ابو المظفر یوسف آیا، اس نے سلام کیا اور نصیحت طلب کی، اس کے بعد اس نے تھیلیاں جن میں مال بھرا ہوا تھا اور دس خادم اٹھائے ہوئے تھے حاضر خدمت تھیں اور قبول فرمالینے کی درخواست کی، شیخ نے انکار فرمایا اور کہا: مجھے ضرورت نہیں ہے، جب اس نے بہت اصرار کیا تو ایک تھیلی دائیں ہاتھ میں اٹھالی ایک بائیں ہاتھ میں اور انہیں نچوڑ دیا تو اس سے خون ٹپکنے لگا۔ آپ نے فرمایا: ابو المظفر تمہیں شرم نہیں آتی کہ تم لوگوں کا خون لاکر مجھے ہدیہ کرتے ہو۔ دہشت نظارہ سے جب وہ بے ہوش ہوگیا تو آپ نے فرمایا: اگر اس کے رسول ﷺ کے رشتہ دار ہونے کا پاس نہ ہوتا تو میں چھوڑ دیتا کہ اس خون کی موجیں اس کے ایوانوں سے ٹکراتیں۔ [بہجۃ الاسرار ۱۷۸]

رجلہ التی یمشی بھا: قدم وہ بھی غوث پاک رضی اللہ تعالی عنہ کا۔ وہ قدم جس کی طرف اشارہ کرکے آپ نے فرمایا تھا: قدمی ھذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ. میرا قدم ہر ولی اللہ کے گردن پر ہے (تو روئے زمین کے تمام اولیا اللہ جو حاضر ہوں یا غائب، قریب ہوں یا بعید، بظاہر ہوں یا بباطن سب گردن اطاعت جھکا دیں اور کہیں: بل علی راسی وعینی گردن ہی پر نہیں ہمارے سر اور آنکھ پر) ایسے عظیم الشان اور جلیل المرتبت قدم کی استواری کا ذکر، راہ حق میں ثابت قدمی کا تذکرہ، پابندی شرع کا قصہ، بغیر بیان کئے ہوئے ہی ظاہر ہے۔ پھر بھی رات

رات بھر مسلسل ۱۵ رسال تک ایک قدم پر کھڑے ہو کر قرآن کی تلاوت اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

صغر سنی میں جیلان سے پیادہ پا طلب علم کے لیے چل نکلنا اطاعت الٰہی کا ہی ایک نمونہ ہے۔آپ خود فرماتے ہیں:

میں نے ابتدائے امر میں طریقہائے مجاہدات میں سے کسی کو بھی اختیار نہ کیا کہ اس کو پوری طرح نہ برتا ہو۔میں پیدل ننگے پاؤں خاردار جھاڑیوں اور پتھریلی زمین میں گھوما کرتا تھا۔اور مجھے کسی امر نے دہشت ناک نہیں کیا لیکن میں اسے برتا ضرور تھا۔ [بہجۃ الاسرار]

یہ دشت پیمائی، بادیہ نوردی، اور وارفتگی میں جھاڑیوں اور سنگستان میں چلنا اور آبلہ پائی کی الم انگیز لذت سے بہرہ اندوز ہونا ابتدائے حال کا واقعہ ہے، لیکن یہی قدم جو راہ حق میں زخمی ہو کر بھی چلنے سے نہیں تھکتا تھا ایک وقت ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کے لیے کھڑے ہونا بھی دوبھر ہے۔ہاں یہ اور بات ہے کہ جب چلا تھا جب بھی حق کے لیے، جو ایک وقت زخمی ہوا تھا تو اطاعت مولا میں، اور اب جب کھڑا ہونا بار ہے تب بھی حق اس کے ساتھ ہے۔عبداللہ الموصلی کہتے ہیں کہ میں غوث پاک کی خدمت میں تیرہ سال رہا، اس طویل مدت میں میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ آپ کسی امیر کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوئے ہوں، نہ ہی کبھی کسی امیر و وزیر کے یہاں جاتے ہوئے دیکھا۔اور اگر کبھی بادشاہ یا وزیر یا کوئی بہت عزت والا شخص ملنے آتا اور آپ تشریف فرما ہوتے تو اٹھ کر مکان کے اندر چلے جاتے اور جب وہ آکر بیٹھ جاتا تو آپ اندر سے تشریف لاتے تا کہ اس کے لیے کھڑا ہونا نہ پڑے۔ [بہجۃ الاسرار]

لیکن یہی باوقار قدم ہیں کہ خبر ملتی ہے کہ فلاں محلہ میں ایک مسکین بیمار ہے تو بہ نفس نفیس اس کی عیادت کو جاتے ہیں اور غمگساری فرماتے ہیں۔

شیخ ابوالقاسم عمر البز از فرماتے ہیں: کہ

حضرت غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ غریبوں میں انہیں سے ایک ہو کر بیٹھتے اور مریضوں کی عیادت کے لیے جاتے۔

دیگر خوبیاں: یہاں تک کہ خصوصیت کے ساتھ انہیں واقعات کا ذکر تھا جو کسی ادنیٰ مشابہت کے ساتھ بھی ان چاروں عنوانوں کے تحت آسکتے تھے جن کا ذکر حدیث تقرب اور اس کے شروع میں کیا گیا تھا۔ ابھی غوث پاک کے دامن اخلاق وتقدس میں ایسے بے شمار جوہر ہیں جو بجائے خود اخلاقی کرامتیں ہیں۔ آپ خود فرماتے ہیں:

مدتوں میں مدائن کے ویرانوں میں رہا اور مختلف طریقوں سے نفس امارہ کو شکست دینے میں مصروف رہا، اکثر میرا یہ وطیرہ تھا کہ ایک سال غلہ کھاتا اور پانی نہ پیتا، پھر ایک سال پانی پیتا غلہ نہ کھاتا، ایک سال ان دونوں سے پرہیز کرتا۔ اور سوتا بھی نہیں۔ ایک سخت جاڑے کی رات میں ایوان کسریٰ کے ویرانے میں سویا، اتفاق سے چالیس بار احتلام ہوا اور میں نے چالیس دفعہ غسل کیا، پھر بھی کچھ رات باقی تھی۔ نیند کے خوف سے محل کے اوپر چڑھ گیا کہ نیند آئے گی نہ یہ ہوگا۔

مدتوں کرخ کے ویرانے میں رہا، سوائے ہری گھاس کے میری اور کوئی روزی نہ تھی، سال بھر بعد ایک شخص آتا اور کمبل کا جبہ پہنا جاتا اور اس عالم میں لوگ مجھے دیوانہ تصور کرتے تھے۔ ایک دفعہ شیطان میرے آگے آکر متشکل ہوا اور اس نے عیش دنیا کے سیکڑوں جال پھیلا دئے اور بولا: کہ یہ دنیاوی لذتیں ہیں جن سے تم جیسے کو میں شکار کرتا ہوں۔ تو میں اس کی طرف متوجہ ہوا اور سال بھر کی جدوجہد کے بعد ان کی خواہش کا شائبہ بھی اپنے دل سے نکال کر پھینک دیا پھر اس نے خاص تعلقات کو میرے اوپر متشکل کیا جو خاص میری ذات سے متعلق تھے جس میں سکون کے تعلقات اور رشتے تھے، میرے دل کے اختیارات، ارادے تھے اور میری خواہش گھناتی تھی، ان میں سے ہر ایک کے لیے میں نے سال سال بھر مجاہدہ کیا تو پھر میری ذات کا ہر ایک ورشہ منقاد و مطیع ہوگیا اور میری ذات پر خدائے ذوالجلال کی بادشاہی رہ گئی، پھر میں تنہا رہ گیا اور وجود کے لائق سارے کے سارے میرے پیچھے چھوٹ گئے، میں نے از دیاد شوق میں جلوہ قدس کی تاب ناک کرنوں کا وصال چاہا، میں نے توکل کے دروازے سے اسے پانا چاہا لیکن اس پر پہلے ہی سے پروانہ گاہ جمال کی بھیڑ تھی، میں نے اور آگے شکر کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہا،

وہاں بھی شیفتگان قدس کا مجمع تھا، پھر میں نے یکے بعد دیگرے تسلیم ورضا، قرب ونزدیکی مشاہدہ وحضور بھی دریچوں کو جھانکا، دیکھا پرکھا اور جانچا اور ہر جگہ مجمع تھا اس لیے میں آگے بڑھ گیا اور میں نے فقر ومسکینی کا دروازہ دیکھا جو خالی تھا، پس اس سے میں داخل ہو گیا اور میرے اوپر کنز مخفی کھول دیا گیا۔

مقامات تصوف میں یہ تمام منزلیں ہیں جو غوث پاک نے ایک ایک کر کے طے کی ہیں جن میں اور دوسرے شوق کے قافلوں کی زندگیاں صرف ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی حقیقی چاشنی اور اہمیت بھی محسوس کر سکتا ہے جسنے اس خارزار محبت کی ہوا دیکھی ہے، اور یہ غوث پاک (خاک بدہنم) کی بڑھ اور لاف زنی نہیں ہے واقعہ ہے، جس کی شہادت اس وقت کے اولیاے کرام اور ائمہ عظام نے دی ہے، ہم اپنے مضمون کو حضرت امام مفتی عراق ابوعبداللہ محمد بن علی حامدی بغدادی توحیدی کی ایک ایسی شہادت پر ختم کرتے ہیں جو غوث پاک کی زندگی کی ایک سچی تصویر ہے۔ آپ نے ۶۳۶ھ میں فرمایا:

غوث پاک کے آنسو جاری تھے، خشیت ربانی سے رونگٹا رونگٹا لرزتا تھا، لوگوں پر آپ کی باتیں بہت اثر کرتی تھیں۔ دعا آپ کی بہت جلد قبول ہوتی تھی۔ ان کے زمانہ میں ان کا کسی بات میں کوئی ہمسر نہ تھا۔ اور حق سے سب سے زیادہ قریب تھے۔ حرمات الٰہی کی پردہ دری کے وقت ان کی پکڑ سخت ہوتی اور خود اپنی ذات کے لیے بھی غضب ناک نہ ہوتے اور غیر خدا سے مدد نہ مانگتے۔ سائل کو اپنے بدن کا کپڑا تک دے کر سیر نہ ہوتے۔ توفیق الٰہی ان کی رہنما تھی۔ تائید ربانی مددگار، علم شرع نے انہیں سنوارا تھا، اور قرب الٰہی نے انہیں ادب دیا تھا، اور حضور الی اللہ ان کا خزانہ تھا، اور معرفت الٰہی ان کی پشت پناہ۔ خطاب الٰہی ان کا مشیر اور اشارۂ ربانی ان کا راہنما، انس معبود ان کا ساتھی، اور کشادہ روئی ان کے اخلاق کی تعلیم، سچائی ان کا نشان اور فتح ان کی پونجی، بردباری ان کی عادت، اور ذکر وفکر ان کا شیوہ، مکاشفہ ان کی غذا اور مشاہدہ ان کی شفا۔ مختصر یہ کہ آداب شریعت ان کا ظاہر اور اوصاف حقیقت ان کا باطن۔

غوث پاک کے وعظ کی مجلس

۵۲۱ھ لغایت ۵۶۱ھ کسی اتوار کی خوشگوار صبح کو انسانوں کا ایک سمندر بغداد کے باہر موجیں لے رہا تھا، اور تقریباً ستر (۷۰) ہزار انسان زمین کے فرش پر بیٹھے ہوئے تھے، علما بھی مشائخ بھی، امرا بھی روسا بھی، وزرا بھی اور حکامان عالی بھی، غرض یہ کہ ہر طبقہ ہر گروہ کے لوگ بیٹھے ہوئے اپنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ باتوں میں مصروف تھے، سب تھوڑی دیر کے بعد نگاہیں اٹھا اٹھا کر شہر کے راستے کی طرف دیکھ لیا کرتے تھے۔ مجمع کے ایک سرے پر بہت بلند منبر رکھا ہوا تھا جس کی ہر ایک سیڑھی پر دو آدمی بیٹھے تھے، اوپری حصہ خالی تھا لوگوں کو انتظار کرتے ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک باوقار انسان خچر پر سوار مجمع کی طرف آتے نظر پڑے اور وہ جیسے جیسے قریب آتے گئے لوگوں میں سکون واطمینان کی لہر دوڑتی گئی، جسم میں علما کا شاندار جبہ اور دوش پر قیمتی چادر تھی، جیسے ہی وہ مجمع کے اندر آئے پورا مجمع سروقد کھڑا ہو گیا اور وہ جب منبر کے اوپری حصہ پر اطمینان سے بیٹھ گئے لوگوں کو ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور فرمایا خاموش ہو جاؤ، یہ سنتے ہی سارے مجمع پر سکوت مرگ طاری ہو گیا جس میں صرف سانسوں کی آمد ورفت صاف سنائی دیرہی تھی، اسی عالم میں تھوڑی دیر گذری ہوگی کہ سارے مجمع میں خود بخود ایک شور محشر بپا ہو گیا۔ اور وجد واضطراب کی شدت سے فضا تار تار ہونے لگی، صاحب منبر بزرگ نے ایک حیرت زدہ چہرے کو دیکھ فرمایا: شیخ صدقہ تم اپنے دل میں یہی تو سوچ رہے ہو کہ قاری نے کچھ پڑھا نہیں اور نہ میں نے ہی کچھ پڑھا پھر ساری محفل آپے سے باہر کیوں ہوتی جارہی ہے، ابھی ابھی میرا ایک مرید بیت المقدس سے یہاں صرف ایک قدم آیا ہے، یہ ساری محفل اس کی فیض باطنی سے جھوم رہی ہے، وہ میرے ہاتھ پر توبہ کرنے آیا ہے۔ اب تو تم یہ حیرت کر رہے ہو کہ جو بیت اللہ المقدس سے یہاں ایک قدم میں آئے گا۔

وہ توبہ کس چیز سے کرے گا، جو ہوا میں اڑتا ہے وہ اس لیے توبہ کرنے آتا ہے کہ پھر پستی میں سنگریزے اڑائے، خدا سے محبت کرنے کا طریقہ سکھائے، شیخ صدقہ کا چہرہ ندامت سے

غرق غرق تھا اور اس مجلس کا جوش حد سے بڑھ گیا تھا، آپ نے اشارے سے سب کو ٹھنڈا کیا اور ساری محفل پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی لیکن طبقۂ علما کو ذرا تیز تیز دیکھا اور اپنا سر جھکا لیا، تو لوگوں نے ہوشربا نظارہ اپنے لپیٹ میں لے لیا، بس نہ پوچھئے ان کے اضطراب کا عالم، تھوڑی دیر تو سب مبہوت رہے اور پھر سر پیٹ لیا، کپڑے پھاڑ ڈالے اور شدت کرب سے ایک ساتھ چیخنے لگے، کسی نے ان میں سے ایک سے پوچھا یہ کیا حال ہے؟ کہنے لگا: ہم سب آج شیخ کی علمیت کا امتحان لینے کی غرض سے آئے تھے کہ دوران وعظ میں اعتراض کریں گے مگر ان کی ایک ہی تابش جمال نے ہمارے خرمن علم و دانش کو جلا ڈالا اور ہم سارا پڑھا لکھا بھول گئے، پھر سب کے سب بے قرارانہ منبر کی طرف دوڑے اور شیخ کے قدموں پر سر رکھ دیا، آپ نے سب کو اٹھا کر سینے سے لگایا تو یکے بعد دیگرے سب کو قرار آتا گیا، شاید چھنی ہوئی دولت واپس مل گئی تھی، یہ دیکھ کر ساری محفل جھوم اٹھی اور ایک شور مبہم سے محفل کا سکوت درہم برہم ہو گیا، پھر جب محفل اعتدال پر آئی تو آپ نے ہر ایک کے سوال کو بیان فرمایا اور پھر خود ہی سب کا جواب عنایت فرمایا:

اتنے میں مجلس کے ایک گوشے سے ایک عیسائی راہب اٹھ کر کھڑا ہوا جس کے سج دھج سے حضرت مریم کا تقدس اور جناب مسیح علیہ السلام کی پارسائی جلوہ گر تھی۔ کھڑے ہو کر اس نے کہا میں یمن کا راہب ہوں، میرے دل میں اسلام کی خواہش مدتوں سے کروٹ لے رہی تھی، مگر یہ سوچتا تھا کہ میں کسی ایسے شخص کے ہاتھ پر ایمان لاؤں گا جو سارے یمن میں مقدس اور برگزیدہ ہو، اس ادھیڑ بن میں ایک روز مجھے نیند آ گئی تو میں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو دیکھا کہ فرما رہے ہیں سنان! تم شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمت میں جاؤ، آج یمن اور بغداد تو کیا پورے روئے زمین پر ان سے اچھا کوئی نہیں ہے، یہ سن کر میں آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوں، آپ مجھے اسلام سے بہرہ مند فرمائیں، ساری محفل میں ایک دفعہ پھر وجد و طرب کی لہر دوڑ گئی اور دھیمی آوازوں سے فضا آہستہ آہستہ کانپنے لگی۔

آپ نے بلند آواز سے فرمایا:

اے راہب یمن! میرا کلام سننے کو وہ قاف کے پرے سے ایسے لوگ آتے ہیں جو خود تو

فضا میں اڑتے ہیں، لیکن ان بارگاہ قدس کی بجلیوں میں محو رہتے ہیں اور وہ قریب ہے کہ ان کے دل کی آگ ان کے کپڑوں سے شعلہ دینے لگے۔

یہ سن کر آپ کے صاحبزادے عبدالرزاق نے جو منبر کے پاس بیٹھے تھے نگاہیں اوپر اٹھادیں، تھوڑی ہی دیر میں بے ہوش ہوکر گر پڑے اور ان کا لباس خود بخود بھمک اٹھا، شیخ نے خود منبر پر سے اتر کر بجھائی اور فرمایا عبدالرزاق تم بھی انہیں لوگوں میں سے ہو۔

حضرت عبدالرزاق کو جب ہوش آیا تو کہنے لگے: یہ کون لوگ تھے جن سے فضا کھچا کھچ بھری ہوئی تھی کوئی کانپ رہا تھا کوئی رو رہا تھا۔ کوئی زمین کی طرف گر رہا تھا، کتنے کے منہ سے چیخ بلند ہورہی تھی، اور بہتوں کے لباس دھڑ ادھڑ جل رہے تھے۔ آپ نے ابوالفتح عمر ہاشمی کو آواز دی وہ آئے اور قرآن عظیم کی چند آیتیں تلاوت کیں شیخ کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور فرمایا: ابوالفتح تم کو ہم خدا سے مانگ لیں گے۔ گویا اب جلسہ کی کاروائی باقاعدہ شروع ہوگئی اور آپ نے خطبۂ وعظ شروع کیا الحمد لله رب العلمین کہہ کر خاموش ہوگئے پھر دوبارہ وہی کلمہ دہرایا اور خاموش ہوگئے، پھر تیسری بار بھی یہی ہوا اور اب آپ نے روانگی کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، حمد رب العالمین کے لیے، جتنی مخلوقات ہیں ان کے برابر، عرش الٰہی کے وزن کے برابر، ایسی حمد جس سے وہ خود راضی ہو، اس کے کلمات کی حق دار اس کے علم کے موافق اور اس کی مشیت کے مناسب، اس خدا کی حمد جو عالم الغیب والشہادہ ہے، رحمٰن و رحیم ہے، پاک ہے اور غالب حکمت والا ہے، میں اس کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہوں جو یکتا و بے ہمتا ہے، جس کے لیے حمد ہے، جس کے قبضہ قدرت میں بھلائی ہے اور جو سب کچھ کرتا ہے، اور اس نبی برحق کی رسالت کا اقرار کرتا ہوں جس کو خدائے ذوالجلال نے اس لیے بھیجا کہ دین حنیف کو تمام مذہب پر غالب کردے۔ پھر آپ داہنی طرف پھر گئے اور آپ نے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ پڑھا، پھر سامنے یہی کلمات دھرائے اور پھر بائیں بھی اور پھر آپ نے جو کلام شروع کیا تو عجیب انداز، ابھی آپ زہد پر وعظ فرما رہے تھے کہ ابھی معرفت کے وسیع میدان میں اشہب کلام دوڑانے لگے، پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد رخ بدل کر راز دیار شوق کی گتھیاں سلجھائی جانے لگیں، اور تھوڑی ہی دیر میں فنا وبقا

کے چہروں سے نقاب اٹھنے لگی۔ پھر جب آپ نے غیب وحضور کے رموز واسرار بیان فرمائے تو کہنے لگے: ابوالحسن بس تمہارے لیے اتنا ہی کافی ہے (قصہ یہ تھا کہ کنارے مجلس پر بیٹھے ایک صاحب اپنے دل میں یہ سوچ رہے تھے کہ آپ اس موضوع پر بولیں پھر اس معنی کی تشریح کریں اور اب اس کی) پھر آپ نے ایک خاص انداز میں کہنا شروع کیا۔

میری تلوار مشہور ہے، میری کمان کھینچی ہوئی ہے، میرا تیر خطا نہیں کرتا، اور میرا گھوڑا بے زین ہے، میں عشق الٰہی کی بھڑکتی ہوئی بھٹی ہوں، حالتوں کو سلب کرنے والا ہوں، میں اتھاہ ساگر ہوں اور میں اپنے وقت کا رہنما ہوں۔

سب لوگ فرط دہشت اور ازدیاد خشوع سے آئینہ بنے ہوئے تھے کہ ایک نہایت حسین پرندہ اڑتا ہوا مجمع سے گزرنے لگا تو کچھ لوگوں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا، آپ کو اتنی بے توجہی بھی گراں گزری فرمایا: عزت الٰہی کی قسم اگر میں

اس پرندہ کو کہ دوں کہ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑ تو ایسا ہی ہوگا۔ اور فی الحقیقت وہ پرندہ پارہ پارہ ہوکر گر پڑا۔ آپ نے سلسلہ کلام اس طرح جاری رکھا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اے روزہ دارو! شب بیدارو! اے پہاڑوں میں رہنے والو تمہارے پہاڑ ڈھ جائیں، اے گرجا میں بسنے والو تمہاری عمارتیں پست ہو جائیں، آؤ آؤ امر الٰہی کے آگے، آؤ میرا حکم بھی خدا ہی کی طرف سے ہے، اے ابدالو، اے اوتادو، اے پہلوانو، نیز اے بچو آؤ ولایت یہیں ہے، درجات یہیں ہیں، اے توبہ کرنے والو بسم اللہ، اے معافی چاہنے والے بسم اللہ، آ اے اخلاص کے خواستگار بسم اللہ، آ ہفتہ میں ایک بار آ، نہ ہو سکے تو ماہ میں آ، اور یہ بھی بس سے باہر ہے تو ایک سال میں آ، آ تو سہی عمر میں ایک بار ہی آ، اور آتے ہوئے اپنے کو نہ دیکھ تا کہ تجھے تیری قسمت کا حصہ ملے یک بیک دو تین قدم آپ ہوا میں چلے اور فرمایا: یا اسرئیلی واسمع کلام محمدی ،اے اسرائیلی ٹھہر و اور محمدی کا کلام ہی سنو اور پھر واپس آکر مجمع میں فرمایا: ابوالعباس حضرت خضر بڑی سبک رفتاری سے گزرنا چاہتے تھے میں نے ان کا دامن تھام لیا، مجلس کا جوش دمبدم بڑھتا جا رہا تھا اور آپ فرما رہے تھے۔

عزیزو! قلب سلیم چاہتے ہو کہ فاعتبروا یااولی الابصار کے بھید پر اطلاع ملے اور کامل عقل تاکہ سنریھم ایاتنا فی الافاق وفی انفسھم کا راز آشکار ہو اور سچا یقین، تاکہ دل کی نگاہ سے "وان من شئ الایسبح بحمدہ" کی تجلی دیکھے اور اس بارگاہ بلند کی طرف "واذا سئلک عبادی عنی فانی قریب" کے اسباب سے متوجہ ہو اور "افحسبتم انما خلقناکم عبثا" سے متنبہ کرنے والے نگہبان سے سب لے کر "یلھھم الأمل" کے خواب گراں سے بےدار ہو "ومالکم من دون اللہ من ولی ولانصیر" کے بلند کنگرہ کو مضبوطی سے تھام۔ ففروا الی اللہ کی کشتی پر سوار ہو اور "وماخلقت الجن الانس" کے دریائے معرفت میں مردانہ وار غوطہ زن ہو، اگر گوہر مقصود ملا تو سبحان اللہ فقد فاز فوزا عظیما اور اگر اس راہ طلب میں جان گئی تو فقد وقع اجرہ علی اللہ ع

دائم نیست کہ خالی ز گل تر باشد

آخر میں آپ نے فرمایا: بات ختم ہوئی اور حال کی طرف ہم لوٹے، اتنا سننا تھا کہ محفل میں دہائی مچ گئی، کسی نے روتے روتے برا حال کرلیا، کوئی گریبان پھاڑ جنگل کی طرف نکل گیا، اور کوئی بے ہوش ہو کر جان بحق ہو گیا، ادھر فضا میں ایک شور محشر بپا تھا آہ وزاری شور میں مردان غیب کے اوپر سے زمین پر گرنے کی آواز ہر کان محسوس کررہا تھا، جب آپ منبر سے اترے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے تو کئی جنازے بھی آپ کی مجلس وعظ سے اٹھائے گئے، اسی شان کے ساتھ چالیس سال تک وعظ فرمایا: رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت خواجہ
نظام الدین اولیا
رحمۃ اللہ علیہ

۶۳۲ھ ۷۲۵ھ

مسلمانوں میں صوفیائے کرام کا مقدس گروہ دین کی حقیقی روح سے آشنا اور اسلامی نظام کو اپنی زندگی میں برپا کرنے والا متبرک طائفہ ہے، تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے اس پاک راہ پر گامزن ہو کر نہ صرف اپنے دل کو جلا بخشی، اعمال کو سنوارا اور اخلاق سے آراستہ کیا، بلکہ مخلوق خدا کے ایک بڑے طبقہ کو ایمان کی حرارت اور اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے سرشار کیا۔ یہ انہیں کی آہ سحرگاہی، اور دعائے نیم شبی کی تاثیر تھی کہ وہ جہاں بیٹھ گئے۔ بنجر زمین تھی تو پھول کھل اٹھے اور دھرتی میں اللہ تعالیٰ کے نور کا اجالا پھیل گیا۔ واشرقت الارض بنور ربھا. پوری زمین اپنے رب کے نور سے جگمگا اٹھی۔

خصوصیت کے ساتھ غیر منقسم ہندوستان میں تو اسلام کی اشاعت و تبلیغ، خداشناسی اور روحانی اقدار کی نشر واشاعت میں پادشاہوں کی تلواروں، ان کے اقتدار اور اثر ورسوخ نے وہ کام نہیں کیا جو صوفیائے کرام کے میٹھے بول اور اونچے آدرشوں نے کیا۔ مسلمان ہندوستان میں اشاعت اسلام کے لیے اس مقدس گروہ کے سرتاسر رہین کرم ہیں۔

ان نفوس قدسیہ کو دنیا سے گئے ہوئے صدیاں بیت گئیں، لیکن ان کے جلائے ہوئے چراغ آج بھی تاریکیوں کے لیے موت کا پیغام بنے ہوئے ہیں۔ ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات آج بھی روح کو حرارت، حیات کو تابندگی اور معاشرے کو نکھار بخش رہے ہیں۔ آج بھی

ان کے اقوال پڑھ کر روح کانپ اٹھتی ہے۔ دل میں اللہ ورسول کی محبت موجزن ہوجاتی ہے۔ دنیا کی نفرت اور اعمال خیر کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

خیال ہوا کہ ایسے قدسی بزرگوں کے مختصر تعارف کے ساتھ ان کے حکمت بھرے پرتاثیر اقوال سے اپنے دینی بھائیوں کو بھی متعارف کرایا جائے۔ وماتوفیقی الاباللہ۔

نام ونسب: نام محمد، القاب محبوب الٰہی۔ سلطان المشائخ، سلطان الاولیا، نظام الدین اولیا والد کا نام احمد اور دادا کا نام علی ہے، آپ حسینی سادات سے تھے۔ دادا بخارا سے ہندوستان آئے، کچھ دن لاہور رہے پھر "بدایوں" میں اقامت گزیں ہوگئے۔

ولادت اور پرورش: بدایوں میں ہی صفر ۶۳۶ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، پانچ سال کی عمر میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اور والدہ نے آپ کی تربیت فرمائی اور اسی تربیت کا اثر تھا کہ آگے چل کر رشد وہدایت کے افق پر آفتاب وماہتاب بن کر چمکے۔ خود فرماتے ہیں: بچپن میں ہمارے گھر اکثر فقر وفاقہ رہتا جس دن ہمارے گھر کھانے کو کچھ نہ ہوتا والدہ صبح ہی فرمادیتیں "بابا نظام! امروز ما مہمانایان خدایم" بیٹے نظام آج ہم خدا کے مہمان ہیں۔

آہستہ آہستہ آپ کو والدہ گرامی کے اس جملہ میں ایسی لذت محسوس ہونے لگی کہ فرماتے ہیں: "میرے کان اس بات کے انتظام میں رہتے کہ والدہ مکرمہ کب خدا کی مہمانی کا مژدہ سناتی ہیں۔ اگر کوئی ہفتہ کھاتے ہوئے گزرتا تو مجھے افسوس ہوتا کہ اس ہفتہ والدہ نے کسی دن خدا کی یہ مہمانی کی بشارت نہیں دی"

تعلیم: آپ کے اساتذہ میں مولانا علاء الدین اصولی بدایونی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ جن سے آپ نے قدوری ختم کی، مولانا شمس الدین ومغانی جو آپ کے مقامات حریری کے استاذ ہیں۔ اور مولانا کمال الدین زاہد (رحمہما اللہ) جن سے آپ نے مشارق الانوار کا درس لیا جو غیر معمولی شہرت وعظمت کے مالک ہیں۔

پانچ سال کی عمر میں قرآن عظیم شروع کیا۔ اور ۱۲ رسال کی عمر میں لغت اور قدوری جس کا ذکر اوپر آیا ختم کیں اور وہیں آپ کے استاذ مولانا علاء الدین نے آپ کے جلسہ فراغت کے

لیے بدایونی علما و مشائخ کا اجتماع کیا۔ والدہ نے ایک رسی بٹ کر تیار کر رکھی تھی جسے ان بزرگوں نے اپنے ہاتھ سے آپ کے فرق مبارک پر لپیٹا۔ اور فرمایا: اس لڑکے کا سر آئندہ کسی انسان کے آگے خم نہ ہوگا جس کا ظہور اس طرح ہوا کہ آپ کے عہد مبارک میں دلی کے تخت پر یکے بعد دیگرے ۵ شہنشاہ ہوئے، کوشش کے باوجود نہ تو کوئی آپ کو آپ کے موقف سے ہٹا سکا، نہ آپ کو اپنے دربار میں بلا سکا، نہ خود ہی آپ کی خدمت میں باریاب ہو سکا۔ ایک دفعہ سلطانی دربار میں جو مناظرہ ہوا تھا اس کی بات علیحدہ ہے۔

مزید حصول علم کے لیے دلی تشریف لے گئے جو اس وقت علما و مشائخ کا مرکز تھا اور مولانا شمس الدین صدر ولایت اور مولانا کمال الدین زاہد سے اکتساب فیض کیا۔ دلی میں آپ کے زور استدلال اور طاقت لسانی سے متاثر ہو کر طلبہ نے آپ کا لقب مولانا نظام الدین بحاث مجلس شکن رکھا تھا۔ سبحان اللہ۔ ع

جس سمت چل دیے ہیں سکے بٹھا دیے ہیں

بیعت و ارادت: اپنے دور طالب علمی سے ہی حضور بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر سن رکھا تھا، غائبانہ شوق و محبت اور ان کی طرف میلان قلب تھا ہی۔ ایک دن شہر کی جامع مسجد سے کسی نے صبح صبح ہی آیت مبارکہ **الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم لذکر الله.** کیا مومنوں کے لے خدا کے ذکر سے دل نرم ہونے کا وقت نہیں آیا۔ یہ سنتے ہی شوق میں دبی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھی اور ”اجودھن“ شیخ کی خدمت میں پہونچے، وہاں شیخ کو خود اپنا بھی مشتاق پایا۔ بابا صاحب نے انہیں دیکھتے ہی یہ شعر پڑھا:

اے آتش فراقت دلہا کباب کردہ　　　سیلاب اشتیاقت جانہا خراب کردہ

ترجمہ: تمہاری جدائی کی آگ نے دل کو کباب کر دیا اور شوق کے سیلاب نے جان کو ویران کر دیا۔ اور اپنے سر سے کلاہ چہار ترکی اتار کر نظام الاولیا کے سر پر رکھ دی۔

لگ بھگ نو ماہ حضرت شیخ کی خدمت میں رہے۔ عوارف المعارف اور تمہید ابوشکو سالمی حضرت بابا صاحب سے پڑھی۔ دوران درس کا یہ واقعہ آج معلم اور متعلم دونوں کے لیے سرمایہ

عبرت و بصیرت ہے۔

ایک دن کتاب کا کوئی حرف بوسیدگی اور بد خطی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ادھر بابا صاحب کی ضعف بصارت کی وجہ سے صاف پڑھا نہ جا رہا تھا۔ حضرت نظام الدین اولیا رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پیر پر مسابقت کر کے کہا: حضرت اس کتاب کا ایک عمدہ نسخہ میں نے فلاں شخص کے پاس دیکھا ہے، اس میں یہ لفظ اس طرح لکھا ہے جو صحیح معلوم ہوتا ہے۔ حضرت بابا صاحب قدس سرہ العزیز گالی دینے والوں کو دعا دیتے اور اذیت پہونچانے والوں کو انعام سے نوازتے، لیکن یہ مسابقت چوں کہ طریقہ ارادت وارشاد کے خلاف تھی کہ "استاذ سے زیادہ مجھے معلوم ہے" آپ نے ناگواری سے کتاب بند کردی اور فرمایا: "فقیر را طاقت اصلاح نسخہ فاسدہ نیست" نسخہ فاسدہ کی درستی کا فقیر کے پاس علاج نہیں۔ اور درس وارشاد کا سلسلہ ختم کر دیا۔

حضرت نظام الدین اولیا فرماتے ہیں: کہ شیخ کی اس بے التفاتی نے میری دنیا ہی تاریک کردی، زندگی بے فائدہ نظر آئی اور جی چاہتا کہ کسی پہاڑی سے چھلانگ لگا کر یا کنویں میں ڈوب کر زندگی ختم کر دوں۔ خیر بڑی منت وسماجت، سعی وسفارش، توبہ وانابت کے بعد آپ نے دوبارہ چشم التفات ومرحمت خسروانہ سے نوازا۔

ارادت کے بعد ایک شخص بالکلیہ اپنے پیر کی ہدایت کا پابند ہوتا ہے، چنانچہ آپ نے ایک دن حضور بابا صاحب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں عرض کی: حضور میں نے علم ظاہر بھی حاصل کیا ہے، اس کا شغل بھی جاری رکھوں یا اب اسے چھوڑ کر سارا وقت ذکر وفکر ومراقبہ ومجاہدہ میں صرف کروں۔

بابا صاحب نے فرمایا: فقیر ہیچ راز یں ہاں منع نمی کند ایں ہم کن آں ہم کن تا یکے از ایں ہا غالب آید" فقیر ان دونوں میں سے کسی سے روکتا نہیں یہ بھی کرتے رہو اور وہ بھی کرتے رہو۔ ان دونوں میں جو طاقت ور واقع ہوگا دوسرے پر غالب آجائے گا۔ آخر دنیا نے غالب کے غالب ہونے کی ساعت بھی دیکھ لی۔ اسی نو ماہ مدت میں آپ نے فقر وفاقہ، ذکر وفکر، مراقبہ، مجاہدہ، عبادت وریاضت، کشف وشہود، ترقی درجات اور حصول قرب کی ساری منزلیں طے

فرمالیں۔اور نظام الدین سے محبوب الٰہی اور نظام الدین اولیا بن گئے۔

صد سالہ دور چرخ تھا ساغر کا ایک جام نکلے جو مے کدہ سے تو دنیا بدل گئی

لیل ونہار: (۱) تمام عمر صائم الدھر رہے۔ افطار آدمی یا ایک روٹی سبزی یا تلخ کریلے سے کرتے، سحری کے وقت کوئی چیز لائی جاتی، تو کچھ چکھ لیتے اور بقیہ کو لوگوں میں تقسیم کرنے کا حکم دیتے۔ خادم جب عرض کرتا: اس وقت بھی کچھ تناول نہ فرمائیں گے تو کمزوری آجائے گی۔ تو رو رو فرماتے

چندین مسکیناں و درویشاں در کنجہائے مسجد

ودوکاناں گرسنہ وفاقہ زدہ اند ایں طعام در حلق من چگونہ فرو رود

ترجمہ: اتنے مسکین اور فقیر مسجدوں اور دوکانوں کے گوشہ میں بھوکے اور فاقہ زدہ ہیں، یہ کھانا میرے حلق سے کیسے نیچے اترے گا۔ اور حالت یہ تھی کہ دسترخوان پر انواع واقسام کی نعمت دوسروں کے لیے ارمغاں تھی اور انہیں تاکید کر کے کھلاتے اور ہر ایک سے ذائقہ دریافت کرتے کہ عمدہ تو ہے؟۔

(۲) دن رات ملا کر چار پانچ سو رکعتیں نماز پڑھتے۔ جماعت کا التزام یہ تھا کہ اسی (۸۰) سال کی عمر میں پانچوں وقت بالا خانہ سے اتر کر نماز باجماعت پڑھتے۔

نظام الاوقات: روزانہ فجر اشراق وچاشت کے بعد جماعت خانہ میں بیٹھ کر رشد وہدایت فرماتے۔ اس وقت تمام علما صلحا اور صوفیا کا اجتماع ہوتا۔ اور آپ سلوک معرفت کے حقائق ودقائق بیان فرماتے۔ نماز ظہر سے قبل قیلولہ فرماتے اور بعد نماز پھر مجلس ہوتی، اس مجلس میں علمی نکات بیان فرماتے، احادیث اور دیگر کتب کا درس دیتے اور سننے والے نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ سر جھکا کر سنتے، گویا الہامی کلام سے فیض پا رہے ہیں۔ بعد نماز عصر کوٹھے پر جاتے، نماز مغرب کے لیے نیچے آتے، روزہ افطار کرتے اور نماز کے بعد پھر کوٹھے پر جاتے۔ وہاں بھی ایک مجلس ہوتی جس میں حاضرین کی تواضع میووں اور لطیف مشروبات سے کی جاتی۔ نماز عشا کے لیے پھر نیچے آتے اور بعد نماز عشا کوٹھے پر حجرے میں چلے جاتے۔ اس وقت امیر

خسرو آتے کچھ حکایتیں سناتے، آپ لطف ولذت کے ساتھ سنتے، امیر خسرو کے رخصت ہونے کے بعد خادم وضو کا پانی لاتا۔ وضو کے بعد حضرت محبوب الٰہی خود اٹھ کر دروازہ بند کر دیتے پھر اندر کیا ہو رہا ہے کون جانے۔ صبح ہوتی تو لوگ دیکھتے غیر معمولی کیف و مستی، بے خودی اور وارفتگی۔ پوری رات بے داری سے آپ کی آنکھیں سرخ رہتیں۔

امیر خسرو علیہ الرحمہ نے آپ کی انہیں واردات کے بارے میں یہ شعر کہا ہے:

تو شبانہ می نمائی بہ کسے کہ بودی
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار داری

رات آپ کس کے ساتھ مصروف راز و نیاز رہے، آپ کی مست آنکھوں میں خمار کی سرخی شب بیداری کا پتہ دے رہی ہے۔

داد و دہش: حضرت نے اپنے لیے دنیا جس قدر تنگ فرمالی تھی اس کا حال آپ کے لیل ونہار کی تفصیل سے واضح ہو چکا ہے، امرا اور بادشاہوں کے تحفوں پر فرماتے: "یہ لوگ جگان ومشائخ ماہیچ کس از یں قبول نہ کردہ است" ہمارے مشائخ میں سے کسی نے جاگیریں قبول نہیں کی ہیں۔ پھر بھی مریدوں معتقدوں کی نیاز مندیوں سے روزانہ آپ کی خدمت میں دولت کا انبار لگا رہتا، لیکن اسے اپنی ذات کے لیے قبول نہیں کرتے بلکہ شام تک سب کا سب ضرورت مندوں اور سائلوں حاضرین وواردین کو دے دیتے۔

روایت ہے کہ حضرت محبوب الٰہی کا مطبخ ہمیشہ گرم رہا۔ کئی ہزار فقرا و مساکین روزانہ مطبخ میں کھانا کھاتے۔ روزانہ خانقاہ میں آنے والے تحف وہدایا تقسیم کر دیئے جاتے، کسی دن جمع شدہ چیزوں پر آپ کی نگاہ پڑتی، تو رونے لگتے، قیمتی چیزیں ہوتیں تو اور آہ وبکا کرتے۔ اور خادموں کو حکم دیتے۔ جلد از جلد انہیں تقسیم کر دیا جائے۔ خادم فوراً حکم کی تعمیل کرتے، تب آپ کو مسرت حاصل ہوتی، گویا آپ کے سر سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے۔ جمعہ کے دن تمام حجروں، انبار خانوں میں جھاڑو لگوا دیتے (یکسر خالی کرا دیتے) اس کے بعد اطمینان سے نماز جمعہ ادا فرماتے۔

حلم و بردباری: آپ کا دبدبہ بادشاہوں سے کم نہ تھا۔ اور خلق کا مرجع تو آپ

کی طرف بادشاہوں سے بھی زیادہ تھا ایک بادشاہ نے آپ کو لکھا کہ۔

وقتیکہ مادر دہلی بیایم شما از غیاث پور بیروں روید کہ بسبب سکونت شما کثرت مردم از بس آں جاں باشد و جائے برائے متوسلان بادشاہی نمی ماند۔

ترجمہ: جب میں دلی پہونچوں تو آپ غیاث پور سے باہر چلے جائیں، آپ کی وجہ سے وہاں آدمیوں کی غیر معمولی بھیڑ رہا کرتی ہے اور بادشاہ کے متوسلین کے لیے جگہ نہیں مل پاتی۔

اور خدام و مریدین تو آپ پر جان چھڑکتے تھے۔ کس کی مجال تھی کہ کوئی آپ کو برا کہے اور آپ کی شان میں آپ کے منہ پر یاوہ گوئی کرے، لیکن واقعات ایسے بھی ہیں۔

کہ ایک روز ایک جواتقی آیا اور آپ کو گالیاں دینے لگا۔ حضرت نہایت صبر ضبط سے سنتے رہے۔ بلکہ اس نے جو مانگا آپ نے اسے دیا۔ اور حاضرین سے فرمایا: میرے پاس بہت سے لوگ آتے ہیں۔ نیاز مندی سے نذر پیش کرتے ہیں تو کچھ ایسے لوگوں کو بھی تو آنا چاہیے جو مجھے برا کہیں اور مجھ سے مانگ کر لیں جائیں۔

ایک پر لطف واقعہ آپ کے تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے۔ آپ کا ایک پڑوسی بلاسبب آپ کا دشمن اور آپ کی ایذا رسانی پر مستعد رہتا تھا اور آپ کو گالیاں بکتا۔ چوں کہ مفلس تھا۔ آپ ہر ماہ ازراہ ذرہ نوازی ایک معقول رقم اس کے گھر بھجوا دیتے، ایک دن اس کی بیوی نے اسے ملامت کی اور کہا تم روزانہ انہیں کا دیا کھاتے ہو، اور ہر دم انہیں کو برا کہتے اور گالیاں بکتے ہو، تم سے بھی زیادہ بدطینت اور احسان فراموش دنیا میں شاید ہی ہو۔ بات اس کے دل میں اتر گئی اور اپنے اس عمل سے تائب ہو کر حضرت کا نیاز مند بن گیا۔ حضرت کو اسکے طرز عمل کی اطلاع ہوئی تو آپ نے اس کا ماہانہ روک لیا۔ وہ خدمت میں آیا اور عرض کرنے لگا: حضور جب تک میں آپ کو گالیاں دیتا تھا تو آپ پابندی کے ساتھ میرے گھر ماہانہ بھجواتے تھے۔ اور اب جب اپنی اس حرکت سے توبہ کر لی ہے تو آپ کی عنایت سے محروم ہو گیا ہوں۔ آپ نے ہنس کر فرمایا: بھائی ہم پہلے جو کچھ تم کو بھیجتے تھے، وہ مفت تھوڑی ہی بھیجتے تھے، تم ہماری مزدوری کرتے تھے۔ تو ہم معاوضہ دیتے تھے، اب تم نے مزدوری ختم کردی تو ہم نے معاوضہ بھی ختم کر دیا۔ پھر اس کا مطلب بھی

سمجھایا، تم ہم کو گالی دے کر ہمارے ثواب میں اضافہ کرتے تھے۔ کہ جتنی دیر تم گالی دیتے تھے فرشتہ رحمت اتنی دیر تک ہمارے لیے دعا خیر کرتا۔ گالی دے کر ایک طرح سے تم ہمارے فائدے کے لیے کام کررہے تھے۔ اب تم نے وہ موقوف کردیا۔ تو جب تمہارا کام ختم، ہمارا دام بھی ختم۔

اس واقعہ اور پھر اس پر حضرت کے اس ارشاد پر میں جتنا غور کرتا ہوں لطف میں اضافہ ہوتا ہے۔

(۱) اس سے حضرت کی عدیم المثال بردباری کا پتہ چلتا ہے۔ بدم گفتی وخرسندم نکو گفتی، عفاک اللہ۔ تم نے مجھے برا کہا اور میں خوش ہوں۔ تم نے اچھا ہی کیا اللہ تجھے معاف کرے۔

(۲) گالی سن کر معاف کرنے کا نظریہ اگر درست ہے، اور گالی کھانا اجر وثواب کا اگر کام ہے تو اس کا تقاضا تو یہ ہے کہ گالی سن کر انقباض کے بجائے گالی دینے والے کا احسان مند ہونا چاہئے۔ پر آج کی عملی دنیا میں کتنے لوگ اس ایمانی تقاضے پر عمل کرتے ہیں؟ یہ حضرت محبوب الٰہی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں جنہوں نے اس کا عملی ثبوت پیش کیا۔

(۳) شریعت نے اس امر کی اجازت دی ہے کہ بدگویوں اور عزت سے کھیلنے والوں کو کچھ دے کر ان کی دہن دوزی کی جائے، حضرت نے بھی ایک یادہ گو کے ساتھ مسلسل سلوک کیا۔ سوچا جا سکتا تھا کہ شاید محبوب الٰہی کے اس عمل کا مقصد بھی یہی رفع شر ہو، تو آپ نے واضح فرمادیا کہ مقصد تو کچھ اور ہی ہے۔

بڑے بلند نظر ہیں تیرے شہید جمال وہ اور ہوں گے جنہیں ہے تلاش جلوۂ حور

رشد وہدایت کی ایک نادر مثال

(۴) جب تک وہ شخص آپ سے دور ونفور رہا، آپ صلہ وستائش سے بے پرواہ ہوکر اسے دیتے رہے، تا کہ یہ ہدایت پائے۔ کہ نیکی سے دوسرے فوائد حاصل نہ ہوں تب بھی کوئی پرواہ نہیں نیکی خود ایک بلند مقصد ہے۔ دوسری ہدایت یہ کہ اخلاص کے بیج رائیگاں نہیں جاتے۔ آدمی کو زمین کی شوریت سے شکست خوردہ نہیں ہونا چاہیے۔ اخلاص کے بیج بوتے رہنا چاہیے، روئیدگی عطا فرمانے والا پروردگار ہے۔ تیسری ہدایت یہ کہ گالی سن کر صبر کرنا، اعلیٰ کردار ہے لیکن

انعام عطا کرنا اور بلند مقام ہے۔ چوتھی ہدایت یہ ہے کہ اللہ والے، دوستوں اور دشمنوں دونوں کو ہی بے غرض عطا کرتے ہیں۔

چہ دشمن بریں خوان یغما چہ دوست

(۵) اور جب وہ آپ کی بے غرض داد و دہش سے متاثر ہو کر آپ کے قریب آیا تو آپ نے اس کو اپنی راہ پر لا ڈالا۔ کہ اصل زندگی یہ ہے کہ فقر و فاقہ میں بھی آدمی اپنی روح کی پوری توانائیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔

عشق رسول: وصال سے کچھ دنوں پہلے، حضور ﷺ کو خواب میں دیکھا کہ آپ فرماتے ہیں "نظام تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق ہے، بیدار ہوتے ہیں بے قراری بڑھ گئی۔ وصال کے ۴۰ ریوم قبل سے ہی کھانا پینا چھوڑ دیا، برابر روتے رہتے۔ کھانے کے لیے زیادہ اصرار کیا جاتا تو فرماتے:

کسے کہ مشتاق حضرت رسالت ﷺ باشد او طعام دنیا چگونہ فرو برد۔" جو رسول اللہ ﷺ کا مشتاق ہو۔ دنیا کا کھانا اسے کیسے خوشگوار معلوم ہوگا۔

وہ اپنے کو کہا جاتا تو فرماتے:

دردمند عشق را دارو بجز دیدار نیست

محبت کے مریض کی دوا تو صرف دیدار محبوب ہی ہے۔

ایک وقت کی نماز کئی کئی بار پڑھتے اور فرماتے: ع

می رویم و می رویم و می رویم

آخر ۸ ر ربیع الاول ۷۲۵ھ طلوع آفتاب کے وقت محبوب حقیقی سے جا ملے۔ جنازہ اٹھا تو لوگوں نے یہ دو اعی اشعار آپ کے جنازے پر ادا کیے:

سرو سیمینا بصحرا می روی ☆ سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہ عالم روئے تو ☆ تو کجا بہر تماشا می روی

ترجمہ: اے سرو قدس جیسے نازنیں بدن آپ ویرانے میں تشریف لے جارہے ہیں؟۔

سخت بے مروتی ہے کہ ہم کو چھوڑ کر اکیلے اکیلے ہی تشریف لے جارہے ہیں، سب تو آپ کو دیکھتے آتے تھے۔آپ کس کو دیکھنے جارہے ہیں۔

آپ زندگی بھر مجرد رہے شادی نہیں کی، اس لیے ظاہری اولاد کوئی نہیں، لیکن آپ کے آثار وبرکات سے ایک عالم معمور ہے۔اور آپ کی معنوی اولاد کا سلسلہ قیامت تک قائم رہے گا۔

تزکیہ باطن صفائے قلب، اور توجہ الی اللہ کے لیے صوفیائے کرام نے ترک وتجرید ضروری قرار دیا ہے، مرحلہ ''توبہ وانابت یا ترک معاصی'' سے شروع ہوکر ''ترک دنیا'' اور ''ترک عقبیٰ'' پھر ''ترک ترک'' تک منتہی ہوتا ہے۔

محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیا قدس سرہ اپنے وقت میں سید التارکین اور امام المجردین تھے، چناں چہ آپ نے ترک وتجرید کی ساری منزلوں کے آداب وشرائط، رسوم وقواعد، نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کئے ہیں، آج کی صحبت میں ہم آپ کے ملفوظات سے اسی سلسلہ کے ارشادات نقل کررہے ہیں۔

ترک معاصی: توبہ کی تین قسمیں ہیں، ماضی، حال، مستقبل۔

(۱) تمام کئے ہوئے گناہوں سے کامل ندامت اور شرمندگی حاصل ہونا توبہ کا ''حال'' ہے۔

(۲) ماضی یہ کہ جن جن بندوں کا حق اس سے متعلق ہوا نہیں راضی کرے، یعنی اگر کسی کا ایک روپیہ لے لیا ہو۔تو خالی توبہ توبہ کرنے سے توبہ نہ ہوگی جب تک وہ روپیہ واپس کرکے اسے راضی نہ کرلے۔کسی کو برا کہا ہو تو اس سے معذرت خواہ ہو، اور معاف کرائے۔فرض کرو جس کو برا کہا وہ مرگیا تو اب توبہ کی کیا صورت ہو؟ اس کی زندگی میں اسے جتنی بار برا کہا تھا۔اس کے مرنے کے بعد اتنا یا اس سے زیادہ اس کو اچھا کہے، اور اچھائی سے یاد کرے۔

کسی کو مار ڈالا ہو، اور اس کا وارث نہ ہو، جسے فدیہ اور خوں بہا ادا کرے، تو غلام آزاد کرے۔مطلب یہ کہ مردہ کو جلا نہیں سکتے، تو ایک بندہ کو قید سے ہی رہائی دلائے۔

اگر کسی پرائی بیوی سے زنا کیا ہو تو اس سے توبہ کی کیا شکل ہے؟ کیوں کہ یہاں اس کے شوہر سے معافی تلافی کے لیے حکم نہیں، تو انہیں تو اس کی یہی سبیل ہے کہ اللہ کی طرف بھاگے۔

اگر شراب پی ہو تو اس کی توبہ یہ ہے کہ عمدہ مشروبات اور ٹھنڈے پانی سے لوگوں کی تواضع کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر معصیت کی نسبت سے اس کی تلافی کی جائے۔ یہی توبہ کا وہ تقاضا ہے جو ماضی سے متعلق ہے۔

(۳) اور توبہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ، آئندہ کے لیے عزم مصمم کرے کہ اب گناہوں کے قریب نہ جائے گا۔ حضرت محبوب الٰہی نے خود اپنا واقعہ بیان کیا:

میں نے جب شیخ الاسلام بابا فرید الدین قدس سرہ کے دست مبارک پر توبہ کی تو آپ نے اہل حقوق کو راضی کرنے کی سخت تاکید فرمائی، مجھے تنبیہ ہوگئی کہ شاید حضرت میری دو کوتاہیوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ ایک آدمی کا مجھ پر بیس (۲۰) چیتل باقی ہے۔ اور میں نے ایک آدمی سے ایک کتاب عاریۃً لی تھی جو کھو گئی، میں نے اسی وقت دل میں یہ عہد کیا کہ اب کی دفعہ دلی جاؤں گا تو ان دونوں صاحبوں کو جس طرح ہوگا راضی کروں گا۔

میں جب اجودھن سے دلی واپس آیا، تو جس آدمی کے بیس (۲۰) چیتل باقی تھے، وہ کپڑے کا تاجر تھا، جن سے میں نے کپڑا خریدا تھا، اور اس دوران کبھی بھی میرے پاس (۲۰) چیتل جمع نہیں ہوئے کہ اسے ادا کروں، اس دفع صرف دس چیتل میرے پاس جمع ہوئے، تو میں اس بزاز کے پاس پہونچا۔ اور دس چیتل اس کو دے کر معذرت کی کہ ایک ساتھ دینے کی نیت میں یہ تاخیر ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے یہ میرے لیے ممکن نہیں، آپ یہ دس لیں، بقیہ دس بھی انشاء اللہ میں جلد ہی ادا کر دوں گا۔ اس بزاز نے یہ سن کر کہا: حضرت بابا کی خدمت سے آرہے ہو نہ، تبھی ادائے حقوق کی یہ تڑپ ہے جاؤ بقیہ دس میں نے معاف کیے۔

اسی طرح میں کتاب والے کے پاس پہونچا۔ اور اس سے کہا: آپ کی کتاب مجھ سے کھو گئی ہے، میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ سے معذرت کروں۔ میں دوسری کتاب نقل کروا کے آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں گا۔ وہ شاید مجھ سے مایوس ہو چکے تھے۔ بولے بے شک تم جس

پاکباز انسان کی خدمت سے آرہے ہو اس کی صحبت کی تاثیر زندگی میں ایسے ہی انقلاب برپا کر دیتی ہے۔[فوائد الفواد ص ۲۳۹، ۲۴۰، ملک سراج الدین اینڈ سنز پبلیشر لاہور]

یہ واقعات توبہ کی ماضی والی نوع سے متعلق تھے، آئندہ کے لیے گناہوں سے بچنے کے عزم مصمم کی بھی کئی مثالیں۔آپ کے ملفوظات کی زینت ہیں۔آپ نے فرمایا:

''جو شخص پیر کا ہاتھ تھام کر توبہ و بیعت کرتا ہے اس نے گویا اللہ تبارک وتعالیٰ سے عہد وپیمان کی تجدید کی ہے اور اس پر ثابت قدمی ضروری ہے۔اگر اب بھی وہ پرانی روش پر ہے تو اس نے توبہ ہی کیوں کی''۔

فرمایا: جب میں پہلی بار شیخ الاسلام حضرت بابا فریدالدین قدس اللہ سرہ العزیز کی بارگاہ سے بیعت کے بعد لوٹا تو راستہ میں پیاس کا غلبہ ہوا۔ہوا گرم تھی اور دور دور کہیں پانی کا پتہ نہ تھا۔راستہ میں سید عماد علوی سے ملاقات ہوئی۔وہ میرے ملاقاتی اور ایک بار باش بزرگ تھے۔میں نے پوچھا سید صاحب مجھے غیر معمولی پیاس معلوم ہو رہی ہے، یہاں کہیں پانی ہوگا؟ انہوں نے ایک لوٹا دیتے ہوئے کہا: لیجیے نوش فرمایئے، میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ شراب یا بھنگ کا شربت ہے۔میں نے پینے اسے انکار کیا تو کہنے لگے: میں نے مجبوراً ہی اسے ساتھ رکھا ہے، اس راستے میں دور تک پانی کا نشان نہیں ہے۔آپ اس کو نہ پئیں گے تو پیاس سے مرجائیں گے۔میں نے کہا جو کچھ بھی ہو۔چاہے مر ہی کیوں نہ جاؤں مگر میں اپنے شیخ کے سامنے کیے ہوئے عہد سے پھر نہیں سکتا۔دوسرا قصہ آپ نے حضرت حمید سوالی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان کیا، فرماتے ہیں:

خواجہ حمید سوالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ الرحمہ کے ہم خرقہ اور خواجہ بزرگ حضور معین الحق والدین چشتی اجمیری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مرید تھے۔ آپ نے توبہ وانابت کی اور حضرت خواجہ بزرگ کے حلقۂ ارادت میں آئے تو ہر گناہ سے پرہیز کا عہد کرلیا۔آپ کے احباب اور پرانے ساتھی حسب عادت آپ کو دعوت ناؤ نوش وشاہد ومطرب دینے آئے تو آپ نے انکار کیا۔انکار پر اصرار بڑھا تو آپ نے سختی سے منع کیا۔وہ لوگ

آپ کے سر ہو گئے۔ آپ نے دیکھا کسی طرح مانتے ہی نہیں تو ایک عجیب والہانہ انداز میں فرمایا: جاؤ جاؤ اور اب مجھ سے مایوس ہو جاؤ، میں نے یہ کمر بند مضبوط باندھ لیا ہے۔ [فوائد ص ۳۳۶]

حضرت محبوب الٰہی نے توبہ اور ترک معاصی کا عزم کرنے والوں کی ایک عمدہ تمثیل ارشاد فرمائی۔

"جو آلودہ معصیت ہے اس کا رخ گناہ کی طرف اور پشت حق کی جانب ہے، اور توبہ کر لی تو رخ حق کی طرف ہو گیا اور پشت گناہ کی جانب، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ عبادت میں اسے لذت حاصل ہو۔ یہ عبادت کی بے ذوقی گناہوں کا ثمرہ ہے"۔ [فوائد ص ۲۴۰]

حضرت کے اس آخری ارشاد کا یہ آخری ٹکڑا انتہائی غور طلب ہے جس طرح مادی بد پرہیزی اور بداحتیاطی کے اثرات ظاہر جسم تک ہوتے ہیں جس کا اندازہ ایک ماہر ڈاکٹر مریض کی صورت دیکھتے ہی لگا لیتا ہے، ٹھیک اسی طرح گناہوں کے برے اثرات بھی انسان کے باطنی اوصاف ظاہر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور اہل معرفت چہرہ دیکھ کر انسان کے اندرونی گناہوں کا پتہ چلا لیتے ہیں۔

حضرت امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے "طبقات کبریٰ" میں حضرت امام برحق عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حالات میں لکھا ہے "ایک اجنبی کو دیکھا اور فرمایا: سبحان الله یاتی فی مساجدنا رجال فی عیونهم اثر الزنا. ہماری مسجدوں میں اب ایسے لوگ بھی آنے لگے ہیں جن کی آنکھوں میں زنا کا اثر ہے۔ معلوم ہوا ہم کو نظر نہ آئے لیکن اہل معرفت جان لیتے ہیں کہ یہ آنکھیں کیا کر کے آئی ہیں۔ ع

آنکھیں بتا رہی ہیں کہ جاگے ہو رات بھر

صوفیائے کرام اور اہل باطن نے گناہوں کے اثرات سے باقاعدہ بحث کی ہے۔

حضرت امام شافعی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: شکوت الیٰ وکیع سوء حفظی فاوصانی الی ترک المعاصی.

حضرت وکیع ابن الجراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میں نے حافظہ کے کمزوری کی شکایت

کی تو انہوں نے مجھے گناہ چھوڑ دینے کی تاکید کی۔

معلوم ہوا گناہ کا عام نقصان روح سے متعدی ہو کر جسم تک پہونچتا ہے، اور یادداشت کی قوت کو کمزور کر دیتا ہے، دل کی بیداری، اور احساس کی زندگی ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔ پیغمبر خدا ﷺ فرماتے ہیں:

الا وان فی الجسد مضغة، اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسدالجسد کله الا وھی القلب. [مشکاۃ: ۲۴۱]

لوگو خبردار رہو، انسان کے جسم میں ایک پارۂ گوشت ہے وہ درست ہے، تو سارا انسان درست ہے، اور وہ فاسد ہے تو سارا انسان فاسد ہے خبردار کہ وہ دل ہے۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبادت ہے تیرے جینے سے

تو دل کی زندگی ہی کچھ ہے۔ اہل باطن فرماتے ہیں: کثرۃ الضحک یمیت القلب. زیادہ ہنسی دل کی موت کا سبب ہوتی ہے۔ معلوم ہوا بے موقع اور بے فائدہ ہنسنا اور قہقہے اڑانا، روحانیت کو تہہ وبالا کرنے کا سبب ہے۔ واضح ہو کہ بیماری شرعاً معصیت بھی نہیں، نامحمود البتہ ہے۔ زبان جسم کا ایک مختصر سا ٹکڑا ہے، لیکن آج کون خیال کرتا ہے کہ اس مختصر سے پارۂ گوشت کی ذرا سی بے اعتدالی کتنی بڑی قیامت ڈھاتی ہے، حدیث شریف میں ہے:

الیمین الفاجر تدع الدار بلاقع.

جھوٹی قسم خانما بربادی کا سبب ہوتی ہے۔

آج ہم مسلمانوں کی ایک عام محرومی ہے کہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہیں جو خالی واپس کر دیے جاتے ہیں، ہم حیران ہوتے ہیں، ہم خدا کے بندے، اس کے رسول کی امت، اللہ کے نام لیوا، آخر ہماری اس محرومی کا سبب کیا ہے رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

کہ ایک شخص طویل سفر کرتا ہے جس کے بال پریشان ہیں اور بدن گرد آلود ہے (یعنی اس کی حالت ایسی ہے جو دعا کرے وہ قبول ہو) وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر یارب کہتا ہے مگر

حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام، پینا حرام، لباس حرام، اور غذا حرام، پھر اس کی دعا کیوں کر مقبول ہو۔ (مشکاۃ شریف: ۲۴۱) معلوم ہوا حرام سے پرہیز نہ کرنا دعا کے مقبول نہ ہونے کا سب سے بڑا سبب ہے۔

اسی قسم کے چند واقعات حضرت محبوب الٰہی نے ارشاد فرمائے ہیں:

(۱) لاہور میں ایک واعظ تھے اللہ تعالیٰ نے ان کی تذکیر میں غیر معمولی اثر آفرینی بخشی تھی، سامعین پر دوران وعظ مسلسل لذت اور رقت طاری رہتی تھی۔ اتفاقاً وہ حج کو تشریف لے گئے۔ واپس لوٹے تو وعظ میں وہ تاثیر اور چاشنی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ مطلب یہ کہ حج کے بعد درد و تاثیر میں اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ یہ الٹا ہی ہوا کہ جو کچھ تھا وہ بھی گیا۔ لوگوں نے کہا: صاحب اب آپ کے وعظ میں وہ پہلے والی بات نہیں رہ گئی۔ انہوں نے یہ سن کر فرمایا: میں خوب جانتا ہوں کہ اس بدبختی کا سبب کیا ہے۔ اس سفر میں میری دو نمازیں قضا ہو گئی تھیں۔ جنہیں وقت کے بعد پڑھا۔ [فوائد الفواد ص ۳۶۴]

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

اللہ اکبر سفر حج اور جوار حرم، جہاں ہر دم انوار و رحمت کا نزول ہوتا رہتا ہے لیکن صرف دو نماز قضا کرنے کی نحوست نے ساری برکات پر پانی پھیر دیا۔ معلوم ہوا ترک نماز زبان سے تاثیر کی قوت سلب کر لیتی ہے۔

(۲) حضرت شیخ ابو سعید تبریزی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ایک عظیم تارک الدنیا بزرگ گزرے ہیں۔ ایک دفعہ ان کی خانقاہ میں مسلسل تین دن سے از قسم غلہ کوئی چیز نہ تھی، اہل خانقاہ بھوک کی شدت میں مبتلا۔ والی شہر کو اطلاع ہوئی تو اپنے ملازموں سے کہنے لگا: حضرت تو مجھ سے کوئی ہدیہ قبول کرتے نہیں۔ کچھ نقد لے جاؤ اور شیخ کے خادم کو دے دو کہ اسے پاس رکھو اور شیخ کو اطلاع کیے بغیر تھوڑا تھوڑا حسب مصلحت خرچ کرو۔ [فوائد الفوا: ۳۰۳]

ابھی پہلے ہی دن اس میں سے کچھ شیخ کے مصرف میں آیا تھا کہ حضرت کو عبادت

وریاضت میں جو لذت وآرام ملتا تھا موقوف ہوگیا۔ خادم کو بلاکر ذریعہ آمدنی کی تحقیق کی۔ تو اسے مجبوراً پوری صورت حال سے شیخ کو آگاہ کرنا پڑا۔ تو آپ نے پوچھا حاکم کا فرستادہ کس راستے سے آیا اور خانقاہ میں کہاں کہاں اس نے قدم رکھا۔ شیخ نے ہر جگہ سے مٹی کھودوا کر باہر پھنکوادی اور باہر سے مٹی منگوا کر خالی جگہ پر کی۔ اس خادم کو پورے زروسیم کے ساتھ باہر کردیا۔

العظمۃ للہ۔ ہم بے بصیرتوں کو کیا نظر آئے۔ مگر اہل معرفت دیکھتے ہیں کہ شبہ کا کھانا کھانے سے عبادت الٰہی کی لذت ختم ہوجاتی ہے۔

ترک معصیت کا مناسب وقت: انسان کی عمر جب ڈھلنے لگتی ہے اور شہوانی قوتوں میں فتور آجاتا ہے تو ضمیر اور احساس کی مقہور اور خفیہ طاقتیں آہستہ آہستہ بیدار ہوتی ہیں اور ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ گزشتہ واقعات ایک ایک کرکے چشم تصور کے سامنے آموجود ہوتے ہیں۔ اور مستقبل کے بھیانک انجام سے انسان لرز اٹھتا ہے، اس کی روح بے قرار ہوجاتی ہے اور وہ کف افسوس ملنے لگتا ہے۔ ہائے اب کیا ہوسکتا ہے؟ اب کیا ہوسکتا ہے؟ گناہ کرنے کی طاقتیں جواب دے چکی ہیں۔ لذت کا احساس مرچکا ہے اور نیکی کرنے کے لیے نہ وقت ہے نہ طاقت، افسوس اب کیا ہوگا۔ ٹھیک ہے کہ انسانوں کو اسلام نے اس وقت بھی مایوس نہیں کیا۔ وہ فرماتا ہے:

این درگہ، ما درگہ ناامیدی نیست صد بار اگر توبہ شکنی باز آ۔

ترجمہ: یہ میری بارگاہ ناامیدی کی جگہ نہیں۔ سو(۱۰۰) مرتبہ بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو تو اب سے سچی توبہ کرو۔

لیکن توبۂ صادقہ کا حقیقی وقت وہی ہے جب قوتیں شباب پر ہوں اور جوش مستی میں کچھ سوجھتا نہ ہو کہ یہ توبہ میزان عمل میں بڑا وزن رکھتی ہے۔ اس مضمون پر حضرت "محبوب الٰہی" رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے ارشادات قابل ملاحظہ ہیں فرماتے ہیں:

دو شخصوں میں اس موضوع پر بحث ہوئی کہ متقی جس نے کبھی گناہ نہ کیا وہ افضل ہے یا جس نے گناہ کرکے توبہ کی اور اس پر قائم رہا وہ افضل ہے، دونوں اس زمانے کے پیغمبر کے پاس

پہونچے۔آپ نے فرمایا: میں وحی کے بعد کچھ فیصلہ کرسکتا ہوں۔انہیں حکم ہوا کہ ان دونوں سے کہو: کل صبح تم دونوں ایک گھر سے باہر نکلو اور سب سے پہلے جو تم سے ملے اس سے سوال کا جواب چاہو۔

دوسرے روز حسب الحکم ان دونوں نے ملنے والے سے پوچھا آپ ہماری یہ مشکل آسان کردیں، کہ متقی افضل ہوتا ہے یا تائب۔ اس نے جواب دیا میں کوئی عالم فاضل نہیں، سیدھا سادھا ایک بنکر ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کپڑا تیار کرتے وقت بہت سے دھاگے ٹوٹ بھی جاتے ہیں جن کو میں جوڑ دیتا ہوں، تو وہ نہ ٹوٹنے والے دھاگوں سے مضبوط ہوجاتے ہیں۔لوٹ کر یہ جواب پیغمبر علیہ اسلام کو سنایا تو انہوں نے فرمایا: تمہارا جواب ہوگیا۔ کہ اپنے مولا سے ٹوٹ کر جڑنے والا افضل۔شرع سے جڑا رہنے والا مفضول۔

[فوائدالفوادص:۳۵۴]

لیکن اس کے بارے میں خود حضرت کا مشرب یہ ہے کہ متقی اور تائب دونوں برابر ہیں، فرماتے ہیں:

توبہ کرنے والا متقی کے برابر ہے اس لیے کہ متقی وہ ہے جس نے عمر بھر کوئی گناہ نہیں کیا اور تائب وہ ہے جس نے گناہ کے بعد اللہ کی طرف رجوع کیا تو حدیث مبارک۔

التائب من الذنب کمن لا ذنب له. [مشکاةشریف:۲۰۶]

گناہ سے توبہ کرنے والا بے گناہ کی طرح ہوجاتا ہے۔

کے موافق متقی اور گنہگار دونوں حکم میں برابر ہوں گے۔ پھر آپ نے اس کا نکتہ ارشاد فرمایا کہ۔

جو گناہ کا مزہ اٹھا چکا ہے وہ توبہ کے بعد عبادت میں یقیناً لذت پائے گا تو بہت ممکن ہے کہ اس لذت کا ایک ذرہ گناہوں کے کھلیان کو جلا ڈالے۔ [فوائدالفوادص۲۵۴]

کس درجہ امید افزا ہیں یہ روایات۔لیکن اسی وقت جب توبہ صادقہ ہو اور ہنگام جوانی میں ہو کہ فرماتے ہیں:

”توبہ وانابت عالم جوانی کی بہتر ہے کہ بڑھاپے میں آدمی توبہ نہ کرے تو کیا کرے“
پھر یہ دو شعر ارشاد فرمائے:

چوں پیر شوی و بر سر انجام آئی   آئی سر حرف خویش ناکام آئی
سازی حق راز تیرہ آرائی   معشوقۂ خود در بے نوائی

ترجمہ: تو جب بڑھا ہوا اور اپنے انجام کو پہونچا اور یہ جان گیا کہ پوری زندگی کا انجام لاحاصل ہی رہا، تو اب جیسا کہ کوئی دوسرا محبوب نہ رہا تو خدا سے محبت ادعوے دار ہے۔
پھر فرمایا:
اللہ تعالیٰ بندہ سے اس کی جوانی کے بارے میں پوچھے گا۔ یسئل المرء عن شبابه
حضرت صوفیائے کرام کے اس منزل ترک وتجرید اور اس کی تفاصیل پر جب میں نے غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ یہ تو پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث مبارک کی توضیح وتشریح ہے:

المهاجر من هاجر مانهى الله.

سچا مہاجر وہی ہے جو تمام گناہوں کو چھوڑ دے۔

فہرست ﴿مضامین بحر العلوم حصہ اول﴾

بعض اہم مطبوعات امام احمد رضا اکیڈمی

مطلع القمرین فی ابانۃ سبقۃ العمرین:(افضلیت صدیق اکبر وفاروق اعظم کا ثبوت)

مجدد اعظم سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کی وہ عظیم کتاب جس کا ذکر آپ نے اپنی تصانیف میں متعدد مقامات پر نہایت اہمیت کے ساتھ فرمایا ہے، شیخین یعنی سیدنا صدیق اکبر اور سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی افضلیت مطلقہ پر تحقیق انیق۔ دراصل یہ کتاب سیدنا اعلیٰ حضرت نے اپنی ایک ضخیم کتاب "منتہی التفصیل لمبحث التفضیل" سے تلخیص کے طور پر تصنیف فرمائی ہے، اصل کتاب پندرہ سو صفحات پر پھیلی ہوئی تھی، لہذا آپ نے قارئین کی سہولت کے مدنظر اختصار وجامعیت کے انداز میں لکھی، یہ کتاب اب تک ناپید تھی، حال ہی میں اس کا مخطوطہ دستیاب ہوا، لہذا پہلی بار ترتیب جدید کے ساتھ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی ہے۔ خوبصورت جلد اور عمدہ کاغذ۔

تقدیم، تبییض، ترتیب جدید: محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

صفحات: ‏ سائز: 23x36=16 ‏ ہدیہ: 140

اصول الرشاد لقمع مبانی الفساد:

رئیس الاتقیا، امام المتکلمین حضرت علامہ مفتی نقی علی خاں صاحب بریلوی والد ماجد امام احمد رضا۔ قدس سرہما۔ کی عظیم تصنیف ہے جو آج سے تقریباً ایک سو چالیس سال پہلے، ۱۲۹۷ھ میں طبع ہوئی تھی اور نایاب تھی۔ مصنف علیہ الرحمہ نے اس کتاب میں ایسے بیس قواعد تحریر فرمائے ہیں جو اہل سنت اور وہابیہ کے درمیان تسلیم شدہ ہیں، آپ نے ان کی وضاحت فرماتے ہوئے ثابت فرمایا ہے کہ جب اصول طے شدہ ہیں تو پھر ان کے ذریعہ جو فروع اور مسائل درپیش ہیں ان میں نزاع کیوں ہے، لہذا یہ وہابیہ کی ہٹ دھرمی ہے۔ گویا یہ کتاب حق و باطل کے درمیان خط امتیاز قائم کرنے والی ایک عظیم دستاویز ہے۔ اکیڈمی کے ذریعہ ترتیب جدید، بہترین کاغذ اور خوب صورت جلد کے ساتھ منظر عام پر آگئی ہے۔

تقدیم و ترتیب جدید: محمد حنیف خاں رضوی

صفحات: 256 ‏ سائز: 23x36=16 ‏ ہدیہ: 130

ازاقۃ الآثام لمانع عمل المولد والقیام: (میلاد وقیام)

رئیس الاتقیا، امام المتکلمین حضرت علامہ مفتی نقی علی خاں صاحب بریلوی والد ماجد امام احمد رضا۔ قدس سرہما۔ کی عظیم تصنیف۔ اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ خود سیدنا اعلیٰ حضرت نے اس پر ایک وقیع اور گراں قدر حاشیہ تحریر فرمایا ہے، جو اس کتاب کے حاشیہ پر "رشاقۃ الکلام فی حواشی ازاقۃ الآثام" کے نام سے موجود ہے۔ ترتیب جدید وتخریج: مولانا محمد اسلم رضا کراچی پاکستان

صفحات: 336   سائز: 23×36=16   ہدیہ: 160

سیرت اعلیٰ حضرت: مصنف: حضرت علامہ حسنین رضا خاں صاحب بریلوی

مجدد اعظم سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہ کے شب وروز کے احوال ،مصنف کے چشم دید واقعات، کتاب کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم خود سیدنا اعلیٰ حضرت کی محفل میں موجود ہیں، اور بچشم خود ملاحظہ کر رہے ہیں۔ اعلیٰ حضرت کی سیرت پر لکھی جانے والی کتابوں میں یہ سر فہرست ہے، عرصہ ہوا کہ یہ کتاب نایاب تھی، خوبصورت جلد اور بہترین طباعت وکاغذ

صفحات: 160   سائز: 23×36=16   ہدیہ: 80

منہاج العابدین اردو:

اسلامی تصوف کو شرح وبسط کے ساتھ معرض تحریر میں لانے والے ائمہ کرام میں ایک پروقار اور مبارک نام امام محمد بن محمد غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ہے، آپ نے اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے والے بد باطن فرقوں کے خلاف ایک مستقل محاذ کھولا اور اہل اسلام کو ان کے سچے مذہب کی تعلیمات سے روشناس کرایا۔ یہ کتاب آپ کی آخری تصنیف ہے، اس میں آپ نے روح ایمان کی بالیدگی اور تزکیہ قلوب کے سامان نہایت اختصار کے ساتھ پیش فرمادیئے ہیں، لہذا حضرت مولانا محمد سعید احمد صاحب نقشبندی لاہوری نے شگفتہ زبان میں ترجمہ کردیا۔ چوں کہ کتاب کی طباعت وکتابت قدیم طرز پر تھی لہذا ترتیب جدید، تخریج آیات واحادیث اور خلاصۂ کتاب وغیرہ مفید چیزیں اکیڈمی کی زیر نگرانی عمل میں آئیں۔ خوبصورت جلد اور عمدہ کاغذ، ترتیب جدید وتخریج: محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

صفحات: 364   سائز: 23×36=16   ہدیہ: 170